اکادمی ادبیات پاکستان

بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار

مرتبین:

نسیم احتشام

قاضی جاوید

آغا نور محمد پٹھان

سید ولی خیال

افضل مراد

مدیر:

طارق شاہد

اکادمی ادبیات پاکستان

نگران	افتخار عارف
منتظم	گلزار احمد
مدیر	طارق شاہد
تدوین و طباعت	سعید درانی
تعداد	500
سال اشاعت	جولائی 2005ء
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان H-8/1، اسلام آباد
کمپوزنگ	خرم شہزاد کمپوزنگ سینٹر
مطبع	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس اسلام آباد
قیمت	پیپر بیک:-/375 روپے مجلد:-/400 روپے

ترتیب

افتخار عارف
چیئرمین
اکادمی ادبیات پاکستان

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام اسلام آباد، کوئٹہ، پشاور، لاہور اور کراچی میں فروری/مارچ 2005ء میں "بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار" کے حوالے سے پانچ سیمینار منعقد ہوئے۔ ان مذاکروں میں ملک کے منتخب نمائندہ اہل قلم نے اظہار خیال فرمایا۔ مذاکروں کے اس سلسلے کا افتتاح وفاقی وزیر تعلیم لیفٹیننٹ جنرل (ر) جاوید اشرف قاضی نے فرمایا، جبکہ دیگر مقررین میں ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر فتح محمد ملک، محترمہ خالدہ حسین، جناب مسعود مفتی، جناب آفتاب اقبال شمیم، ڈاکٹر انوار احمد، جناب واحد بزدار، ڈاکٹر حیدر سندھی، جناب احمد جاوید، جناب محمد اظہار الحق، جناب محمد حمید شاہد اور جناب اصغر عابد شامل تھے۔ محترم وفاقی وزیر تعلیم نے موضوع کے حوالے سے جو باتیں کہیں، ان کے اقتباسات افتتاحیے کے طور پر شامل کتاب ہیں۔ وزیر محترم نے اپنی تقریر میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ اس سلسلۂ مذاکرات میں پڑھے جانے والے مقالوں کو قومی اہمیت کے حوالے سے یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا جانا چاہیے۔

پیش نظر کتاب اس وعدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرتب کی گئی ہے۔ وفاقی دارالحکومت کے علاوہ چاروں صوبائی دارالحکومتوں میں ہونے والے مذاکروں کی صدارت گورنر سرحد لیفٹیننٹ جنرل (ر) سید افتخار حسین شاہ (پشاور)، گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ر)، جناب خالد مقبول (لاہور)، گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد (کراچی) نے فرمائی، جبکہ گورنر بلوچستان میں جناب اویس احمد غنی کسی اہم سرکاری مصروفیت کی سبب شریک نہ ہو سکے اور وہاں کے سیمینار کی مسند صدارت پروفیسر نادر قمبرانی اور جناب طاہر محمد خان نے سنبھالی۔

پیش نظر کتاب میں کچھ مقالے ایسے بھی ہیں کہ جو سیمینار میں تو نہیں پڑھے گئے تھے مگر ہماری درخواست پر لکھے گئے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہم نے بساط بھر کوشش کی ہے کہ پاکستان کی تمام اہم زبانوں کے ممتاز اہل قلم کی تحریریں کتاب میں شامل ہوں۔ خواتین اہل قلم کا نقطۂ نظر بھی سامنے آئے اور یہ بھی پتہ چل سکے کہ ہماری نئی نسل کے لکھنے والے اس موضوع کے حوالے سے کس طرح سوچتے ہیں۔ یہاں یہ بات کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس وضع کے موضوعات پر مذاکرے ہوں یا کوئی ایک کتاب، اسے مکمل طور پر قطعی یا حتمی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ پھر بھی ایک ایسی کتاب جس میں پاکستان بھر سے ۴۶ لکھنے والوں کے کسی ایک موضوع پر خیالات سامنے آئیں گے تو یقیناً استفادے کی صورتیں پیدا ہوں گی۔

احسان ناشناسی ہوگی کہ اگر میں اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے وفاقی سیکرٹری تعلیم جناب ساجد حسن کا شکریہ ادا نہ

کروں کہ جنہوں نے خاص طور پر وزارتِ خزانہ کے ایڈیشنل سیکرٹری کی حیثیت سے ہمیں ان مذاکروں کے انعقاد کے لئے خصوصی فنڈز مہیا کیے۔

امید ہے کہ موجودہ ادبی صورت حال کے حوالے سے یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت سے اہل قلم کی توجہ کا مرکز رہے گی۔

میں اپنے رفقائے کار محترمہ نسیم محمود، جناب قاضی جاوید، آغا نور محمد پٹھان، جناب سید ولی خیال، جناب افضل مراد اور جناب طارق شاہد کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب و اشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) جاوید اشرف قاضی
وفاقی وزیر تعلیم
حکومت پاکستان

افتتاحیہ

کتابیں ہمیشہ سے انسانوں کے لیے شعور اور بصیرت کا سرچشمہ رہی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ تہذیب و تمدن کی ترقی میں کتابوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ دیکھنے والی آنکھ، محسوس کرنے والے دل اور سوچنے والے ذہن ہمیشہ سے انسانی ترقی کے قافلوں کی رہنمائی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کتاب علم اور آگہی کے سفر میں بنیادی وسیلے کا کردار ادا کرتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ فلسفی، دانشور، شاعر اور ادیب انسانی معاشرے میں تبدیلی اور انقلاب کی جدوجہد میں ہمیشہ سے رہنما کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ہمیں اور آپ کو تو اس حقیقت کا براہ راست تجربہ بھی ہے کہ ہمارے دیدہ ور اور صاحب نظر لوگ قوم کے اجتماعی مقدر (Collective Destiny) کی تشکیل میں کس قدر موثر ثابت ہو سکتے ہیں، بلکہ ہوئے ہیں۔ پاکستان کا تصور ایک عظیم فلسفی شاعر کے vision کی تعبیر ہی کی ایک صورت ہے۔ سر سید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی، اور دوسرے بڑے لکھنے والوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری اور آزادی کی تحریک میں براہ راست کردار ادا کیا اور یہ انہی کا ورثہ تھا جسے قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کی صورت میں ہماری نسلوں کو منتقل کیا۔ دیگر اہل دانش اور اہل قلم نے بھی جو ہمارے ان بزرگوں کے بعد آئے ہمارے کلچر اور ہماری ثقافت کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور آج بھی وہ اپنا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ دنیا بدل رہی ہے۔ بدلتی ہوئی اس دنیا میں ہمیں بہت سے Challenges کا سامنا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے دنیا کے مختلف ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے، اپنی مثبت روایتوں کو سمجھتے ہوئے، بدلتی ہوئی دنیا کے قدم سے قدم ملا کر چلیں۔

ذرا سی دیر کو عالمی صورت حال پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ پہلے جو تبدیلیاں صدیوں اور دہائیوں میں رونما ہوتی تھیں وہ اب پلک جھپکتے رونما ہو رہی ہیں۔ زندگی جیسا کہ اقبال نے کہا تھا پیہم رواں دواں ہے ہر آن ہر گھڑی، حرکت اور تغیر ہمارا مقدر ہے۔ ہمارا دین، ہمارا نظریہ، ہماری تہذیب سب اس تبدیلی کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ جدید دور کے اٹھائے جانے والے سوالوں کی روشنی میں اپنے مسائل کو علم اور دانش کی روشنی میں طے کریں اور اپنے روشن مستقبل کے لیے ایسا راستہ اپنائیں جو رواداری، برداشت، تحمل، سلامتی، روشن خیالی، توازن اور اعتدال کا راستہ ہے۔ پاکستانی قوم کی تشکیل میں اہل قلم نے بنیادی کردار ادا کیا تھا قوم اگر صاحبان دانش اور اہل قلم سے یہ توقع رکھے کہ وہ آج

بھی روشن مستقبل کے سفر میں ان کی رہنمائی کریں گے تو بے جا نہ ہوگا۔ اقبال اور ان سے ذرا پہلے سرسید احمد خان اور مولانا حالی اور ان کے بعد آنے والے ادیبوں نے "ذمہ دار ادب" کی روایت کو فروغ دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے استحکام، خوشحالی اور ترقی کیلئے عوام کو آج بھی اپنے اہل قلم کی تحریروں سے نئی زندگی کے لیے روشنی اور آگہی حاصل ہوتی۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل کے لکھنے والوں میں مردوں کی روش کے دوش بدوش خواتین بھی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتی ہیں۔ اخباروں اور رسالوں میں جب بھی ان کی تحریریں پڑھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری خواتین اہل قلم کسی بھی اعتبار سے اپنے ہم عصر مرد اہل قلم سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ مجھے مردوں سے زیادہ آگے نظر آتی ہیں۔

دنیا کی نظروں میں پاکستان کے soft image کو متعارف کرانے کی جتنی ضرورت آج ہے اتنی کبھی نہیں تھی۔ یہ کام ادب اور ثقافت کے ذریعے احسن طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری موسیقی، ہمارا لوک کلچر، ہماری مصوری، ہماری ثقافت بہت ثروت مند اور رنگا رنگ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دنیا کے سامنے اپنی ان خوب صورتیوں کو تعمیری طریقے سے پیش کریں۔

ایک بات میں آزادیٔ اظہار کی صورت کے بارے میں ضرور کہنا چاہوں گا۔ پاکستان کی چھ دہائیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ میں کبھی اظہار خیال کی اتنی آزادی نہیں تھی جتنی اب ہے میں یہ بات پوری دیانت داری سے کہہ رہا ہوں کہ ہماری حکومت کے زمانے میں نہ تو سرکاری میڈیا میں لکھنے والوں پر کوئی پابندی لگائی گئی اور نہ کوئی رسالہ یا کتاب ضبط کی گئی اور نہ ہی کسی لکھنے والے کی کسی تحریر کے حوالے سے کوئی کارروائی کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ادارے بھی جو حکومت کی مالی معاونت سے چل رہے ہیں ان کے علمی کاموں میں بھی ہم نے کسی طرح کی کوئی مداخلت نہیں کی، بلکہ انہیں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

نہ تو میرا یہ منصب ہے اور نہ میری عادت کہ میں صاحبان قلم کی خدمت میں کوئی مشورہ پیش کروں کہ ان کو کیا لکھنا چاہیے اور کیا نہیں کہنا چاہیے۔ مگر پاکستان کے ایک عام شہری کی حیثیت سے اور ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت میں اپنے اہل دانش اور اہل قلم سے کچھ توقعات ضرور رکھتا ہوں۔ روز و شب تبدیل ہوتی ہوئی دنیا کی تشویشناک صورت حال میں ادیب کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ قومی تعمیر نو کے عمل میں بھی اہل قلم کو اپنا کردار واضح طور پر ادا کرنا ہے۔ مستقبل کی ترقی اور دوسری قوموں کے شانہ بشانہ آگے بڑھنے کے لیے رہنمائی کرنا ہے۔ امید، یقین اور اعتماد پیدا کرنا ہے، جدید چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کو پوری طرح آمادہ کرنا ہے، جیسے ایک خاص طرح کی جذباتی اور رومانوی تحریروں سے ہٹ کر ہمارے نامور اہل قلم نے زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پھر اس طرف توجہ دیں۔ ذاتی خوشیاں اور غم بہت اہم ہیں مگر قوم کی آرزوئیں، امیدیں اور امنگیں اور آنے والی نسلوں کا مستقبل اس سے زیادہ اہم ہے۔

میں ادیبوں کی اس محفل میں ایک اور مسئلے کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کسی بھی مہذب اور متوازن معاشرے کا تصور ادب اور فنون کے بغیر نہیں کیا جا سکتا مگر جہاں ایک طرف فنون و ادب کی اہمیت ہے وہیں نئے زمانے کے جدید علوم میں مہارت حاصل کرنا بھی ہمارے لیے ضروری ٹھہرتا ہے۔ ایک مثالی معاشرے کے لیے ادب کے ساتھ ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی،

فنون سب کے درمیان ایک توازن اور تناسب کی ضرورت کو محسوس کیا جانا چاہیے کہ اسی سے ایک مستحکم معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے۔

میں حکومت پاکستان اور وفاقی وزارت تعلیم کی جانب سے اکادمی ادبیات پاکستان کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم ان کے منصوبوں کی تکمیل کے لیے ممکنہ وسائل مہیا کرنے کی پوری کوشش کریں گے جیسا کہ ابھی افتخار عارف صاحب نے کہا کہ ہم نے علمی اور ادبی اداروں کی سالانہ گرانٹ میں اضافہ کیا ہے اور پنجابی ادبی بورڈ، سندھی ادبی بورڈ، پشتو اکیڈمی اور بروہی اکیڈمی کو ان کے جاری منصوبوں کی تکمیل کے لیے خصوصی طور پر پانچ پانچ لاکھ روپے کی یکمشت امداد بھی فراہم کی ہے۔ اس بات کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم پاکستان کی تمام زبانوں کی ترویج و ترقی کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ فلاحی نوعیت کے کاموں کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان، اہل قلم برادری کے حوالے سے خاموشی سے اور کسی کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائے بغیر جو کام کر رہی ہے وہ بھی قابل تحسین ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس سلسلے کی امدادی رقم میں مزید بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو۔

افتخار عارف نے دو مطالبات بھی پیش کیے ہیں۔ ایک مطالبہ تو یہ تھا کہ ہر سال اہل قلم کانفرنس کا انعقاد ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ضرور ہونا چاہیے مگر کانفرنس کو بامقصد اور بامعنی بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج جو سیمینار ہو رہا ہے اسے کتاب کی شکل دی جائے اور "بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار" کے حوالے سے اس سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کے علاوہ اور بھی منتخب ادیبوں کے مضامین اس میں شامل کیے جائیں۔

ضیاء جالندھری

ایک طرف ادیب اور شاعر فکر اور تحریر کی آزادی کا حق مانگتے ہیں تو دوسری طرف افلاطون کے زمانے سے اب تک ادیب پر معاشرے کے تقاضوں کے رویے بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی کچھ صورتیں ہمارے ادب میں بھی نظر آتی ہیں۔

ساختیات کی صف اول کے ادب شناس رولاں بارتھ (Rolana Barthes) نے جب یہ کہا کہ "تحریر مصنف سے خود اپنے آپ کو چھڑاتی ہے" تو ادب کی دنیا میں ایک انقلاب سا آ گیا۔ اب تک تو اچھے تخلیقی ادب کی داد مصنف ہی کو دی جاتی تھی اب اچانک بارتھ نے مصنف کو پکڑ کر ایک طرف دھر لیا اور تحسین و ستائش کا سہرا تحریر کے سر باندھ دیا۔ مصنف بے چارا ادب کی تخلیق کے سلسلے میں ایک مجبور عامل سے زیادہ کچھ نہ رہا۔ بارتھ کے اس جملے پر ادبی دنیا میں بہت لے دے ہوئی۔ کچھ نے کہا کہ یہ نقادوں کی سازش ہے جو تخلیق فنکاروں کے سر سے عظمت کا تاج اتار کر دوسروں کو پہنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کچھ نے اس کو ایک غیر سنجیدہ فقرے بازی سے تعبیر کیا۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ ساختیات کا تو معاشرتی فلسفے سے تعلق ہے۔ ادب سے اس کا واجبی سا رشتہ ہے، جسے ادیبوں کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ عہد حاضر میں ساختیات، پس ساختیات اور بعد از ساختیات کا کافی زور شور ہے۔ شروع شروع میں کئی ایک تو اس قسم کے بیانات کو غیر سنجیدہ اور غیر ادبی بیان سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے مگر رفتہ رفتہ ان بیانات کی وضاحت ہونے لگی۔ یہاں کچھ دیر کے لئے توقف کیا جائے اور اس وسیع موضوع کے ایک رخ پر نظر ڈالی جائے۔ ساختیات اور اس سے متعلق بحثیں اسی تحریک کا حصہ ہیں جو گذشتہ صدی میں پروان چڑھی تھیں۔ اردو ادب میں اکثر تحریکیں مغرب سے آئی ہیں۔ وہاں کی بڑی تحریکیں کلاسیکی ادب اور پھر رومانی ادب جیسی تحریکیں تقریباً ایک ایک صدی پر حاوی رہیں اور پھر فرانسیسی شاعری میں بے شمار تحریکیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نئے سوال اٹھا کر دوسروں کے لئے رستہ صاف کرتی گئیں۔ ہمارے ہاں اس موضوع پر ڈاکٹر نور سعید نے یہاں کی تحریکوں کی تاریخ کافی وضاحت سے بیان کی۔ بہر حال مختصراً یہ کہ جب ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی تحریکیں نرم پڑیں تو اس کی جگہ ساختیات ابھرنے لگی۔ اس پر ہمارے بعض نقادوں کو یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ ساختیات کے اولیں رائے گیرے (First Opinion Carriers) ہیں اور اس پر بجا طور فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے اس دوق موضوع سے پنجہ لڑانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس بات کا اعتراف کر لیا جائے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ رولاں بارتھ کا بیان صحیح قرار دیا جانے لگا ہے۔ ہم آمد اور آورد کے بارے میں سنتے آئے ہیں۔ آمد بزور بازو نہیں ہے۔ اس طرح انسان کی پیدائش اور زندگی کی نشوونما میں بے شمار

چیزیں ایسی ہیں جو انسان نے خود نہیں بنائیں۔ اس طرح لفظ انسان کی پیدائش سے پہلے ایک مخصوص معنی کے لئے وقف ہو چکا تھا۔ غرضیکہ وہ اس میں اتنا ہی مجبور ہے جتنی اسے آزادی دے دی گئی ہے۔ پھر تحریر کو لینگ اور لانگ میں تقسیم کر کے ساختیات کے اس پہلو کی اور بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔

معاشرے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ سے بعد دوسرا نظریہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ الفاظ کا نظام اتنا مکمل اور جامع ہے کہ تحریر اس کا مظہر بنتی ہے اور مصنف محکوم۔

اب ساختیات کی رو سے تحریر خود کو لکھواتی ہے بلکہ ادب کے متعلق آخری فیصلے مصنفین یا ان کے نقاد نہیں کرتے بلکہ قاری یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اعلیٰ، اچھا اور مقبول ادب کونسا ہے۔ اور یہ فیصلے معاشرے کی اقدار کی طرف سے آتے ہیں۔ جو قاری کی پسند اور ناپسند پر منحصر ہے۔ ہمارے پاس ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ادیب ایک عہد میں یا ایک حلقے میں بہت سراہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے وقت یا دوسرے علاقے میں اس کی تحریر کو تقریباً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ ایسے ادیب جن کے کام کو اپنے وقت سے دو سو سال بعد شناخت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اور بے شمار شاعر اور مصنف دیا سلائی کی طرح بجھ گئے۔ آج کل ادب کا مطالعہ اور تنقید نقاد اساس نہیں ہے بلکہ قاری اساس ہے مگر یہ ایک الگ اور نئی بات ہے جس کی وضاحت یہاں ممکن نہیں۔ انشاءاللہ کسی دوسری فرصت میں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

یہ دنیا جب سے وجود میں آئی ہے مسلسل بدل رہی ہے کل بھی بدلی تھی، آج بھی بدل رہی ہے اور آنے والے کل میں بھی بدلے گی۔ تبدیلی اس کا مقدر ہے اس لیے وہ قوتیں جو تبدیلی کے عمل کو روکتی یا روکنا چاہتی ہیں خود کھوٹا سکہ بن کر ٹکسال باہر ہو جاتی ہیں۔ زندہ انسان اپنے زندہ شعور کے ساتھ اس تبدیلی کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ اسے اپنا کر دوسروں کو بھی ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ہمارے دور میں یہ تبدیلی سائنس اور ٹیکنالوجی کے زیر اثر وجود میں آئی ہے جس نے ساری زندگی کو اپنے جلو میں لے لیا ہے اور اس طرح لے لیا ہے کہ زندگی کے سارے شعبے اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ شعر و ادب بھی چونکہ زندگی کا اہم حصہ ہے اس لیے وہ بھی اس سے متاثر ہوا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو کام اب تک شعر و ادب کرتے تھے وہ اب پوری طرح اس کے دائرہ کار میں نہیں رہا ہے۔ پہلے شاعر کا کام جہاں جذبات کی تخلیق تھا، وہاں کائنات کی توجیہ بھی اس کے منصب میں شامل تھی۔ اس طرح جذبہ اور فکر دونوں شاعری کے دائرے میں داخل تھے۔ غالب اور اقبال کی شاعری کا یہی دائرہ ہے۔ اپنے اس منصب کی وجہ سے شاعری زندگی کی معنی بھی دریافت کرتی تھی اور ساتھ ہی معنی کو جذبات کا حصہ بھی بناتی تھی۔ آج یہ صورتحال بدل گئی ہے۔ اب معنی کی تلاش و دریافت کا منصب شاعر کے دائرہ عمل سے نکل کر سائنس دان کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اب تصور کائنات جادوئی یا مذہبی نہیں رہا بلکہ سائنٹفک ہو گیا ہے اور انسان، معاشرے اور کائنات کے رشتے اور تعلق کے بارے میں حقائق کی دریافت، سوشیولوجی، نفسیات، طبعیات اور دوسرے متعلقہ علوم کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں اب شاعر کا منصب اس سطح پر بیان حقیقت (Statemen of Truth) نہیں رہا۔ آج کا شاعر دراصل حقیقت کا اظہار نہیں کرتا جیسے اس کے پیش رو صدیوں سے کرتے آئے تھے بلکہ اس کا اظہار حقیقت کے بارے میں جذباتی بیان ہوتا ہے۔ ایک ایسا بیان جو کسی مخصوص جذبے کی شدت میں شاعر کو اور ساتھ ہی قاری کو بھی درست معلوم ہو، انسانی احساس کی اب یہ سطح ہو گئی ہے۔ اس طرح فکر کی دنیا بھی اب شاعر کی دسترس میں نہیں رہی۔

اب رہ گیا جذبہ اور اس کے اظہار کا مسئلہ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ جذبے کی دنیا، تہذیبی سطح پر ایک مستحکم اور جمے جمائے معاشرے میں عام انسانی تعلقات کی دنیا ہے جو حسن و عشق اور احساس جمال سے لیکر خاندانی تعلقات اور سارے سماجی معاملات تک پھیلی ہوئی ہے۔ مستحکم انسانی معاشرے میں تعلقات کی صورتیں مقرر و متعین ہوتی ہیں اور قائم و دائم رسم و رواج

ان کے اظہار کے سانچوں کی تشکیل کرتے ہیں لیکن سائنسی معاشرے میں انسانی تعلقات اور رشتوں کا نظام بدل گیا ہے۔ سائنسی معاشروں میں وہ بنیادی اکائی یعنی خاندان، کمزور سے کمزور ہوکر درہم برہم ہورہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جذبہ اپنے بنیادی مخرج سے کٹ کر خود زہر آلود ہوگیا ہے، چنانچہ اب شاعری کے، سائنسی معاشروں میں، مثبت جذبات بھی باقی نہیں رہے۔ اس لیے بودلیئر اپنے قاری کی ''اکتاہٹ اور بیزاری'' کا دکھڑا سناتا ہے۔ ڈی ایچ لارنس اپنے قاری پر ''جبلی زندگی کی نفی'' کا الزام لگاتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ ان پر ''بے جان و مردہ'' ہوجانے کا الزام لگاتا ہے لیکن اپنے قاری پر الزام لگاتے ہوئے یہ شعرا بھول گئے ہیں کہ منفی جذبات میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ ان کے ذریعے ایک بار تو شاعری کی جاسکتی ہے، بار بار نہیں کی جاسکتی۔

میں نے یہاں مغربی شعرا کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ سائنس کا عروج ابھی مغرب میں ہوا ہے۔ سیٹلائیٹ کے ذریعے مغرب ہی اپنی بات ساری دنیا میں پھیلا رہا ہے۔ فیکس، ای میل، انٹرنیٹ کا نظام بھی اس نے دریافت و ایجاد کیا ہے۔ زہرہ، مشتری اور مریخ کا سفر بھی وہی کر رہا ہے، اوزون کا حلیہ تو ازن بھی مغرب ہی نے بگاڑا ہے۔ سائنسی دریافت اور ٹیکنالوجی کی ترقی بھی مغرب ہی میں ہوئی اور ہورہی ہے۔ ہم تیسری دنیا والے تو مغرب کے تابع مہمل بن رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ اثرات ابھی آنے شروع ہوئے ہیں۔ جب یہ اثرات مغرب کی طرح ہمارے ہاں بھی آجائیں گے تو ہمارا معاشرہ اور انسان بھی بدل جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ہماری فکر اور ہمارے جذبے بھی بدل جائیں گے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب مغرب میں تبدیلی کا یہ عمل پورا ہوجائے گا تو پھر انسان شاعری کی بنیاد کس چیز پر قائم کرے گا؟ سیارے پر بیٹھ کر خلا میں سفر تو کیا جاسکے گا لیکن شاعری نہیں کی جاسکے گی۔ وجہ صرف یہ ہے کہ جب شاعری کی تخلیقی بنیادیں ہی قائم نہ رہیں گی تو پھر شاعری کیسے تخلیق ہوگی؟

بدلتی دنیا کے تعلق سے یہ تو شاعری کا وہ پہلو ہوا جو سائنسی دور کے ساتھ خود ادب و شعر کی بنیادوں کو کھا رہا ہے لیکن خود شاعری کے تخلیقی عمل پر غور کیجیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعری میں بنیادی اہمیت خود شاعری کی ''آواز'' ہوتی ہے۔ ایک ایسی آواز جو کسی مخصوص طبقے سے مخاطب نہیں ہے۔ شاعری اسی لیے فکشن سے مختلف تخلیقی عمل ہے، اس میں فکشن کی طرح کوئی کردار یا محل نہیں ہوتا۔ شاعری کا اثر، شاعری کا لہجہ، شاعری کے معنی اور صورت کا امتزاج، سب کچھ خود شاعری کی ''آواز'' کے اندر ہوتا ہے اور ساری باتیں قابل یقین ہوتی ہیں۔ ہم فکشن کو اس لیے دلچسپی سے پڑھتے ہیں کہ اس میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس سے براہ راست یا بالواسطہ ہم واقف ہوتے ہیں لیکن ایک شعر یا ایک نظم میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ نہ تو ''معلوم'' کے ذیل میں آتا ہے اور نہ ''نامعلوم'' کے ذیل میں آتا ہے۔ وہ ماحول یا وہ تجربہ جس نے شعر یا نظم کو جنم دیا، عام طور پر خود پس منظر میں چلا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم یا شعر خود اس دنیا کی جگہ لے رہے ہیں اور اس لیے لے رہے ہیں کہ خود کو سامنے لانے، نمایاں کرنے اور اپنا وجود منوانے کا ان کے پاس یہی طریقہ ہے۔ شعر یا نظم میں جو چیز معلوم ہے وہ صرف اور صرف اس کی زبان ہے۔ وہ الفاظ جو شاعری میں ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں ان الفاظ کو آپ شعر میں دیکھیے تو یہ بھی مختلف سے نظر آتے ہیں حتیٰ کہ عام الفاظ بھی ذرا کچھ الگ سے لگتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زبان بدل سی گئی ہے یا بدل سی رہی ہے۔ غور سے دیکھیے تو ایک شعر یا نظم میں ہر لفظ یکساں اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ لفظوں کی یہ اہمیت اس

طرح اور اس طور پر فکشن میں نہیں ہوتی۔ فکشن میں الفاظ عمل اور کردار کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں جن سے پلاٹ آگے بڑھتا ہے۔ فکشن میں ہماری توجہ الفاظ پر مرکوز نہیں ہوتی لیکن شاعری میں الفاظ ہی عمل کا درجہ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاعری میں ایک شعر یا صرف ایک مصرعہ اثر انداز ہو کر اپنا لوہا منوالیتا ہے اور ہمارے دل میں اتر جاتا ہے۔ اتنے کم لفظوں میں ایسا گہرا فنی اثر ...... یہی شعر کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ناول کے ایک یا دو جملے پڑھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ناول اہم ہے یا نہیں۔ عام طور پر دس بیس صفحے پڑھنے کے بعد ہماری توجہ ناول پر مبذول ہوتی ہے بلکہ صحیح معنی میں اس وقت مبذول ہوتی ہے جب اس کی زبان واقعات میں گم ہو جاتی ہے۔ ناول پڑھتے وقت ہم اس وقت زیادہ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ جب ناول کی زبان ہماری توجہ واقعات سے نہ ہٹائے۔ شاعری میں صورت حال اس سے مختلف ہوتی ہے یہاں توجہ لفظوں پر رہتی ہے جن سے شاعر اپنی "آواز" کو اجاگر کرتا ہے۔ شاعری میں صورت حال اس سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں توجہ لفظوں پر رہتی ہے جن سے شاعر اپنی "آواز" کو ظاہر کر رہا ہے۔ ناول کے برخلاف نظم یا شعر میں ایک دھیما پن "ایک آہستہ روی" ہوتی ہے ہر لفظ اپنا رنگ، اپنا ذائقہ، اپنی خوشبو، اپنا لطف ساتھ لیکر شاعر کی آواز کو اجاگر کرتا ہے، اس لیے شاعری میں زبان کی قوت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

سائنس کے زیر اثر بدلتی ہوئی دنیا کے حوالے سے ایک بات شاعری کے سلسلے میں اور بھی قابل توجہ ہے۔ جدید تہذیب تیز رفتاری کی تہذیب ہے۔ ہزاروں میل کے فاصلے گھنٹوں میں طے ہو رہے ہیں۔ قدم قدم پر تیز رفتاری سے واسطہ پڑتا ہے۔ تیز رفتاری سے کتاب پڑھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ چلتے کھانوں (فاسٹ فوڈ) کا عام رواج ہو گیا ہے۔ ٹیلی ویژن پر دس سکینڈ کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کے نئے طریقے تلاش کئے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال میں آپ خود فیصلہ کیجئے کہ جدید سائنسی تہذیب ایسی صنف ادب یا ہیت کو جسے ہم شاعری کہتے ہیں، کیسے پسند یا قبول کر سکتی ہے جو اسے تیز رفتاری کے بجائے "آہستہ روی" کی طرف لے جاتی ہو یا اس کی رفتار میں دھیما پن پیدا کرتی ہو۔ جدید زندگی کی سرعت نے اسی لیے ٹھہراؤ اور اطمینان سے سانس لینے کے عمل کو کمزور یا ختم کر دیا ہے۔

ایک بات اور بھی یہاں قابل ذکر ہے۔ سائنس دن رات اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ وہ کائنات کے سربستہ رازوں کو معلوم کر کے اس کے اسرار کو دور کرے جب کہ شاعری اس "اسرار" کو باقی رکھتی ہے۔ شاعری یقین کو ابہام کی صورت عطا کرتی ہے۔ شاعری اس لیے سائنسی معاشروں میں آج کے قاری کے لیے مشکل اور غیر دلچسپ شے بنتی جا رہی ہے۔ شاعری میں ایک معنی کے بجائے مختلف معانی و مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شعر یا نظم میں ماورائے معنی کسی اور چیز کو سامنے لا رہے ہوں۔ ایک ایسی چیز جسے شاعر نے تو جنم نہیں دیا لیکن جو زبان کی دھندلی دھندلی سی روشنی میں اپنے وجود میں آنے کے عمل سے پہلے، کسی لمحے میں از خود پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے جب آپ شاعری پڑھتے ہیں تو نامعلوم کی تلاش کا کام انجام دیتے ہیں۔ کسی ایسی شے کی تلاش جو تجربے کے بطن میں تو موجود ہے لیکن جسے واضح طور پر بتایا یا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات یاد رہے کہ جیسے زبان کسی کلچر کے وجود کی توسیع ہے اسی طرح شاعری زبان کے وجود کی توسیع ہے۔ شاعری کے بغیر ہم بے زبان اور گونگے ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی قوم میں اچھی شاعری تخلیق نہیں ہو رہی ہے یا کم ہو رہی ہے تو یہ بات بذات خود بڑے

خطرے کی علامت ہے۔

ادب اگر زندگی کا آئینہ یا ترجمان ہے تو اس آئینے میں زندگی کا ظاہر و باطن، زندگی کی خارجی و داخلی دونوں صورتیں نظر آنی چاہیں اور اسے زمانہ حال کی ترجمانی اس طور پر کرنی چاہیے کہ مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے جب ادب کا مطالعہ کریں تو انہیں انسان کے حوالے سے اس میں زندہ اور جیتی جاگتی جھلکیاں نظر آئیں اور ادب ان کے لیے بھی ایک زندہ حوالہ بن جائے۔ یہ کام اچھا اور بڑا ادب ہمیشہ کرتا ہے۔

فرائیڈ، جس نے ادب کے مطالعے سے علم نفسیات کے کلیے اخذ کر کے نفسیاتی تجزیے کا ایک نیا دبستان قائم کیا، کہتا تھا کہ روسی ناول نگار دستوفسکی نفسیات کو بحیثیت مجموعی ساری بین الاقوامی نفسیاتی سوسائٹی سے کہیں زیادہ جانتا تھا۔ ایسے ہی ادب کے مطالعے سے شعور و لاشعور کی ان قوتوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے جن سے کسی فرد کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ادب انسان کے دل میں، اس کے باطن میں، اس کے جذبوں اور احساسات میں داخل ہو کر اس ساری صورت حال کو اس سلیقے سے بیان کرتا ہے کہ انسان کے ذاتی و سماجی مسائل اور ان کی کش مکش اور جد و جہد کی تصویر اجاگر ہو جاتی ہے۔ ادب کی سطح پر داخلی و خارجی کیفیات مل کر ایک اکائی، ایک وحدت بن جاتی ہیں۔ ادب، سماجی دھاروں، سماجی تبدیلیوں، سماجی ارتقا اور ان سے پیدا ہونے والے انقلاب کی صورت گری بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی اپنے دور کے سماجی بحران کو سیاسی لیڈروں اور سماجی سائنس دانوں سے بہت پہلے دیکھ لیتا ہے۔ جو کام ادب کرتا ہے وہ نفسیات و سماجیات، اور فلسفہ بھی نہیں کرتا اور اس لیے نہیں کرتا کہ یہ تینوں علوم انسانی تجربوں کا تصوراتی اور تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں اور انسانی زندگی کے تجربوں کو پہلے الگ الگ کر کے اور پھر ترکیبی ضابطوں، نظام اور قوانین سے مربوط کر دیتے ہیں۔ ان کے برخلاف ادب انسانی زندگی کی اکائی کو توڑتا نہیں ہے بلکہ اسے ساری انسانی زندگی کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ ادب میں تجربے اتنے زندہ اور توانا ہوتے ہیں کہ انہیں ترکیبی ضابطوں، قوانین اور تصورات کے ذریعے دوسروں کے اندر زندہ و پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس عمل کے لیے ضروری ہے کہ تخلیقی تخیل کے ذریعے ہی زندگی کی جیتی جاگتی صورت حال کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ اس سے جذبات کا تانا بانا بنا جا سکے۔ یہ کام نفسیات، سماجیات اور فلسفہ انجام نہیں دے سکتے۔ انسان خواہ خلاؤں میں پرواز کرنے لگے، مریخ و عطارد پر ڈیرے جمادے، سائنس انسان کی ساری موجود تہذیب کو بدل کر رکھ دے، جب تک انسان اپنی موجودہ ہیئت میں ایک سالم اکائی کے طور پر زندہ و باقی ہے، ادب کی اہمیت ہر صورت میں باقی و برقرار رہے گی اور ادب بدلتی ہوئی دنیا میں...... آج کی دنیا میں بھی اور آنے والے کل کی دنیا میں بھی.......... اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔

اب آخر میں سائنس کے تعلق سے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج سائنس نے وہ انداز نظر اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ سے ''طاقت'' انسان دوستی اور محبت کے جذبے پر غالب آ گئی ہے۔ برٹرینڈ رسل نے اپنی کتاب ''سائنٹفک آؤٹ لک'' میں جہاں سائنٹفک انداز نظر کی پرزور حمایت اور تبلیغ کی ہے وہاں کتاب کے آخر میں اس بات سے بھی خبردار کیا ہے کہ اگر سائنٹفک تکنیک کسی روک تھام کے بغیر اسی طرح حکمرانی کرتی رہی تو اس کے نتائج اس لیے خطرناک ہوں گے کہ اب سائنس کا جھکاؤ علم و آگہی اور فکر و دانش کے بجائے ''طاقت'' کی طرف ہو گیا ہے۔

باقی رہا زندگی کو آگے بڑھانے والے ادب کا اساسی کردار، جس میں سماجی، تہذیبی، خیر و شر اور اخلاق کی ساری

قدریں شامل ہیں، وہ اسی طرح قائم و دائم رہے گا اور ادب اسی طرح زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے ناانصافیوں، ظلم، جبر، استحصال کے خلاف اور انسان دوستی و روشن خیالی کی حمایت میں اپنا علم بلند کیے رہے گا۔ اس کام سے سائنس کی موجودہ روش بے نیاز ہے بلکہ سائنس ناانصافیوں اور ظلم و جبر پر مبنی سیاسی طاقت کا، بے جا ساتھ دے کر سفاک سرمایہ کاری کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور سائنس کی "طاقت" کے بل بوتے پر منافع خور اور سرمایہ داری کا کھیل کھیل رہی ہے اور اخلاقی قدروں کو توڑ پھوڑ کر "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کو اصول زندگی بنائے ہوئے ہے۔ ادب کبھی اس کھیل کا ساتھ نہیں دے سکتا اور ادیب ہمیشہ اس کے بائیں طرف رہ کر ہی اپنا کردار ادا کرے گا اور انسان کو احساس جمال کے ساتھ زندگی کے ادراک اور نئے شعور سے تازہ دم رکھے گا۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

اہل قلم کی تحریریں کروڑوں بے زبان انسانوں کو امن اور خوشحالی کی تمناؤں کی تکمیل کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں اور یہ ہمارے ادیب اور دانشور ہی دنیا میں محبت، امن اور رواداری کی فضا پیدا کرنے میں مددگار بن سکتے ہیں۔ یہ دنیا جو بڑی حسین ہے اسے مزید حسین بنا سکتے ہیں۔ اکادمی ادبیات نے پاکستان کی مختلف زبانیں بولنے والے ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ انتہائی قابل تعریف ہے۔

گلوبلائزیشن کے اس دور میں، انسان کو انسان کے ساتھ ملنے کے لئے طبعی طور پر مشکل کیوں نہ پیش آتی ہو لیکن سفر کئے بغیر پوری دنیا کے لوگوں سے بذریعہ انٹرنیٹ تبادلہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ لاڑکانہ میں بیٹھا ہوا ایک ادیب لاہور اور لندن میں بیٹھے ہوئے ادیب سے بات کرتا ہے۔ معاشی اور تجارتی اعتبار سے دنیا ایک اکائی میں بدلنے لگی ہے، ملکوں اور قوموں کے تحفظات کے باوجود ایک دوسرے سے روابط اور انحصار میں تیز رفتار اضافہ ہو رہا ہے۔

سرزمین سندھ کی اپنی ایک خصوصیت یہ ہے جو یہاں آیا وہ یہاں کے رنگ میں رنگ گیا یہ سرزمین ۵ ہزار سالہ قدیم تہذیب کی امین ہے۔ بلاشبہ گلوبلائزیشن کی وجہ سے انگریزی زبان کا بھی حلقہ عام ہوا ہے اور آج کمپیوٹر کی زبان انگریزی ہے اور انگریزی زبان کی اس یلغار کے سبب پاکستانی ادب کو جن مشکل مرحلوں سے گذرنا پڑ رہا ہے اس کا احاطہ اور اندازہ آپ حضرات مجھ سے زیادہ بخوبی کر سکتے ہیں اور کوئی مستحکم حکمت عملی تیار کر سکتے ہیں جس کے ذریعے ان زبانوں کا تحفظ کیا جا سکے۔

یہ مسلم ہے کہ بڑا ادیب کبھی کسی دوسری زبان اور کسی دوسرے ادیب سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے کلاسیکل صوفی شعراء حضرت فرید گنج شکر، شاہ عبداللطیف بھٹائی، خواجہ غلام فرید، رحمٰن بابا، بچل سرمست اور بلھے شاہ کے ادبی ورثہ نے ہمیں ثروت مند کر رکھا ہے۔ ہمارا لوک ادب انتہائی اہم ہے اور اس کو عالمی سطح پر پذیرائی کی ضرورت ہے۔

ہم جس دنیا میں ہیں وہ تیزی سے بدل رہی ہے اور تبدیلی انسانی تہذیب کا مقدر بھی ہے اور ارتقا کی ضامن بھی۔ ہم اپنے ماضی کی زندہ اور مثبت روایتوں کو اپنے حال سے جوڑتے ہیں اور اس کو اپنے روشن مستقبل کے لئے حالات سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ بدلتا ہوا وقت نئے سوال اٹھاتا ہے۔ اس وقت ہمیں لائبریریز کو یونیورسٹی اور اسکول کی سطح پر عام کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے علاوہ دیہی آبادی کے اندر لوک ادبی گھر یوں کے سلسلے کی سرپرستی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے قومی ادبی اداروں میں لوک ادب بھی شامل کرنا چاہئے۔ اس سے ایک ادبی فضا پروان چڑھے گی۔ جیسے جیسے ہماری خواندگی کی

شرح بڑھتی جائے گی اس کے ساتھ ساتھ کتاب کلچر بھی ترقی کرتا جائے گا۔ زبانیں اور ادب محبتیں اور قربتیں پیدا کرنے، فاصلوں کو ختم کرنے اور انسانی شعور کی سطح کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ شہری اور دیہی آبادی اور قومی سطح پر ادبی وفود کے تبادلوں سے اور اس طرح کی سیمیناروں سے ادبی فضا بہتر ہو سکتی ہے۔

ادب اور ادیب کا معاملہ اب جمہوریت سے بھی جڑا ہوا ہے۔ وہ ملک جہاں جمہوریت نہیں وہاں ادیب خوف میں رہتا ہے اور سچ لکھنے سے پہلے سو بار سوچتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم اب ایسے دور میں ہیں جہاں ادیب اور صحافی کو لکھنے اور بولنے کی آزادی ہے۔ اب ہمیں ادب دوست اور ثقافت دوست ماحول بنانا ہے تاکہ مختلف ثقافتوں اور مسلکوں والے لوگ مزاحمت کے بجائے یکجہتی کا کردار سرانجام دیں سکیں۔ ملک میں ہماری زبانیں اور ثقافتیں اس گلدستے کی مانند ہیں جس میں رنگ بھی ہے اور خوشبو بھی، لہٰذا اس کو مسلنے کے بجائے سجانے کی ضرورت ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان ملک کے دیگر صوبوں کے ساتھ ساتھ صوبہ سندھ میں بھی علمی و ادبی اداروں اور مستحق اہل قلم کی مالی امداد کر رہی ہے۔ سندھی ادبی بورڈ، انجمن ترقی اردو، سندھیالوجی، سندھی لینگویج اتھارٹی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، نذر الاسلام اکیڈمی اور دیگر مقتدر ادبی اداروں کو مطبوعات کی اشاعت کی مد میں مالی معاونت کر رہی ہے۔ مستحق ادیبوں کو ماہانہ وظائف اور یک مشت مالی امداد اس کے علاوہ ہیں۔ کراچی میں اکادمی کے زیر اہتمام گذشتہ پانچ سالوں میں متعدد ادبی پروگرام منعقد کئے گئے ہیں جو میری نظر میں ادب کے ذریعے یکجہتی کی فضا کو پروان چڑھانے کے لئے اہم ہیں اور ان سے ایک فضا بھی بنی ہے۔

بدلتی ہوئی دنیا کا تصور کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک ارتقائی عمل ہے جو انسانی تہذیب وتمدن کی ابتداء سے چلا آ رہا ہے۔ انسان ہمیشہ سے اس کوشش میں لگا رہا ہے کہ اپنے گردوپیش کے ماحول کو تبدیل کرے اس کی اصلاح کرے اور اپنے لئے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لئے اس میں سہولتیں اور آسانیاں پیدا کرے۔ دریاؤں اور صحراؤں کو پار کرنے کے وسائل ڈھونڈے، جنگلات کو صاف کرے، زمین کو ہموار کرے، اور اس طرح تمام مفید وکارآمد ذرائع سے فائدہ اٹھائے۔ یہ انسانی فطرت ہے، اسی سے معاشرتی زندگی کی ابتدا ہوئی ہے اور اسی نے انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقائی عمل کو جاری رکھا ہے۔ یہی ماضی، حال اور مستقبل کا تسلسل ہے جو ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور ہمیشہ کے لئے جاری رہیگا۔ اسی سے انسان کو اشرف المخلوقات کا مسند ملا ہے اور اسی نے انسان کو جہد للبقا کے دشوار گذار راستوں پر گامزن کیا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے نوع انسان کا یہ وطیرہ رہا ہے، بقول غالب:

گفت یزدان کہ چنین ہست و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنین ہست و چنین می بائید

اللہ تعالی نے جب آدم کو **عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا** کے شرف سے نوازا تب اسے فرشتوں کا مسجود ٹھہرایا۔ یہی وہ خیر کثیر ہے جس نے روئے زمین پر اسے خداوند عالم کا نائب قرار دیا اور اسی ذریعہ سے انسان زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈنے اور اس کے مشکلات پر قابو پانے کی سعی کرتا رہا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ **يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَآءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْراً كَثِيْراً وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوْا الْأَلْبَابِ** ۔ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل مند ہیں۔ یہی دانائی علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔ یہی انسان کو دانشور بناتی ہے۔ اور دانشور ادیب، ادب کا تخلیق کار ہوتا ہے۔

جس طرح دنیا کے دیگر علوم وفنون عالم انسانیت کی مشترکہ میراث ہے اور ان سے انسانی تہذیب وتمدن اور کلچر وثقافت کے ارتقاء میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح ادب بھی نور وادراک کا خزینہ ہے اور انسان کی دانائی وبینائی کا ذریعہ ہے۔ وہ اسی نور وادراک کے خزینہ سے ہمیشہ سے مستفید ہوتا رہا ہے اور زندگی کے ہر اندھیرے گوشے کو فکر وفن کے اسی چراغ کی لو سے منور کرتا رہا ہے۔ بقول شاعر تو "شب آفریدی چراغ آفریدم" کے مصداق نت نئے ایجادات اور ذرائع ووسائل کو اپنے تصرف میں لانے سے گوناگوں تبدیلیوں کا باعث بنتا رہا ہے۔

قرونِ اولیٰ کے دانشور اپنے دور کے ادیب تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے زمانے کے کارآمد ادب کی تخلیق سے حیاتِ نو کی روشنی پھیلائی، یوں ان کا تخلیق کردہ فن پارہ اپنے دور کی بدلتی ہوئی دنیا کا مشعلِ راہ بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کو علم و دانائی سے نوازا اور انہیں اپنے دور کا دانشور ٹھہرایا۔ ''اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی۔'' اس نور سے اس نے اپنے بیٹے کی راہنمائی کی، زندگی کے اعلیٰ اقدار کی جانب، دم بدم بدلتی دنیا میں آگے بڑھنے کے لئے، انسانیت کے تمدنی ارتقاء کی طرف۔ یہی عمل چین، ہندوستان، مصر، یونان اور روم وغیرہ میں ایک مدت تک جاری رہا۔ دنیا کی تمام تہذیبوں نے اپنے اپنے دانشوروں اور ادیبوں سے راہنمائی حاصل کی۔ ان سے زندگی کو بنانے سنوارنے کے گُر سیکھے اور اس طرح اپنے وقت کے یہ نابغہ روزگار لوگ علم و فنون کے خزینوں کو پُر کرتے رہے اور عالمِ انسانیت کی اس مشترکہ میراث میں گوناگوں اضافہ کرتے رہے، جوں جوں یہ روشنی پھیلتی گئی انسانی تہذیب، تمدن اور کلچر کا ارتقائی عمل جاری رہا اور دنیا مسلسل بدلتی گئی۔ تبدیلی کا یہ عمل اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا، یہ رُک نہیں سکتا، اس کا مقدر آگے بڑھنا ہے۔ دانشور ادیب اپنی سوچ میں مگن ہوگا اور پیہم خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہے گا اور وہ خیرِ کثیر جس کا وہ وارث و امین ہے اس سے انسانی زندگی کے ہر گوشے کو منور کرنے کا آرزومند ہوگا۔ یہ دنیا یونہی بدلتی رہے گی اور ادب کی روشنی مسلسل پھیلتی رہے گی اور یہ نورِ افکار و اذہان کو منور کرتا جائیگا۔ زمانہ قدیم سے ہر زبان میں بے شمار ضرب الامثال اور کہاوتیں اس کے بولنے والوں کو ازبر ہیں۔ یہ ادب کا نچوڑ ہے۔ یہ جگنو کی روشنی کی طرح بازیچہ اطفال میں ذکاوت، خوشی، سکون اور طمانیت کو فروغ دیتے ہیں۔ ادب کے یہ آثارِ قدیمہ نہ جانے کن ادوار سے بدلتی دنیا کے ہمراہ ہمسفر ہیں۔

ہماری عمر کے لوگ جو کہ اب اگلے وقتوں کے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اس بدلتی ہوئی دنیا کا مشاہدہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ فی زمانہ جو تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں اور حالات و واقعات جس تیزی سے پلٹا کھا رہے ہیں، اگلے وقتوں میں تو ایسا نہیں تھا۔ ہم اس گوناگوں تبدیلی پر محوِ حیرت ہیں اور سوچتے ہیں کہ آخر یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی لیکن آج کل کی نوجوان نسل اس کو غیر معمولی بات نہیں سمجھتی، چونکہ ہم حال کا موازنہ اپنے ماضی سے کرتے ہیں اس لئے بدلتی دنیا کو جانچنے اور پرکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے، البتہ اس کے لئے ہر کسی کے پیمانے جدا اور مختلف ہیں۔ اس بارے میں ہر دانشور، ادیب اور شاعر اپنے اپنے انداز سے سوچتا ہے۔

وقت کے بدلتے دھاروں کے ساتھ ادبی رجحانات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے، کبھی رجعت پسندی کا غلبہ ہوتا ہے تو کبھی ترقی پسندی حاوی ہو جاتی ہے، کبھی ادب مزاحمتی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور کبھی انقلابی کیفیات کے سانچوں میں ڈھل جاتا ہے۔ بدلتی دنیا کے ہر دور میں ادب اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ گزشتہ بیسویں صدی ہی کو لے لیجئے۔ اس دور کے ادب نے آزادی کی تحریکوں، ایشیاء، افریقہ، یورپ اور جنوبی امریکہ میں پیش آنے والے واقعات، فلسطین، کشمیر، ویتنام، الجیریا، افغانستان، دیوارِ برلن، چیچنیا، عراق اور اسی نوع کے بے شمار حوادث سے بہت کچھ حاصل کیا اور بہتوں کی راہنمائی کی، ان پر بہت کچھ لکھا، عبرت و تنبیہہ کے لئے، ہوشمندی اور ہوشیاری کے لئے تفکر و تدبر کی خاطر، دفاع و پیشرفت کیلئے، حقوقِ انسانی کی سربلندی کے لئے، آزادی اور امن کے حق میں کبھی سراپا احتجاج بن کر اور کبھی فتح و کامرانی کی نوید دے کر۔ یہ اور اسی طرح کے بے شمار موضوعات کو پیشِ نظر رکھ کر اہلِ قلم، ادیب اور دانشور نے اپنا فرض پورا کیا۔ انسان بدلتی دنیا کا محور ہے۔ اقبال نے

کیا خوب کہا ہے:

غلام ہمت آں رہروم کہ پا نہ گذاشت
بہ جادۂ کہ رود کوہ و دشت و دریا نیست

بے تحاشا سرعت سے بدلتی یہ دنیا اب مقامیت، علاقائیت اور وطنیت کے محدود دائروں سے نکل کر انسانیت اور گلوبلائیزیشن کی طرف گامزن ہے۔ انٹرنیٹ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی نے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ اقوام و ملل ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ نائن الیون، ٹیررازم اور سونامی جیسی آفات نے عالم انسانیت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے ان سے بے شمار اسباق حاصل کر لئے ہیں۔ ان اسباق سے دنیائے ادب صرف نظر نہیں کر سکتی۔ دانشور، ادیب، شاعر اور تخلیق کار تو انسانی معاشرے کی روشن آنکھیں ہیں۔ یہ بینا آنکھیں ان اسباق کو ہم سب کے سامنے کھول کھول کر رکھتے اور ان کا مطالعہ، مشاہدہ کرانے سے غافل نہیں ہو سکتیں۔ یہ ان کا فرض اولین ہے اس لئے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مستقبل کا ادب بدلتی دنیا کی گوناگوں تبدیلیوں کا مشاہدہ کرنے والا اور ترجمان ہوگا۔ بقول شاعر:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال

آپ سب کو مجھ سے بہتر اس بات کا احساس ہے کہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں بعض اخلاقی قدریں ایسی ہیں جو بظاہر مستقل نہیں، لیکن بیشتر مسلسل تغیر پذیری کی کیفیت میں رہتی ہیں۔ جو قدریں مستقل ہیں وہ تو آپ کا مذہب، تمدن یا قوم و ملک سے وابستگی ہے مگر جو قدریں مسلسل بدلتی رہتی ہیں وہ ہیں بین الاقوامی حالات جن کے خوش و ناخوش اثرات سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ ان سے ہر معاشرے کی مستقل اقدار بھی متاثر ہوتی ہیں۔

اگر مذہبی نقطۂ نگاہ سے بات کی جائے تو آج کی دنیا میں حق کی ایسی کوئی تعریف نہیں جو سب انسانوں کے لئے قابل قبول ہو مگر اس کے باوجود ہر مذہب نسل انسانی کی بنیادی وحدت اور انسانیت کی خدمت کی تعلیم دیتا ہے۔ جب حق کے وجود کے بارے میں سوچیں مختلف ہوں تو ایک دانشور کے لیے اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ اپنے روحانی عقیدے پر قائم رہتے ہوئے انسانیت ہی کی طرز پر سوچے اور انسانیت ہی کی فلاح و بہبود کے لئے غور و فکر کرے۔

کرۂ ارض پر سب کو اکھٹے رہنا ہے مگر اس سیارے کے وسائل محدود ہیں۔ تاریخ عالم شاہد کہ اگر ہم کوشش بھی کریں تو ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں سکتے البتہ ایک دوسرے کو ایذا ضرور پہنچا سکتے ہیں۔ اس لئے لازم ہے کہ ہم سب اپنے آپ میں وسیع النظری کی صفت کو فروغ دیں، قوت برداشت پیدا کریں، اختلاف رائے کو رحمت کی بجائے زحمت نہ بنائیں، ایک دوسرے کے غم اور خوشیاں بانٹیں اور آپس میں ہمسایوں کی طرح رہنے کی عادت ڈالیں ہمیں فکر کرنا چاہیے کہ ہمارے بعد ہمارے بچے ایسے سیارے کے وارث نہ بنیں جو طمع، نفرت اور تشدد کے باعث پاش پاش ہو چکا ہو اور جس میں بود و باش کے لیے گردونواح تنگ سے تنگ ہوتے چلے جائیں، بلکہ ہمیں ایسے مواقع پیدا کرنے کی خاطر جد و جہد کرنی چاہیے کہ وہ باہمی فلاح کے لیے علم اور حکمت کی معاہدوں کو آگے دھکیلتے چلے جائیں۔ تیکنیکاتی ترقی کی تیز رفتاری، سکڑتے فاصلوں، ابلاغ کے فوری رابطوں اور کھلی سرحدوں کے سبب ایسا ممکن ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکیں اور بہتری کی خاطر ایک دوسرے کی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکیں۔ اگر دنیا بھر کے شاعر، ادیب اور دانشور تہیہ کر لیں تو امیر اقوام کو غریب اقوام کے معاشی استحصال سے روکا جا سکتا ہے اور یوں ہم اس جہان کو تہہ و بالا کر سکتے ہیں جو انسان کو انسان کے خلاف غیر انسانی سلوک روا رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ انسانیت کی بقاء کا انحصار ہر انسان کی اخلاقی جہت کی نشو و نما پر ہے بلکہ ہر مذہب اور تمدن کی عملی کوشش بھی یہی ہے کہ انسان اپنی شخصیت کے اخلاقی پہلو کا اظہار جب اور جہاں بھی موقع ملے کرتا رہے۔

پس ظاہر ہے انسانی یک جہتی کا آئیڈیل اجتماعی اخلاقی عمل کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

آج کی بدلتی ہوئی دنیا میں انسان کی بڑھتی ہوئی مشکلات کے اسباب کیا ہیں؟ بعض خطوں میں آبادی کا غیر متناسب پھیلاؤ، قدرتی ماحول کی رفتہ رفتہ بربادی، قومی ریاستوں کی آپس میں بداعتمادی، ہر انسان کا غیر محفوظی اور غیر یقینی کے عالم میں زندگی بسر کرنے کا المیہ، خودکشیوں کی بہتات، تیسری دنیا کے ممالک میں غربت اور افلاس کا بڑھتے چلے جانا۔ گلوبلائزیشن کے پرفریب نعرے اور بین الاقوامی معیشت کے غیر متوازن ہونے کے پس منظر میں امیر صنعتی ممالک کی ملٹی نیشنل اور ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں کا نیا معاشی امپیریلزم کا ظالمانہ نظام، تیسری دنیا کے مفلوک الحال، فاقہ زدہ، کمر توڑ قرضوں کے بوجھ تلے پسے ملکوں کا بغیر کسی وجہ کے عسکری قوت کو بڑھانے کا رجحان اور بالآخر ہر سمت کسی نہ کسی نوع کی دہشت گردی کا خوف۔ کیا ان اسباب سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ہم بد سے بدتر ہوتی ہوئی ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں پر انسان کی، خواہ وہ کہیں بھی ہو، اپنے اردگرد سے خوفزدگی کم ہونے کی بجائے دن بدن بڑھ رہی ہے اور جہاں تک بین الاقوامی سیاسی قائدین کا تعلق ہے، وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، شمال کے ہوں یا جنوب کے، ان مسائل کو سلجھانے میں قطعی طور پر ناکام رہے ہیں۔

عسکری دوڑ کو تو اقوام کی آپس میں بداعتمادی اور ہٹ دھرمی تقویت پہنچاتی ہے۔ دہشتگردی کی تعریف کے بارے میں اقوام عالم کی آراء میں اتفاق کا فقدان ہے، ایک کا دہشت گرد دوسرے کا اپنے وطن کی آزادی کی خاطر جدوجہد کرنے والا مجاہد ہے، مگر مسئلہ تعریف پر جھگڑنے کا نہیں جب تک اقوام عالم دہشت گردی کے اسباب ختم نہیں کرتیں، اس قسم کے تشدد سے دنیا کو چھٹکارا مل سکنا محال ہے۔

اس تناظر میں پاکستانی ادب کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان بعض ایسے مصائب سے دوچار ہے جن کا تیسری دنیا کے دیگر چھوٹے ممالک کو سامنا ہے مگر بعض مسائل خصوصی طور پر ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں جن کی مثال دوسری اقوام میں کم ملتی ہے۔ مثلاً مذہبی منافقت، متشدد فرقہ واریت، سیاسی اور دیگر امور میں عدم رواداری، انسانی ہمدردی کا فقدان، قومی انتشار۔ ان قومی مشکلات کے حل کے لیے ہمارے شاعر، ادیب یا دانشور دو راستوں میں سے کوئی ایک منتخب کر سکتے ہیں۔ ایک راہ تو فرار کی ہے اور دوسری ہے حالات سے نبرد آزما ہو کر انہیں بدل دینے کی۔ دراصل یہ دو نصب العین ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مطلق ادبی نقاد کی حیثیت سے ان ہر دو نصب العین میں سے کونسا پسند فرمایا۔ ہے تفہیم القرآن میں مولانا مودودی سورہ شعر (11 تا 26 آیات 224 تا 227) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ شاعر معتوب ہیں جو عشق بازی، شراب نوشی، یا آوارگی کے مضامین بیان کریں، بازاری عورتوں یا کسی کی بہو بیٹی کے حسن کو موضوع سخن بنا کر پیش کریں ۔" بقول ان کے یہ وہ مادہ پرست اور دہریے شاعر و ادیب ہیں جو اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جسمانی لطف ولذت کے پرستار نیم حیوان قسم کی مخلوق، جنہیں احساس نہیں کہ دنیا میں انسان کے لیے کوئی بلند تر مقصد ہو سکتا ہے۔ یہ وہی شکست خوردہ لوگ ہیں جو مشکلات کا مقابلہ کرنے کی بجائے انسان کو فرار کی راہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر جن شعراء ادباء کو ان سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، وہ چار خصوصیات کے حامل ہیں۔ اول یہ کہ مومن ہوں، دوم

اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں، سوئم ذاتی طور پر اور اپنی تحریروں میں اللہ تعالیٰ کو اکثر یاد کرنے والے ہوں اور چہارم ذاتی اغراض کی خاطر کسی کی ہجو نہ کریں، نسلی، لسانی، قومی یا فرقہ وارانہ عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ نہ بھڑکائیں، مگر ظالموں کے مقابلے میں صداقت و انصاف کی حمایت میں زبان و قلم سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد شمشیر سے لیتا ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ادب و آرٹ کے نقاد مطلق کی حیثیت سے اپنے احکام قرآن مجید کے ذریعہ ہم تک پہنچائے ہیں۔ اسی طرح سیدنا محمد صلعم کی معاصر شاعری پر حکیمانہ تنقید بھی احادیث میں ملتی ہے۔ آنحضورؐ نے شاعری کا معیار کیا نہ ہونا اور کیا ہونا چاہیے کے بارے میں امراء القیس اور عنترہ کے شاعرانہ کلام کو موضوع تبصرہ بنایا ہے۔ اس تبصرہ کی روشنی میں علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"آرٹ میں جو کچھ خوب ہے، ضروری نہیں کہ وہ زندگی میں خوب سے مشابہت رکھتا ہو۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور حیف ہے اس شاعر پر جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھائے۔ اس کی ذمہ داری تو یہ ہے کہ فطرت کی لازوال دولتوں میں حیات و قوت کا جو حصہ اسے ودیعت کیا گیا ہے، اس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ کہ اٹھائی گیر بن کر جو رہی سہی پونجی اس کے پاس ہے، اس کو بھی ہتھیا لے۔"

اسی تنقید کے حوالے سے اقبال آرٹ کو حیات انسانی کے تابع قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ادب کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی صلاحیت کتنی ہے۔ ایسا ادب جو اس صلاحیت سے محروم ہو اقبال کے نزدیک حیات کش ہے۔ ان کی رائے میں تمام انسانی عمل کا منتہائے نظر شوکت، قوت اور جوش و خروش سے بھری زندگی کی تحصیل ہے۔ پس ارفع ادب وہی ہے جو انسان کی خوابیدہ قوت عزم کو بیدار کرے اور اسے زندگی کی آزمائشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ترغیب دے لیکن وہ سب کچھ جس کے اثر سے وہ اونگھنے لگے اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں اس کے گردوپیش موجود ہیں، جن پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے، ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لے، انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"آرٹ میں افیون نوشی کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ یہ نعرہ کہ آرٹ برائے آرٹ یا آرٹ قائم بالذات ہے، انفرادی و اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے اور اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکہ دے کر چھین لی جائے۔"

اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ وقت کے جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر قوموں کو ہر مشکل مرحلہ پر کسی نہ کسی نئے نصب العین کی تلاش ہوتی ہے اور ادب کے میدان میں نیا نصب العین وہی خود شناس، بے خوف اور آزاد شخصیتیں متعین کرتی ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کو منکشف کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں اور ایسے نئے معیار دریافت کر سکنے کے قابل ہوں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکیں کہ ہمارے گردونواح دائمی نہیں بلکہ بدلے بھی جا سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اقبال کی شاعری جس نصب العین کی پابند رہی اس کی وضاحت وہ شاعرانہ انداز میں یوں کرتے ہیں۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرہ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

بدلتی دنیا میں ادب کا کردار نہایت فکر انگیز موضوع ہے اور ہمارے قلمکار اس پر طرح طرح سے اظہار خیال کریں گے اور اس سے روشنی کی کئی لویں پیدا ہوں گی لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ بدلتی ہوئی دنیا، ادب کے کردار کو متزلزل نہ کر سکے گی اور وہ اپنی منزل کی طرف ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھتا رہے گا۔ یہ منزل امن و آشتی کی منزل ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ ادب روز اول سے انسان، انسان دوستی اور انسانیت کے فروغ کی تلاش میں رہا ہے اور اس تلاش نے انسانی معاشرے کو ہمیشہ جلا بخشی ہے۔

مشرق میں تخلیقی ادب کے میر کارواں علامہ اقبال و شاہ لطیف بھٹائی کے معنوی راہنما مولانا روم نے بہت پہلے ایک مکالمے کے ذریعے، ہم پر ادب کے کردار کو اس طور پر واضح کر دیا تھا کہ:

دی شیخ ، با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کزدام و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

ادب کا یہی اساسی اور دائمی کردار ہے اور ادب کے بقا و استحکام کا راز اسی کردار میں مضمر رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ میر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

خدا ساز تھا آذر بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

واقعی آدمی، اگر آدمیت کا پیکر بنا جائے تو پھر یہی دنیا، جسے وہ دوزخ سمجھ رہا ہے اس کے لئے جنت بھی بن سکتی ہے لیکن غالبؔ کے لفظوں میں:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اگر آدمی کو انسان بننے کی توفیق ہو جاتی تو مولانا حالیؔ یہ کیوں کہتے کہ

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

ہم جانتے ہیں کہ ادب اور صاحبانِ ادب کی ایک الگ شریعت ہے اس شریعت کا پہلا درس بقول حافظ شیرازی یہ ہے:

مباش درپئے آزار ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیرِ ازیں گناہے نیست

ایک اور جگہ حافظ نے کہا ہے کہ زندگی خواہ کتنی ہی کروٹیں بدلے، ادب، اخوت و محبت ہی کو اپنا راہبر بنائے رکھے گا اور اس پر زندگی کی راہیں ہموار کرنے کی کوشش میں لگا رہے گا اس کوشش سے جو معاشرتی زندگی نمو پذیر ہوگی وہ خوشگوار اور دیرپا ہوگی بقیہ دوسرے سارے اسباب کمزور اور ناپائیدار ثابت ہوں گے۔ حافظ شیرازی کے لفظوں میں:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

شاید اسی لئے جگر مرادآبادی نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ادب کا کردار سیاست کے کردار سے بالکل الگ ہے، اہل ادب کبھی اہل سیاست کے ساتھ دیر تک اور دور تک نہیں چل سکتے:

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ادب کے کردار کے سلسلے میں، اسی طرح کا حکم، دوسری زبانوں کے تخلیق کاروں نے بھی لگایا ہے۔ ہندی کے مشہور شاعر عبدالرحمٰن خانخاناں نے اپنے ایک دوہے میں کہا ہے کہ محبت اور پیار کا رشتہ ہی آدمیت اور انسانیت کا سب سے طاقتور رشتہ ہے۔ انسانی معاشرہ جب تک اس رشتے سے جڑا ہوا ہے پھولتا پھلتا رہے گا۔ اس رشتے کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو معاشرہ بھی ٹوٹ جائے گا اور جوڑنے سے جڑے گا نہیں بلکہ اس کے دھاگے میں گانٹھیں پڑ جائیں گی اور یہ ایسا الجھ جائے گا کہ سلجھانا آسان نہ ہوگا۔ رحمٰن کا دوہا دیکھئے:

رحمٰن دھاگا پریم کا جن توڑو چٹکائے
جوڑے سے جڑے نہیں بیچ گانٹھ پڑ جائے

اردو کے شاعر فانی بدیوانی نے سچ کہا ہے:

بہت نازک مگر جب توڑیے تو ٹوٹنا مشکل
یہ زنجیرِ محبت بھی عجب زنجیر ہوتی ہے

اس طرح تلسی داس نے اپنے ایک دوہے میں بہت پتے کی بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں شیریں کلامی کو اپنانا چاہیے، میٹھے بول اپنے اندر ایسی طاقت رکھتے ہیں کہ انسان کو اپنی طرف ہمیشہ کے لئے کھینچ لیتے ہیں، گویا یہ ایک ایسا منتر ہے جو آدمی کو بے دام اپنا غلام بنالیتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دنیا، سکھ اور چین کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ تلسی داس کا

دوہا یہ ہے:

تمسی میٹھے بچن تے سکھ اوپجت چہوں اور
وش کرنتر ایک منتر ہے تج دے بچن کٹھور

غرض یہ کہ ادب نے معاشرے کی بہبود و آراستگی کے لئے ہمیشہ محبت اور پیار کا راستہ اپنایا ہے۔ آج بھی وہ اس راستے پر گامزن ہے۔ اور بدلتی ہوئی زندگی ادب کے اس پاکیزہ کردار کو متاثر نہیں کر سکتی۔

ڈاکٹر حنیف فوق

ادب زندگی کا آئینہ دار ہے اگر عصری صورتحال میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کے اثرات ادبی رجحانات میں بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ اب دنیا یک قطبی دنیا ہو گئی ہے اور اپنے پیدا کردہ تضادات کی وجہ سے دوسری بڑی طاقت کا پہلے جیسا اثر و نفوذ باقی نہیں رہا ہے چنانچہ دنیا جواب تک توازن طاقت کا سہارا لیتی تھی، اب ایک ہی جانب مائل ہو گئی ہے کہ معروضی حالات کا تقاضہ یہی ہے۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں اثرات ہوئے ہیں۔ مثبت اثرات میں دہشت پسندی کے خلاف ایک عمومی رجحان اور انتہا پسندی کی مخالفت شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ترقی پسندانہ روشن خیالی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ گلوبل اثرات سے روشن خیالی کی ایک ایسی لہر بھی آئی ہے جس میں مغربیانے کا عمل شریک ہے۔ مغرب زدگی اور جدید کاری دو الگ الگ عمل ہیں۔ پاکستان کے ادبی رجحانات نے جہاں قومی طور پر اعتدال پسندی کی راہ اختیار کی ہے وہاں مغربیانے کے عمل کو مسترد کر دیا ہے، کیونکہ بین الاقوامی تناظر میں ادب کی پہچان اپنے ہی قومی اور تہذیبی حوالوں سے ہوتی ہے، نری تقلید سے نہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، قومی اور اہم بین الاقوامی ضرورت ہے۔ اسے نظر انداز کرنے میں اپنا ہی نقصان ہے لیکن سائنسی ترقی کے اس دور میں بھی کتابوں اور ادبی رسائل کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ یہ انسان سازی کا عمل ہے اور ادب کا واسطہ انسان کے اعمال و کیفیات سے ہے۔ ادب خیالات کا سرچشمہ ہے اور خود سائنسی ایجادات کا ماخذ ہے، چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں بھی ادب کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

اگر ادب تخلیق کی لہر جمالیاتی جستجو، تہذیبی مزاج کا اظہار، ہیت اجتماعی کا آئینہ اور معاشرتی تقاضوں کا ترجمان ہے تو اس کے قاری کم کیوں ہوتے جاتے ہیں۔ اس سوال کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خود ادب کا قاری سے رشتہ کیوں کمزور پڑتا جاتا ہے۔ اس کی مختلف وجہیں بیان کی جا سکتیں ہیں۔ یہ کہا جا سکتا کہ اب عام لوگوں کی زندگی میں دلچسپی کے متعدد ذرائع ہیں اور ہنگامی زندگی کے دباؤ یا کم فرصتی کے ہیجان میں وہ دیگر ذریعوں کی جانب مائل ہونے لگے ہیں کہ ان میں تفریح کے عناصر زیادہ ہیں اور ذہنی یکسوئی کی ضرورت کم پڑتی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب اب بھی خیال سازی کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور دوسرے ذہنی سرچشمے بھی ادب ہی سے فیض اٹھاتے ہیں۔ انسانی رشتوں کے انحطاط، اقدار کی شکست، بے یقینی اور افراد کی اپنی ضروریات یا آسائشوں کے لیے مسلسل تگ و دو کو بھی ادب سے کم دلچسپی کا سبب ٹھہرایا جا سکتا ہے، کہ اب زندگی میں سکون سے زیادہ اضطرار آ گیا ہے لیکن پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا بدلتے ہوئے حالات میں ادب نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ انتہائی نامساعد حالات میں بھی ادبی شہ پارے وجود میں آئے ہیں جن کے ظہور سے انسانی شعور میں اضافہ ہوا ہے ذہنی بلندیوں کا احساس

جاتا ہے؟ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ادب کی اپنی دنیا ہے، یہاں عام لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی، تعلیمی معیار اور تعلیمی نظام کی خرابی کو بھی اس کا سبب بتایا جاسکتا ہے کہ اب تعلیم حصول روزگار کا بس ایک ذریعہ ہے، جس میں سر پھروں کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے لیکن انسان کے مجموعی علم میں اضافے سے ایسے ہی سر پھروں کا کام رہا ہے اور یہ سوال اٹھتا ہے کہ ادب نے تعین ترجیحات سے سالمیت وجود کی جانب توجہ دلائی ہے؟ ادب کی عام زندگی سے بلندی کی بات اس وقت صحیح ہوسکتی ہے جب ادیب اپنے آپ کو عام انسانی زندگی سے الگ ایک مساوی یا تحت ارضی وجود فرض کرلے۔ ورنہ دنیا کے بڑے ادیبوں نے تکنیک کے تنوع اور فکر کی جدت کے ساتھ نہ صرف عام زندگی کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا ہے بلکہ عصری تضادات کی نئی شکل آفرینی کے ذریعے وہ اپنے عصر کی زبان اور مستقبل کے اشارہ کنندہ بھی بن گئے ہیں۔ کبھی کبھی بین الاقوامی تناظر میں غیر ادبی عوامل کی یلغار کو بھی ادب سے دلچسپی کی کمی کا ایک سبب بتایا جاتا ہے لیکن ادب خود بین الاقوامی ماحول کا نظارہ کنندہ، مرد پیش سے باخبر اور علوم کی روشنی کا حامل رہا ہے۔

کیا یہ بات موجب حیرت نہیں کہ جب دنیا سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آرہی ہے، ہمارے ادبی محرکات میں ابتری کیوں آگئی ہے جو ادب کو ہمارے اور دوسروں کے لئے انکشاف اور دلچسپی کا باعث بناسکیں۔ ادب ایک عالمی میراث ہے چنانچہ جہاں ہم پر دوسرے ملکوں کے حسن وحسیت کے دروازے کھلتے ہیں وہاں مثال کے طور پر فیض، منٹو، احمد ندیم قاسمی اور شوکت صدیقی کے ادبی کارناموں کی بین الاقوامی طور پر پذیرائی ہورہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم بھونڈی تقلید سے خود اپنے ادب کو پنپنے کی راہیں مسدود کردیں۔ دوسرے ہمیں ہمارے تہذیبی حوالوں سے پہچانتے ہیں، نقالی اور تقلید سے نہیں۔

خود ادب میں سائنسی نظر اور روش علمی نے نئے جہات فراہم کئے ہیں اور زندگی کو فکر ایجادات اور تنظیم انسانی کا راستہ دکھایا ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کی ایجادات ہیں لیکن انسان کی مہم جوئی، جو ادبی تخلیقات سے ہمیشہ ہمیشہ پیوست رہی ہے، تمام ایجادات کا منبع کہی جاسکتی ہے۔ آج ادب سے کم دلچسپی کے ذمے دار خود ادیب ہیں ورنہ اس برصغیر میں وہ زمانہ بھی رہا ہے کہ ایک زندہ تحریر، ایک نظم، ایک گیت اور ایک افسانے نے نہ صرف اس کے مصنف کو ملک گیر شخصیت بخش دی ہے بلکہ اس کی وہ زندہ تخلیق وسیع ادبی تجربوں اور نئے ذہنی محرکات کا سبب بھی بنی ہے۔

اس سوال کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ادیبوں کے کونسے رویے ہیں، جنہوں نے ادب اور قاری کے رشتے کو کمزور کیا ہے؟ ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ادیب اپنی تخلیق سے مخلص نہیں رہا ہے۔ جب زیادہ سے زیادہ ستائش کے خواہاں ہر مصنف کو ارباب توصیف کی بے بنیاد داد میسر آنے لگے تو اقبال کے لفظوں میں "خون جگر" کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ الگ بات ہے کہ سستی شہرت کے انبار اور جھوٹ کے طومار سے قاری پر جو بے اطمینانی بلکہ بیزاری طاری ہوتی ہے، اس کا اثر لفظ کی حرمت اور ادب کے وقار کے ہر گوشے تک پہنچتا ہے۔ لفظ کی حرمت اور ادب کے وقار سے اخلاقی سطح پر یہ وابستگی اس پورے غیر منصفانہ نظام سے وابستگی بن جاتی ہے جس کا یہ معاشرہ شکار رہا ہے۔

ادب میں یکسانیت ضرور جرم ہے اور تازگی فکر واظہار شرط ترقی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جدت خلاؤں میں بھٹکنے سے نہیں آتی بلکہ اس کے لیے اپنی زمین اور اپنے ماحول سے ربط مستحکم ضروری ہے۔ کیا آج ہمارے ادیبوں کی اپنی تہذیب اور معاشرت سے یہ مطابقت باقی رہی ہے؟ وہ رشتہ جو انہیں قاری سے منسلک کئے ہوئے تھا، منقطع ہوتا جارہا ہے۔ ان کی تحریروں میں وہ جان نہیں ہے

جو پوری سچائی کے اظہار سے آتی ہے۔ وہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر معنوں سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ وہ اس تڑپ سے جو عام انسانوں کے دلوں میں، خوابوں اور امکانات عمل کی صورت میں پرورش پا رہی ہے، دور ہو کر ایک ایسی زبان میں گفتگو کرنے لگتے ہیں جو ایک محدود گروہ کی اصطلاحات یا تلازموں پر مبنی ہے۔ ان میں اور قاری میں ذہنی ربط باقی نہیں رہا ہے۔ وہ اس مغائرت کو ادبی پرچم بناتے ہیں۔ ابلاغ کی یہ مشکل صرف وسائل اظہار کی مشکل نہیں۔ غالب اور اقبال کی شاعری بہت عام فہم نہیں لیکن اس کا اپنی تہذیب اور انسانی جدوجہد سے وہ گہرا تعلق ہے کہ ان کے مفہوم کی پرچھائیاں بھی لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔ اپنے زمانے میں ذرائع نشر و اشاعت کی کمی کے باوجود لوگ غالب کے اشعار دوسرے شہروں کے اہل ادب تک بطور سوغات لے کر جاتے رہے ہیں۔ اس کے برخلاف آج ذرائع تشہیر کے بڑے وسائل کے ہوتے ہوئے شہرت کے ڈنکے کی آواز ذہنی ارتعاش پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہے، پھر ایسے لکھنے والے جس بوطیقا کی بات کرتے اور جن معنوں کو بطور حوالہ پیش کرتے ہیں، وہ ہمارے حالات اور ماحول سے براہ راست غیر متعلق ہیں۔ البتہ خود ان مصنفوں کی تصنیفات میں ان کے ذہنی حوالے بہت واضح اور وسیع ہیں۔ ان حوالوں سے ان کے اور قاری کے درمیان رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اتھلی تقلید سے نہ صرف یہ حوالے گم ہو جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے ذہنی منظر یا مختلف گروہ و تہذیب کی آواز ہم تک مسخ ہو کر پہنچتی ہے۔ کیونکہ بیچ کے حوالے مفقود ہوتے ہیں اور ادبیت کی زلف مشکیں کے پیچ بھی بیچ کے حوالوں کے بغیر نہیں کھلتے۔ جو پڑھنے والے ایسے مصنفین کی تحریریں بغیر ان ذہنی حوالوں کے پڑھتے ہیں، وہ فکری پس منظر اور تہذیبی تسلسل کو نظر انداز کر کے غلط نتائج اخذ کرتے ہیں۔

انسانی آگہی سے ادب کے پیدا کردہ تعلق کو پارہ پارہ کرنے کے لیے بھی مختلف وسائل علم سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً علم اللسان سے تفہیم قواعد، زبان و بیان کو تقویت ملتی ہے لیکن ادب ان قواعد تک محدود نہیں اور نہ لسانیات خود منطقی حیثیت رکھتی ہے۔ آواز و بیان کی تبدیلیاں، تہذیب و ماحول اور خارجی حالات سے غیر منسلک نہیں البتہ ان حدود میں بعض اصولوں کی تلاش کی جا سکتی ہے اور لفظوں کے رشتوں یا معنوں کے سلسلوں کی دریافت کا کام ہو سکتا ہے لیکن کوئی ایسی عمیق ساخت تمام زبانوں کے لیے یکساں طور پر قابل عمل ہو، محض مفروضہ ہے۔ خود ادب کا تخلیقی عمل قواعد اور کلام کے منقسم دائروں سے تجاوز کرتا اور نئی وحدتیں ڈھالتا ہے۔ وٹ جین اسٹین نے کہا تھا کہ ''ہم زبان کو صرف بیانات کے لیے نہیں، جو قابل ثبوت، قابل تردید، تجزیاتی یا خود تضادی حیثیت رکھتے ہیں، بلکہ کام کرنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ لسانیات کے متحارب نظریوں میں نظریہ عمل بھی ایک نظریہ بن گیا ہے جسے بعض نے کلام کے عمل کرنے کو (speech act) دراصل زبان کے ابلاغ کی بنیاد اور اکائی مانا ہے۔ انتہائی میکانکی اور شماریاتی تصورات سے لے کر یک زمانی، عصریاتی، نفسیاتی، جمالیاتی، بشریاتی، غرض یہ ہے کہ متعدد رجحانات کے پیدا کردہ شدید انواع نظر تک ہمیں ایسے متحارب نظریے ملتے ہیں کہ لسانیات، نظریوں اور روشوں بائے اسلوب شناسی کا پرشور میدان جنگ بن گئی ہے۔'' لیکن ان نظریوں کے حدود کو ادب کی وسعتوں پر مسلط کر دینے کی خواہش درست نہیں کیونکہ زبان و ادب جملہ بندی احوال اور کارساز استقبال بھی ہیں۔

لارنس ڈریل نے بعض ملکوں کی صورتحال سے بیزار ہو کر یورپ سے وابستگی کو اہم سمجھا تھا اور مشترک منڈی میں شامل ہونے کی بات کی تھی۔ اس مشترک منڈی کے تصورات، یورپ کی صنعتی ترقی اور آسان گزار سرحدوں کے ذہنی رویوں کا پتہ دیتے ہیں۔ آج یورپی یونین ایک نیا توازن طاقت قائم کر رہی ہے لیکن ہمیں اپنے معاشرے میں ملکی سالمیت، انسانی آزادی،

جمہوریت اور حقوق نسواں کے مسائل تلاش کرتا ہیں۔ (جو انسانی تحریک سے الگ ہوتے ہوئے بھی اپنی شناخت [illegible]
اپنے حالات سے آسودہ اور لفظوں کے نشاط کے خواہاں کہتے ہیں کہ مصنف وہ ہے جس کے پاس لکھنے کو کچھ نہ ہو، لیکن ہمیں اس
سماجی انصاف، اقتصادی بہتری اور فرقہ پروری کے خلاف نقطۂ نظر کو اپنا مطمحِ نظر بناتا ہے، پھر ادبی طور پر [illegible]
شقاوت، دہشت پسندی، تنگ نظری اور ذہنی تاریکی کے خلاف ادبی جمالیاتی صورتیں تلاش کرتے ہیں جو لوگوں [illegible]
جائیں انفرادی نامساعد حالات کے خلاف جدوجہد خود اجتماعی رخ رکھنے والی ایک رزمیہ داستان ہے۔ زندگی [illegible]
والی صورت حال میں ہمیں ادبی بصیرت کو ترک کرنا یا اس سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ انسانی تاریخ میں انسان اپنی فکر سے بے
مصلوب ہوتے رہے ہیں، لیکن اسی روشن فکری سے انسانی تاریخ آگے بڑھی ہے دہشت و انتشار کی چھا جانے والی تاریکی اور
زندگی کی آسائشوں کی نظروں کو خیرہ کر دینے والی چمک ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں لیکن اقدار کی پہچان ہیں اور کھرے سے کھوٹے کی
پہچان ہی ادب کا سب سے بڑا منصب ہے۔ اس کے برخلاف ادب کو اقدار سے بیگانہ کر دینے کی کوشش ایک وسیع المیاتی منصوبہ
ہے۔ ادب مشین نہیں ہے اور نہ خودکاری ادبی بصیرت تک لے جا سکتی ہے۔ ادبی بصیرت ہی زندگی کی ناکارگی، بے حسی اور انتشار
میں حسن و خیر کا راستہ دکھاتی ہے۔ یہ بات بھی جاننے کی ہے کہ زندگی کو پیش کرنے کے لیے ادب کے اسالیب کی شکست یا ناکارہ
ادب سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

انسان زندگی کا پیکر ہے، بے جان ڈھانچہ نہیں۔ عوامل زندگی اور مستقبل کی نظر ایک زندہ پیکر کی صفات ہیں۔ ادبی تخلیقات
کی کارفرمائی کے لیے ادب کا تمام زندگی سے رابطہ پھر استوار کرنا پڑے گا۔ ہمیں اپنی سرزمین سے محبت کو قائم رکھنا اور اس سرزمین
کے لوگوں سے تعلق کو بدلتی ہوئی صورتحال میں ہمیشہ تازہ رکھنا ہے۔ اس تازہ رکھنے کے عمل میں قدیم ادبی تحریروں کی بازیافت بھی
شامل ہے۔ یہ تحریریں ادب سے گریزاں اور ذہنی الجھنوں میں پناہ ڈھونڈنے والے قاریوں کے لیے بھی دلکشی رکھتی ہیں۔ ان کے
ہم تک بازار میں موجود ہے۔ عام انسانی زندگی کے لیے حقارت کے رویے سے نہیں، عام لوگوں کی زندگی کے اظہار سے ادب کو
فروغ ہوگا اور اسے نئی زندگی ملے گی۔ اس کے لیے خواندگی کو عام کرنے، تہذیبی منزلت کا احساس جگانے اور تعلیم کے فروغ کے
ساتھ ساتھ ریاستی سطح پر ایک دوررس اور مثبت حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ غالب نے اپنے آپ کو "عندلیب گلشن نا
آفریدہ" کہا تھا اور ایلیٹ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "عام بول چال کی چھپی ہوئی موسیقی ہی شاعری کی موسیقی بنے گی۔" دونوں
باتوں میں تضاد نہیں، حقیقت کے حوالوں کا اظہار ہوا ہے۔ ہمارا ادب ایک زمانے میں سرمایہ دانش تھا۔ ہمیں اس روایت کے شعور
کے ساتھ وسیع انسانی زندگی سے توانائی پاتے ہوئے مستقبل کے نقوش سنوارنا ہیں۔ وسیع انسانی زندگی اور ادب کی ہم آہنگی اقبال
کے لفظوں میں "چو شعلہ برفروزم چوب نے مرا" کے مانند ہوگی۔ اقبال ہی نے کہا تھا کہ

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

سب سے پہلے آپ سب کے لئے ایک خوشخبری ہے۔ میں بہت کم وقت لوں گا۔ چونکہ صدارتی نیز ریشن کا محض ایک حصہ ہوں، اس لئے جتنا وقت ایک روایتی صدر لیتا ہے اس کا صرف ایک چوتھائی، بہر اطمینان رکھیں۔ یہ ایک چوتھائی اس صدارت کا نہیں جو 90ء سے پہلے رائج رہی ہوتی تھی۔ میں تو ادبی محفلوں کے اس روایتی صدر کی بات کر رہا ہوں جسے طویل مقالوں سے بے حد شوق ہے یہ جانتی ہے کہ حاضرین چونکہ چونکہ پڑتے ہیں۔ اس لئے میں تو صرف دو منٹ میں چار باتیں کروں گا۔

پہلی بات دنیا جتنی بھی ہے ادب کا رواج بھی نہیں بدلتا، بشرطیکہ وہ ادب ہے۔ جو زمانے سے آتا ہے بھی یہی کہتے ہیں اور ادیب بھی یہی ثابت کرتے ہیں۔ ارسطو نے ڈھائی ہزار سال پہلے زندگی سے تعلق رکھتے ہوئے کہا تھا کہ ادب زندگی کی عکاسی ہے۔ "IMMITATION OF LIFE"۔ انیسویں صدی میں انگریزی کے ادیب آرنلڈ نے کہا تھا۔

LITERATURE ENABLES US EITHER TO ENJOY LIFE OR TO ENDURE IT.

ادب برائے زندگی والے تو آج بھی یہی کہتے ہیں۔ ادب برائے ادب والے تو کہتے تو چوہوار ہیں مگر کرتے وہی ہیں جو وہ کرتے ہیں کہ اپنے ادب کے تار و پود زندگی سے ہی مستعار لیتے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی اپنے تیور چاہے بدلے، دنیا ہزاروں کروٹیں بدلتی رہے ادب ہر حالت میں اس کی عکاسی کرے گا۔ ادب کی عادت، سرشت، خو، وضع، سیرت یا روح جو بھی آپ کہہ لیں وہ عکاسی ہی رہے گی۔ جیسے فطرت کے قوانین قدرت نہیں بدلتے، نہ آگ کا جلنا بدلتا ہے، نہ برف کا جمنا بدلتا ہے، نہ ہوا کا اڑنا بدلتا ہے، اسی طرح ادب کی عکاسی کی خاصیت بھی نہیں بدلے گی۔ HOMER یونانی اساطیر کی شکل میں زندگی کی امکان کا عکس ڈھونڈے گا اور فسانۂ آزاد کا مصنف ایک کلچر کے غروب کی ڈھلان کی عکاسی کرے گا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ عکاسی ہوتی کیا ہے۔ عکاسی میں اگر شاہ کا جبر ہے تو مجبور کی فغاں بھی شامل ہے۔ جلاد کا ہاتھ ہے تو دستِ قاتل کو جھٹکنے کی جرأت بھی شامل ہے۔ شاعر کا قصیدہ ہے تو باغی کا نعرہ بھی شامل ہے اور اگر یہ دونوں رنگ شہر کے گلی کوچوں میں اکھٹے نہیں ہیں تو ادیب کی تحریر میں جھلکنے چاہئیں۔ ان میں سے کچھ بھی کم ہوگا تو وہ عکاسی نہیں ہوگی بلکہ محض موقعہ پرستی ہوگی۔

دوسری بات، زندگی سے میری مراد بالکل وہی ہے جو علامہ اقبال نے کہا ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

زندگی کے اس نشیب وفراز میں بھی ادب کی روح نہیں بدلتی۔ اس کا کردار نہیں بدلتا البتہ اس کی ہیئت یا شکل بدل جاتی ہے تاکہ وہ جوئے کم آب میں کچھوے کی طرح رینگ کر زندہ رہ سکے اور بحر بیکراں میں سرشار مچھلی کی طرح اچھل کر نظر آتی رہے چنانچہ ایک زمانے کی داستان ہیئت بدل کر دوسرے زمانے میں افسانہ بن جاتی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی رومانی شاعری فیض کی نیم سیاسی اور حبیب جالب کی سیاسی شاعری بن جاتی ہے اور "انگارے" کے ضبط ہونے والے افسانے یا منٹو کے گرفتار ہونے والے پرخطر افسانے آج کے محفوظ علامتی اور تجریدی افسانے بن جاتے ہیں۔ کہنے کی شکل بدل جاتی ہے مگر سوچنے کی شدت اور اظہار کی ضرورت نہیں بدلتی۔ اسی لئے ادب کا کردار نہیں بدلتا۔

اب تیسری بات۔ اور بہت قابل غور بات۔ آج پھر دنیا بدل رہی ہے۔ بدلتی تو پہلے بھی تھی۔ مگر اس دفعہ پطرس کے بیک وقت بھونکنے اور کاٹنے والے "بہت ہی کتے" کی طرح "بہت ہی بدل" رہی ہے۔ پھر بھی مجھے کوئی خدشہ نہیں کہ ادب کی روح یا ادب کا کردار بدلے گا۔ خطرہ صرف یہ ہے کہ کہیں ادیب نہ بدل جائے۔ اس لئے کہ پاکستان کی 57 سالہ زندگی میں ہم نے اسے بدلتے دیکھا ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ اور اس جیسے نصف درجن سرکاری ادبی اداروں کے بعد والا ادیب وہ نہیں رہا جو ان اداروں کے قیام سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ ہم نے چند مراعات کے عوض "ادب برائے ساری زندگی" والے ادیب کو "ادب برائے میری زندگی" والا ادیب بنتے دیکھا ہے۔ 1965 میں پاکستان کے ترانے گانے والے ادیب کو ہم نے 2005ء میں ہندوستان کے قصیدے پڑھتے دیکھا ہے، کیونکہ کوئی غیر ادیب یہ چاہتا ہے۔ اسی طرح غیر ادبی قوتوں کی خواہش کے مطابق ہم نے طوفان نوح سے بچ کر نکلنے والے ادیب کو اپنی ہی کشتی میں سوراخ کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے مجھے صرف یہی خطرہ رہتا ہے کہ عالمیت اور OBALISATION کی تبدیلی میں بعض مقناطیسوں کی کشش اتنی نہ بڑھ جائے کہ ادیب بھی اپنا ادب نظریہ ضرورت کے تحت پیدا کرنے لگے۔

چونکہ میرے حصے کا وقت ختم ہو رہا ہے اس لئے جلدی میں چوتھی بات۔ خوش قسمتی سے یہ بات قانون قدرت کے متعلق ہے جو کبھی نہیں بدلتا اور یہ قانون یہ کہتا ہے کہ روز روز بدلنے والا ادیب جو لکھتا ہے وہ تحریر تو ہوتی ہے مگر ادب نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ ایسی تحریروں سے ادب کا کردار نہیں بدلتا۔

جس طرح شروع میں آپ کو ایک خوش خبری سنائی تھی۔ اسی طرح آخر میں قانون قدرت کی اس خوش خبری کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

پروفیسر فتح محمد ملک

دُنیا بدلتی رہتی ہے مگر ادب کا کردار نہیں بدلتا۔ ادب اور ادیب کا کردار بنیادی طور پر وہی رہتا ہے جو روزِ اوّل سے تھا۔ مسلمانوں کی ادبی روایت کی روشنی میں بات کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ ادب ہمیشہ عشق کا دم بھرتا ہے اور کفر کا کلمہ پڑھتا ہے۔ وقت بدلتا ہے مگر ادیب اپنے اس پیمانِ وفا پر ہمیشہ ثابت قدم رہتا ہے۔ مسلمانوں کی یہ ادبی روایت اور اس میں ادیب کا کردار پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک جاری ہے۔ پہلی صدی ہجری میں جب ملوکیت نے خلافتِ راشدہ کو جاہلیت خالصہ بنا کر رکھ دیا تو حضرت حسینؓ نے اس جاہلیت خالصہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ بیعت سے انکار کرنے والوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے کفر کے فتوے لیے گئے۔ چنانچہ درباری علمائے دین نے حضرت حسینؓ کو، میرے منہ میں خاک، کافر قرار دیا اور یوں یزیدی فوجوں نے انھیں ساتھیوں سمیت شہید کر دیا۔ اس پر ادیب نے اعلان کیا کہ اگر حضرت حسینؓ کافر ہیں تو ہم بھی کافر ہیں۔ ہمیں فتویٰ فروش علمائے سو کے "اسلام" کی بجائے حضرت حسینؓ کا "کفر" پسند ہے۔ مسلمانوں کے ادب میں کفر کی روایت کا سرچشمہ ہماری یہی تاریخ ہے۔

وقت بدلتا ہے مگر عشق کا چلن نہیں بدلتا۔ ہر زمانے میں اسلام کے سچے عاشق بدلے ہوئے حالات میں کفر کا یہی کلمہ پڑھ کر اسلام کی رونق بڑھاتے رہے۔ دو سو سال بعد حسین ابن منصور الحلاج کو جب بغداد کے بابِ خراسان میں سولی پر لٹکایا گیا تو حکومتِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو لوگ انھیں پتھر مارنے آئے تھے ان میں وہ درباری علمائے سو بھی شامل تھے جنھوں نے منصور حلاج پر کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں جب بھی رسمِ ستم خاصانِ زمین کی حکمت قرار پائی اور تائیدِ ستم مفتیانِ دین کی مصلحت ٹھہری، عشق نے ملوکیت اور ملائیت کے اس مشترکہ محاذ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ ہر چند اہلِ اقتدار اور اہلِ مذہب نے اس عاشقانہ کردار کو کفر سے تعبیر کیا تاہم ادیب نے اس "کفر" کا کلمہ پڑھ کر اسلام کا بول بالا کیا۔ مسلمانوں کے ادب کی یہ روایت ہر زمانے میں زندہ رہی ہے۔ بقول علامہ اقبال:

حقیقت ابدی ہے حسینؓ ابن علیؓ
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

یہ ہے ہماری ادبی روایت کی وہ بے چین روح جو صرف اُردو ادب ہی نہیں بلکہ دُنیا کے سارے مسلمانوں کی ساری

زبانوں کے ادب میں روزِ اول ہی سے کارفرما چلی آ رہی ہے اور جو ہمیں آج اکیسویں صدی میں بھی یہی درس دے رہی ہے کہ ادیب کا کردار یہی ہے کہ وہ ہر حال میں کلمۂ حق کا کلمہ پڑھتا رہے اور عشق کی حمد و ثنا کرتا رہے تاکہ اسلام کی سچی اور انقلابی تعلیمات انسانی زندگی کو ظلمات سے نکال کر نور زعلی نور کر سکیں۔

زیتون بانو

دنیا ازل سے بدلتی رہی ہے۔

دنیا کل بھی بدلی تھی۔ آج بھی بدلی ہوئی ہے۔ آنے والی کل میں بھی بدلے گی۔ دنیا کو ثبات نہیں، دنیا تغیر پذیر ہے۔
رحمان بابا نے فرمایا ہے۔

داچه بره ورزز اخیجی بنل بنل نمر دے ۔(یعنی روز نئے ہیں یا یہ مختلف اور جدا سورج ہے)یعنی روز نئے نئے!! یہ سورج جب شام کو ڈوب جاتا ہے تو دوسرے دن یہ وہ سورج نہیں ہوتا جو گزری کل میں نئے تھا اور ڈوب گیا تھا بلکہ یہ ایک نیا سورج ہوتا ہے۔ آج کی سائنس بھی یہ بات ثابت کر چکی ہے کہ سورج کے اندر روزانہ بے شمار کیمیائی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جس سے سورج کی توانائی میں فرق آ رہا ہے۔

ہماری زمین بھی سورج کی بادشاہت یعنی شمسی نظام SOLAR SYSTEM کا ایک سیارہ ہے۔ اور اسی سورج کی بدولت ہم وقت کا تعین کرتے ہیں۔ دن پر وقت کا دارومدار ہے۔ وقت بدلتا ہے۔ دنیا بھی بدلتی رہے گی۔ یہ دن، دن کے بعد رات اور یہ رات کے بعد پھر دن دن رات کا یہ چلن چلتا رہے گا۔

ساتھ ساتھ انسان بھی بدلتا رہے گا۔ جس طرح کل کی دنیا اور آج کی دنیا میں فرق ہے اسی طرح آج کے انسان اور کل کے انسان میں بھی کافی تفاوت موجود ہے۔ کل انسان جیسی زندگی گزار رہا تھا آج کے انسان کے شب و روز کیسے ہیں۔ انسان کی بود و باش، اس کی زندگی کے تقاضے، اس کا دکھ سکھ، اس کے تجربات و جذبات، اس کا احساس جمال، اس کے خود سے اور دوسرے انسانوں سے تعلقات و معاملات اس کی سماجی ذمہ داریاں اس کا فہم اور سوچ وغیرہ۔

فہم اور سوچ کو جب شکل ملی تو ادب پیدا ہوا۔ ادب کو اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی زبان چاہیے تھی اور وہ زبان اسے مل گئی اور زبان کسی بھی کلچر کے وجود کی توسیع ہے۔

ادب زندگی کا آئینہ اور ترجمان ہے۔ ادب ہمیں کسی معاشرے اور کسی قوم کی داخلی اور خارجی صورتیں اور کیفیات اور اس کا ظاہر و باطن دکھاتا ہے۔ ادب وہ قوت ہے جس نے ہمارے معاشرتی ڈھانچے کو سہارا دیا ہے۔ ادب انسان کے دلی احساسات اس کے ظاہر و باطن کی ساری صورت حال، انسان کے ذاتی اور سماجی مسائل اور بحیثیت مجموعی ساری برادری بلکہ بین الاقوامی سوسائٹی کے خد و خال بھی منظر عام پر لاتا ہے۔ ادب کا یہ بھی ایک کمال ہے کہ ہمیں سماجی دھاروں کی تبدیلی اور اس کے تنزل یا

اس کے ارتقاء کے بارے میں خبردار بھی کرتا رہتا ہے اور ان سے پیدا ہونے والے انقلاب کی طرف اشارہ بھی کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ادب کا کردار بڑا مضبوط ہونا چاہیے۔

ادب کا تعلق وقت اور زمانے سے ہے۔ وقت اور زمانے کا انحصار معاشرے کی تہذیبی اور ثقافتی بنت پر ہے۔ یہ ادب کا سیاق وسباق ہوا کرتا ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے کے ادب کے اپنے معنی اور تقاضے ہیں جو اس وقت کے سماجی عمل سے بنتے ہیں۔ ہر دور کا اپنا ایک مخصوص ادب ہوا کرتا ہے۔ ہر زمانہ اپنا ادب پیدا کرتا ہے جس کے اپنے مخصوص خد و خال ہوتے ہیں تب ہی تو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے کلاسیکی، جدید، قدیم جیسے نام ادب کو دیئے ہیں۔

ادبی اصطلاح کے طور پر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیئے جو یہ کہیں کہ ادب کو ہر بدلتی ہوئی دنیا کے مفہوم اور ہر دور کے ثقافتی تقاضوں کے مطابق بدلتے رہنا چاہیے۔

نیا پرانا ہو جاتا ہے مگر کبھی کبھی کسی پرانے ادب پارے کو نئی جہت پرانے کے لیے نیا لبادہ بھی اڑھا دیا جاتا ہے یا اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

بدلتی ہوئی دنیا تاریخی شعور سے عاری نہیں ہو سکتی۔ ادب وہ ہے جو زمانے سے مطابقت رکھتے ہوئے اس وقت کے انسانوں کے ذہنوں کی ترجمانی کرے اور وقت کے عالمی مزاج کے مطابق انقلابی موضوعات بدلتے ہوئے حالات اور ماحول سے لگا کھاتے ہوئے خود کو بدل دے۔ ایسا کرتے ہوئے چاہیے کہ ادب روایتی راہوں سے بغاوت کرے اور نئے تجربات کے طور پر نئی اصطلاحات، تراکیب، نئے رجحانات اور نئے اسلوب کو رواج دے۔

ہر عہد اپنے تجربے کی بنیاد اپنے عہد کے تہذیبی اور معاشرتی ادراک سے حاصل ہونے والے فلسفے پر رکھتا ہے۔ یہ فلسفہ اپنے تمام امکانات اور حدود کا تعین کرتا ہے مگر کسی خاص عہد کا فلسفہ جتنے بھی وسیع امکانات اور حدود کا حامل ہو ان حدود اور امکانات کی ایک حد ضرور ہوتی ہے اور تخلیقی تجربے اور عمل کا سفر ختم کر کے حدود متعین کرتا ہے۔

زمانہ مسلسل بدل رہا ہے، ادب بھی اپنے آپ کو زمانے کے ساتھ Update کرتا رہتا ہے۔ ہمارا یہ دور جو اب جدید دور کہلاتا ہے کل کو آنے والے وقت میں یہ قدیم کہلائے گا۔ کسی زمانے کا ادب وہ ہے جو اس زمانے سے ہم آہنگ ہو اور آنے والے دور کی جھلک اس میں دکھائی دیتی ہو، اس کے لیے ادیب کی بصارت میں بصیرت قوی ہونی چاہیے تاکہ وہ آنے والے کئی زمانوں کے جھروکوں میں نہ صرف جھانک سکے بلکہ اس کی نگاہ اس دور تک پہنچ بھی سکے جو آنے والے زمانے کا دور ہوگا۔

ہاں ایک بات اور......... کہ ادب کے لیے قاری بھی موجود ہوں۔ ہمارے ہاں اب ویسے بھی پڑھنے والوں کا کال ہے۔ اس پر مستزاد یہ الیکٹرانک میڈیا یعنی انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن وغیرہ نے یہ کسر بھی پوری کر دی اور کتاب اٹھانے کی زحمت سے بھی چھٹکارا دلا دیا۔ بہرحال یہ ایک الگ بحث ہے مگر لمحہ فکریہ ضرور ہے کہ ایسی صورت حال میں ہم قاری کے بغیر ادبی تقاضے کیسے نبھائیں۔

آجکل کے اس ترقی یافتہ دور میں جہاں قاری کو گھر پر ہی انٹرنیٹ کے ذریعے سے دنیا بھر کی پسندی کی کتب اور دیگر معلومات پڑھنے کو مل جاتی ہیں تو بازار سے کتب و رسائل خرید کر پڑھنے کے جھنجھٹ میں کیوں پڑے؟ یہ بھی ایک نعمت ہے مگر یہ نعمت بھی

Electronic Gadgets کی محتاج ہے اور جہاں سرے سے بجلی ہی نہ ہو پھر تو سب کچھ بے کار محض ہے۔

اس لئے سائنس چاہے کتنی بھی ترقی کرے، ہمارے حواس پر چاہے کتنی بھی چھائی رہے، میری ذاتی رائے میں کتاب چونکہ ان تکلفات سے آزاد ہے لہذا کتاب کی فوقیت اور قدر و قیمت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ جس طرح آج ہم اس وقت Archives کی اس لائبریری میں بیٹھے ہیں جہاں سے ہزاروں علم کے شائقین مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں اور ہم بڑی امیدوں سے بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار پر باتیں کر رہے ہیں۔

انسان، زمانہ اور ادب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جب انسان ہونگے ان کے جذبات، محسوسات بھی ہونگے۔ ان کی ترجمانی اور اظہار بھی ضرور ہوگا تو پھر ہم کو ماننا پڑے گا کہ زندگی بھر بدلتی دنیا کے ساتھ ادیب اور ادب نے اپنا کردار ادا کیا تھا، ادا کر رہا ہے اور ادا کرتا رہے گا۔

حمزہ شنواری کہہ گئے ہیں

وړم مسقبل ته دماضی روایات
زه دخپل حال دحوصلو سره زم

اپنے حال کے پورے حوصلوں کے ساتھ میں اپنی روایات کو ساتھ لے کر اپنے مستقبل میں داخل ہو رہا ہوں۔

خالدہ حسین

دنیا کب نہیں بدلی ۔۔۔ دنیا بدلتی چلی آئی ہے اور بدلتی چلی جائے گی۔

تبدیلی اصول کائنات ہے۔ جامد و ساکت دنیا کا تصور انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر نہ صرف ناقابل فہم بلکہ ناقابل تصور بھی ہے۔ ہمارے لئے تو نئے سے نئے زمانے کا طلوع ایک جانی مانی حقیقت ہونا چاہیے تھا کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ مالک تعالیٰ وقدیر ہر روز ایک نئی شان اور جاہ وجلال کے ساتھ مصروف کار ہوتا ہے، تمام امور اس کی طرف مسعود کرتے ہیں یعنی زندگی کی اصل، حرکت اور دوسرے معنوں میں ارتقا ہے۔ پھر بھی جب کوئی دانشور یہ کہتا ہے کہ ہم دو بار ایک ہی دریا میں نہیں اتر سکتے تو ہمیں بڑا اچنبھا ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارے عقیدے کے مطابق ہر شے ایک مسلسل سفر میں ہے۔ یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون اور آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز، پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں۔ مگر تبدیلی کے اس ریلے میں کچھ اقدار دائمی حیثیت کی مالک ہیں، ادب ان میں سے ایک ہے۔ گو انسان کی تخلیقی کاوش کو زندگی کے دھارے سے علیحدہ کر کے دیکھنا ممکن نہیں، یہ ایک دوسرے کا آئینہ ہیں، اگر کسی قوم کی تہذیبی و ثقافتی تصویر دیکھنی ہو تو وہ شاہی فرامین پر لکھی گئی تواریخ میں نہیں اس عہد کے تخلیقی مظاہر یعنی شعر و ادب، مصوری، موسیقی اور عمارت گری میں ملے گی۔ عوام کے روحانی اور ذوقی سفر کی داستان، خارجی اور باطنی تجربات کی روح شعر اور افسانے میں زندہ رہتی ہے تاریخ کے صفحات میں نہیں۔

تاریخ واقعات شباں ناوشتہ ماند
افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شد

سو بدلتی دنیا میں تخلیق کار ہمیشہ ہی اہل بست و کشا کے احکام کے بغیر ہی اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں اور ادب کے حوالے سے دیکھئے امیر خسرو، میر، غالب، آتش و مصحفی نظیر و انیس، حالی و داغ اقبال و فیض سب کو اٹھا کر دیکھیں لیں، سب نے روح عصر کو اپنے اندر سمویا اور تخلیقی تجربہ کشید کیا۔ ادب خارجی واقعات کا محرر نہیں۔ وہ واقعات کی تہہ میں خوابیدہ اسرار اور ذوقی تجربات کو اعتبار کے سانچوں میں لازوال کرتا ہے۔ گویا اس کا منصب وقتی اور عارضی کو ابدی و لافانی میں ڈھالنا ہے اس طرح وہ معاشرے کا واحد رکن ہے جو ہر طرح کے موسم اور حالات میں اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسداری پر متمکن ہے۔ ادیب جغرافیائی حدود میں زندہ رہتے ہوئے بھی عالمی اور آفاقی وجود رکھتا ہے، سو بدلتی دنیا ادب کے لیے نہ تو کوئی نئی بات ہے نہ ہی کوئی نیا مسئلہ۔ اصل تشویش ہمیں تبدیلی کا عمل سست پڑنے یا رک جانے پر ہونی چاہیے، جیسے خون کی گردش میں کمی اور سستی آ جائے تو فاسد مادے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ معاشرے میں تبدیلی کا عمل رک جائے تو پورا معاشرتی نظام زہر آلود ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

یہاں مجھے جیمز سالڈون کی یہ بات یاد آتی ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری خواہش کے برعکس ہر شے مسلسل تبدیلی کی زد میں ہے اور ایک قوم اور فرد کی حیثیت سے ہمارے کردار کی پختگی کا پیمانہ یہی ہے کہ ہم کس حد تک ان تبدیلیوں کو قبول کرنے اور ان کے صحت مندانہ استعمال کے لیے تیار ہیں۔ سو تبدیلیوں کو قبول کرنا اور انہیں صحت مند راستے پر استعمال کرنا اگر قوم کے ہر فرد کا مسئلہ ہے تو تخلیق کار جو عام آدمی کی نسبت کہیں زیادہ حساس ہوتا ہے اس ذمہ داری سے کس طرح عاری رہ سکتا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ تبدیلیاں محسوس کرتا ہے اور ذاتی اور عمومی حوالوں سے اس کی قدر و قیمت بھی متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اردو زبان و ادب کی نشو و نما کا زمانہ برصغیر میں مغل اقتدار کے زوال اور ہند مغل تہذیب کے عروج کے متوازی چلتا نظر آتا ہے۔ اسی تہذیب و ثقافت کا نچوڑ غالب کی شعری جینیئس (Genious) ہے جس نے ایک نئے دور کی آہٹ سنی اور جان لیا کہ وقت کا بدلنا مقرر ہو چکا ہے۔ ماضی بہت پرشکوہ اور دل آویز سہی مگر اسے تازہ ہوا کی ضرورت ہے ہمیں ہر صورت حال میں زندہ رہنا اور مستقبل کے ساتھ رشتہ جوڑنا ہے۔ سرسید نے برصغیر کی نو آبادیاتی حیثیت کو قبول کرتے ہوئے اپنی قوم کے لیے ایک نئے لائحہ عمل کی تشکیل کی اور پہلی دفعہ شعوری طور پر شعر و ادب کو قومی مقاصد کا پابند بنانے کی رسم چل نکلی۔ اس وقت سے ادیب کو ایک معلم کا کردار تفویض کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ تو کیا اس سے پہلے ادب اپنے قاری کی تہذیب نہ کرتا تھا۔ کیا میر و غالب اور مصحفی و آتش اور نظیر و انیس نے ہماری تاریخ اور اپنے وقتوں کے معاشرے کو امتیاز و وقار نہیں بخشا۔ کیا ان کے باعث ہم تہذیبی طور پر زیادہ صاحب ثروت نہیں ہوئے۔ انہوں نے بے جانے بوجھے اپنے معاشرے کی نمائندگی کی اور خارجی واقعات کی تہوں میں چھپے حقائق کو بے نقاب کیا۔ جینوئن لکھنے والا کبھی احکام کی پابندی نہیں کرتا وہ معاشرے کے تمام افراد سے بڑھ کر ایک منفرد تشخص رکھتا ہے۔ وہ سیاستدان، ماہر تعلیم اور سائنسدان سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ وہ اپنی تجربہ گاہ خود آپ ہے۔ اپنے نہایت کڑے اصولوں کا پابند، خواہ وہ ضبط تحریر میں لائے جائیں یا نہیں، وہ کسی صورت میں بھی اپنی اس ذمہ داری پر حرف نہیں آنے دیتا جو انسانی وجود کے اسرار منکشف کرنے کے سلسلے میں اس نے اختیار کی ہے۔ معاشرہ تو اپنے آپ کو پائیدار فرض کر لیتا ہے مگر فن کار یہ جانتا ہے اور دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے کہ دنیا میں کوئی شے بھی مستقل اور پائیدار نہیں، وہ بنی بنائی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کی تہہ میں چھپے ہوئے بہت سے سوالات کو دریافت کرتا ہے۔ اسی لیے ایسے لوگوں کو جیتے جی نہایت ناپسندیدہ اور بے توقیر اور موت کے بعد اپنی ملکیت سمجھ لیا جاتا ہے۔

برصغیر میں نو آبادیاتی دور مغرب کے براہ راست اثرات لیکر آیا جو ہمہ گیر ثابت ہوئے۔ اگر انیسویں صدی کو سائنسی انکشافات کی صدی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ انکشافات و ایجادات انسانی معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوئے، غرض یہ صدی انسان کے لیے امید اور ایک بہتر مستقبل کا پیغام لیکر آئی مگر بیسویں صدی سے ان تمام سائنسی فیوض و برکات نے غیر فلاحی اور تباہ کن راستے اختیار کرنے شروع کر دیے۔ نو آبادیاتی کلچر نے جوع الارض کو جنم دیا، عالمی جنگوں نے اقوام عالم میں نسل پرستی، قتل و غارت اور تعصب و تشدد کے دہانے کھول دیئے۔ اسلحے کی دوڑ شروع ہوئی۔ سیاسی بیداری کا دور بھی شروع ہوا۔ آزادی کی تحریکیں چلیں اور کامیاب ہوئیں زمانے کے انداز بدلنے لگے۔ محکوم اقوام عالم نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں مگر ساتھ ہی ساتھ طاقت کی پرستش بھی شروع ہوئی۔ وہ دور جو مثبت ترقی اور آس امید کا دور تھا بالآخر طاقت اور اسلحے کے دیوتا کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ بیسویں صدی کے آخر ہوتے ہوتے دیوانگی کی حد تک پہنچی تیز رفتاری، شور، غوغا

اور تجارتی معاشرہ دنیا پر مسلط ہو گیا۔

اس صدی نے جاتے جاتے ہمیں دولت اور طاقت کے خدا تحفۃً دیئے ہیں۔ شدت، انتہا پسندی کا دور دورہ ہے، اعتدال اور توازن اب جہالت کی علامت ٹھہرے ہیں۔ انتہائی شدتوں نے ہمارے حواس کند کر ڈالے ہیں۔ ایڈورڈ سعید کے خیال کے مطابق نو آبادیاتی اقوام آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے لازمی طور پر اپنی روایت اور تاریخ کی طرف بڑی سختی سے چمٹی ہیں اور ان کو از سر نو دریافت کرنے میں انہیں انتہا پسند ہونا پڑتا ہے۔ ان کا اصل مسئلہ عصری حالات کے حوالے سے توازن برقرار رکھنا ہے۔

آج آپ ادب سے کیا توقعات وابستہ کرتے ہیں ادب زندگی اور معاشرے کا معلم نہیں اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ سوالات اٹھاتا ہے۔ جواب تلاش کرنا اس کا فرض منصبی نہیں اور کون نہیں جانتا کہ سوالات اٹھانا ہی دراصل فلاح کی جانب پہلا قدم ہے اگر آج کا ادب یہ بتا رہا ہے کہ ہم سماعت ماؤف کر دینے والے ماس میڈیا مبتذل تفریح، شور و غل، اشتہار بازی اور صارفی معاشرے میں سانس لے رہے ہیں تو یہ اس کے وجود کا بہت بڑا جواز ہے۔ طاقت، دولت، رفتار سکہ رائج الوقت ہیں۔ دنیا کے فاصلے سمٹتے مگر انسان اور انسان کے درمیان بڑھتے جا رہے ہیں۔ خاندان ٹوٹ رہے ہیں۔ انسانی رشتے بے معنی ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک تجارتی معاشرے کا ثمر ہے جس میں ہر شے پیسے کی ترازو میں تلتی ہے۔ انسان کی محبت، مروت، احساس، اس کا ذوق جمال یہاں تک کہ اس کی تخلیقی کاوش بھی، انسانی شرف، اس کا وقار اور توقیر، سب بکاؤ جنس ہے۔ سامری نے سونے کا بچھڑا بیچ چوراہے لا دھرا ہے۔ پاکستان، جہاں چند فی صد لوگوں کو پینے کا صاف پانی، پیٹ بھر خوراک، علاج و معالجے کی سہولیات اور سر چھپانے کو چھت میسر ہے، اس کے ایک محدود طبقے میں دولت کی چکا چوند پورے معاشرے کو دیوانہ کر دینے کو بہت ہے۔ دولت ایک نعمت ہے مگر شدید احساس کمتری کے نتیجے میں اس کا خود غرضانہ استعمال پوری قوم کو ذہنی مریض بنانے کو بہت ہے۔ اس چوبادوز نے آسائشوں کو اعلیٰ و ارفع جذبات اور ماورائی نصب العین کا متبادل بنا دیا ہے۔ اشیا کی محبت نے انسان کی محبت کو دھندلا دیا ہے اور چیزوں کی ہوس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تسکین کا کوئی لمحہ عطا کرنے سے قاصر ہیں۔ کثرت کی ہوس ہمیں ہلاکت کے قریب لے جاتی ہے۔

جذبوں کا نصب العین تسکین خاطر ہوتا ہے، خواہ وہ آسودہ ہوں یا نا آسودہ ہی رہ جائیں، دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی طرح تسکین کے لمحات ضرور فراہم کرتے ہیں مگر بے جان اشیا سے لطف اندوز ہونے کے لیے انسان فرصت کے لمحات کا متلاشی ہی رہتا ہے جو اسے کبھی نہیں ملتے۔ اس لیے کہ انہیں مزید اشیاء کی ہوس نگل لیتی ہے۔

ذرا عصر حاضر کے دوسرے خدا، طاقت کو دیکھیے۔ طاقت ہر قیمت پر، طاقت، اسلحہ، فوج، کیمیائی ہتھیار، ٹیکنالوجی کمزور تو طاقت کے خواب دیکھتا ہے کہ ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے۔ اسے جہد للبقاء میں زندہ رہنا ہے مگر طاقت ور طاقت کی پوجا کیوں کرتا ہے۔ مزید طاقتور بننے کے لیے۔ طاقت کا اپنا ایک نشہ ہے کمزور کو کچلنے کے لیے کسی دلیل، کسی منطق کی ضرورت نہیں۔ طاقت بذات خود سب سے بڑی دلیل اور منطق ہے۔ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر اس جنون کی کارفرمائی ہر ایک کے سامنے ہے۔ ہمارے ہاں کے ذاتی عقوبت اور بندی خانوں سے لیکر تورا بورا، ابو غریب، گوانتاناموبے، موصل، خوں آشام بغداد، شہر الف لیلیٰ، گجرات، گھروں، عبادت گاہوں، شاہراہوں کے اڑتے پرخچے، خون پسینے سے اٹھائی گئی فلاحی تنصیبات کے

ملے۔ یہ میری آپ کی دنیا کا منظر نامہ ہے کسی شیز وفرنیک کا نا نٹ میر نہیں۔

ایسے میں ادب کا کردار کیا ہے۔ میں پھر کہوں گی کہ آج بھی ادب کا کردار وہی ہے جو صدیوں پہلے تھا اور ہمیں اس کے نام ہدایت نامہ جاری کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے۔ ہم بھلی کے جائے کو تیرنا سکھانے والے کون ہوتے ہیں کیونکہ بنی نوع انسان کی پوری سرگرمیوں میں تخلیقی فنون ہی وہ مظہر ہیں جو ہمیشہ از وال اور ابدی اقدار کے حامل رہے ہیں، وہ اعلیٰ اقدار جو ہر حال، ہر وقت اور ہر صورت میں تخلیق کا سرچشمہ رہی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ امید وبیم تخلیقی جوہر کے یہی دو محرکات ہیں۔ امید انسان اور کائنات اور مجموعی طور پر اس زندگی کے ایک مثبت مظہر ہونے کی اور اسے ایسا دیکھنے اور دکھانے اور ثابت کرنے کی خواہش جس کی لاتعداد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس میں معاشرے کا اجتماعی نقطہ نظر بھی ہے اور اس فرد کے نجی رشتے بھی۔ بقول سارتر "ادب ایک اجتماعی مظہر ہی مگر اس کی تخلیق بہر حال ایک نجی اور ذاتی عمل ہے۔" لیکن سچے ادب میں ذاتی تجربہ اجتماعی تجربہ بن جاتا ہے جیسا کہ محمود درویش نے کہا ہے کہ "میں سوائے اپنے کی ذات کا اظہار نہیں کرتا مگر یہ ذات بھی اجتماعی یادوں کا مجموعہ ہے۔"

سو لکھنے والے کے دل میں امید کی ایک لو جلتی رہتی ہے جو آگ اور خون کے سمندر اور دھماکوں کی رستخیز اور خودکش تباہ کاریوں میں بھی زندگی کے نعمت عظمیٰ اور رحمت خداوندی ہونے کا یقین زندہ رکھتی ہے۔ وہ ہزار تعصاب کے درمیان رشتوں کے لازوال ہونے کی آرزو اور بنی نوع انسان کی وحدت کی آس لگائے رکھتی ہے۔ وہی ہمیں لکھنے کا حوصلہ دیتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ خوف بھی اس امید کا ہمزاد ہے۔ کیا ہم ایسا کر سکیں گے؟۔ امید اور خوف کا قدیم جدلیاتی رشتہ ہے۔ سو انسانی تحقیر و تذلیل اور بربریت کے اس منظر نامے میں ہم اردو دھتی رائے کے ہم زبان ہو کر یہی پوچھ سکتے ہیں کیا ہم اپنے خواب دیکھنے کے حق سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ کیا ہم بھی دوبارہ حسن کا تصور کر سکیں گے۔ ادیب نہ تو واعظ ہے، نہ ہی سوشل ورکر، نہ ہی سیاسی کارکن۔ وہ صحافت اور صحافتی ادب سے بھی ممتاز ہے، مگر اس کا اثر سب سے زیادہ وسیع اور دیرپا ہے کہ وہ براہ راست لوگوں کے دلوں سے مخاطب ہوتا ہے ان کی چھوٹی بڑی خوشیوں اور غموں، امیدوں اور آرزوں کا ہمراز اور موتی پرندوں اور ہواؤں اور خوشبوؤں کا اداشناس ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ صرف خارجی دنیا ہی کی تسخیر انسان کا واحد نصب العین نہیں۔ اسے تو اپنے باطن کے لاحد ود صحراؤں کو عبور کرنا ہے۔ پس فن کا بنیادی منصب اس تاریکی کو منور کرنا اور باطن کے اس وسیع جنگل میں راستے بناتا ہے تا کہ زندگی کے جھمیلوں میں ہم کہیں یہ نہ بھول بیٹھیں کہ ہمارا اصل مقصد اس دنیا کو ایک بہتر انسانی مسکن بنانا ہے۔

محمود درویش کے الفاظ میں "ہمارے دلوں میں ایک فطری زندگی کی آرزو ہے۔ زندگی جس میں ہم نہ تو ہیرو ہوں نہ ہی مظلوم"۔

سو تخلیق کار کا منصب جو دل پر گزرتی ہے رقم کرتے رہنا ہے اگر مفلسی، مسائل اور شکست خوردگی کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتا ہے:

بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں
فرمانروائے کشور ہندوستان ہے

تو ہم آپ اس پر نکتہ چینی کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ ہاں سب دانشوروں کو سر جوڑ کے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ سایہ دیوار یار کیا ہے؟

مظہر الحق صدیقی

اگر اس پہلودار موضوع پہ گہرائی اور کئی ایک اطراف سے نظر ڈالی جائے تو یہ ایک بہت ہی تجلک موضوع بن جاتا ہے کہ اکیسویں صدی کی اس بدلتی دنیا میں ادب کا کردار کیا بنتا ہے، جس دنیا میں ٹیکنالوجی اور کمیونیکیشن زوروں پہ ہو، انسانی تعلقات الجھی ہوئی گتھی بن کر رہ گئے ہوں اور پھر یہ مختلف تہذیبوں ،نظریات ،حقائق اور تصورات کا تانا بانا ، الجھن کا شکار ہو کر ٹکراؤ کی سی صورت اختیار کیئے ہوئے ہوں تو ظاہر ہے کہ ان حالات میں ادب سے متعلق رائے دینا کھونٹے پہ چڑھنے کے مترادف ہے۔ چلئے پھر بھی بقول ایک سندھی کہاوت کے جو حال یاراں ہے، وہ دل یاراں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

یہ تو طے شدہ بات ہے کہ جتنی تیزی اور وسعت سے وقت گذرتا ہے ،اتنی ہی رفتار اور وسعت سے زندگی سے متعلق حقائق بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں ،جن میں ادب اور ادب کا کردار بھی آ جاتا ہے یا یہ کہہ لیجئے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ادب کے کردار کا تعین بھی ہوتا چلا آ رہا ہے، جس میں خود ادب کی تعریف (Defination) بھی آ جاتی ہے۔

ہمارے ہاں ماضی قریب میں ادب کی تعریف (Defination) سے منسلک کافی مباحث چلے، جو آگے بڑھ کر اچھے خاصے جھگڑوں پہ منتج ہوئے، جو آج قاری کے لئے اپنے اندر کافی دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔

ایک طرف "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بحث اور دوسری طرف اسی بات سے منسلک "خارجی ادب" اور "داخلی ادب" کا شاخسانہ بڑھ کر یہاں تک پہنچا کہ اردو زبان میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ چوٹی کے ادیبوں نے اور تو اور قرۃ العین حیدر اور راجندر سنگھ بیدی جیسے نادر روزگار ادباء پہ یہ فتوٰی صادر کر دیا گیا کہ سوشلسٹ انقلاب آنے کے بعد ان کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ اسی طرح سندھی ادب کے معروف شاعر شیخ ایاز اور ان کے ساتھیوں پہ اسلام دشمنی اور پاکستان دشمنی کے فتوے صادر ہوئے مگر وقت کی رفتار ہر چیز کو کھا جاتی ہے۔ اب نہ قرۃ العین حیدر اور سرگواسی راجندر سنگھ بیدی انقلاب دشمن رہے ہیں اور نہ ہی مرحوم شیخ ایاز اسلام دشمن رہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ادب کا کردار بھی بدل چکا۔ مزید برآں یہ کہ مستقبل میں کیا رکھا ہے، وہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

بہر حال زمانہ حال کی اس بدلتی دنیا کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں پہلے تو "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی اصطلاحات کی تھوڑی بہت چھان بین کرنی پڑے گی۔ "ادب برائے ادب" والوں کا خیال تھا کہ اگر ادب

میں صرف کسان یا مزدور کے خون اور پسینے سے متعلق نعرے بازی رہ جائے یا پھر آنے والے انقلاب کا خواب، تو یہ کوئی ادب تو نہ ہوا کیا ادب تو شاندار آرٹ کا ایک حصہ ہے جو سوشلزم کے نظریے کے وجود میں آنے سے پہلے بھی بڑے پیمانے پہ نہ صرف تخلیق ہوتا رہا ہے بلکہ جو قاری یا سامع کی جمالیاتی حس کو بگڑے ہوئے تھا اور فکری سطح پہ بھی ایک سے ایک روشنی کا دریچہ کھولتا چلا آ رہا تھا، تو اس صورت میں مزدور اور کسان کے پسینے، خون اور پھر انقلاب کے خواب میں فنون لطیفہ کے ان عظیم الشان مظاہر کو قصیدہ کر کے مشینی انداز اور یکسانیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح "ادب برائے ادب" کے حامیوں نے "ادب برائے زندگی" کے حامیوں کو نہ صرف ماننے سے انکار کیا بلکہ ایک حد تک شجر ممنوعہ بنانے کی کوشش میں جتے ہوئے تھے۔ دوسری طرف "ادب برائے زندگی" کے حامیوں کا خیال تھا کہ "ادب برائے ادب" محض خیالی ہے اور گل و بلبل کی داستان ہے، جس سے زندگی کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اس طرح کا ادب اس سے آگے کچھ نہیں۔ جب ادب محض ذہنی عیاشی کا ذریعہ ہی بن کر رہ جائے تو وہ ادب کس کام کا، جبکہ ادب محض ہوا میں اڑنے کا کام ہو تو ادب کی کوئی Utility نہیں بچتی، اس وجہ سے "ادب برائے ادب" قاری کا وقت خراب کرنے کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں۔

مگر وقت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس بدلتی دنیا میں مذکورہ اصطلاحات کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کی بجائے اب یہ ایک ہی سکے کے دو اطراف نظر آتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جس طرح مزدور اور کسان کا خون و پسینہ زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے، اسی طرح گل و بلبل بھی تو زندگی کا ہی حصہ ہے۔ جہاں فیض احمد فیض کا مزدور اور شیخ ایاز کا کسان قاری کی حس جمال کو لپیٹ میں لے لیتا ہے، وہیں گل و بلبل سے متعلق تخلیق بھی قاری کو زندگی کے متعلق سوچنے پہ مجبور کر دیتی ہے کہ یہ بھی زندگی کا ایک رخ ہے۔

اب ذرہ "داخلی ادب" اور "خارجی ادب" کا بھی تذکرہ ہو جائے۔ ہمارے ہاں "داخلی ادب" کے متعلق کہا گیا کہ اس طرح کا ادب تو صرف ادیب کی ذات کے گرد گھومتا ہے اور اس ادب کا باقی زندگی اور زندگی کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں رہتا، صرف اپنا راگ آلاپنے سے بھلا کیا ملے گا، اسی طرح "خارجی ادب" کے متعلق کہا گیا ہے کہ جس ادب میں اپنے خیالات اور اپنے احساسات نہ ہوں، اپنا دکھ یا سکھ شریک کار نہ ہو تو اس طرح کا ادب تو صرف محض نعرے بازی رہ جاتی ہے، جو کسی قسم کی درد سے نا آشنا نعرے بازی ہے۔ اگر اب اس بدلتی دنیا میں یا یہ کہہ لیجئے کہ اکیسویں صدی میں ان اصطلاحات کا مختلف اطراف سے جائزہ لیا جائے تو بات ہی کچھ اور نظر آتی ہے اور وہ یہ نظر آتی ہے کہ یہ اصطلاحات بھی ادبی حقیقت کے ایک ہی سکے کے دو اطراف ہیں، جن کو ایک دوسرے سے الگ کر کے پرکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس الجھن کو ختم کرنے کے لئے ہمیں عمرانیات، علم الاذہان (Neurology) اور علم نفسیات میں جھانکنا پڑے گا۔ عمرانیات اور نفسیات کے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ انسان کی داخلیت اس کے خارجی حالات کا عکس ہے، جب کہ اسی طرح انسان کے خارجی حالات اس کے داخل کی پرچھائیں ہیں، دوسرے الفاظ میں انسان کا خارج اور داخل ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، پھر اگر علم الاذہان کی ٹیکنالوجی پہ آیا جائے تو بات اور صاف ہو جاتی ہے مثلاً آپ کے سامنے کوئی رنگدار پرندہ چہچہا رہا ہے اور آپ اس پرندے کے خوبصورت رنگوں کو دیکھ کر اور سریلی چہچہاہٹ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، اس دوران اگر آپ کے دماغ اور آنکھوں کے درمیان موجود الیکٹریفائیڈ نروس سسٹم کو

کاٹ دیا جائے تو آپ پرندے کے خوبصورت رنگ دیکھنے سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی طرح بعد میں اگر آپ کے ذہن اور کانوں کے درمیان موجود نروس سسٹم کاٹ دیا جائے تو آپ پرندے کی چہچہاہٹ سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ اس طرح پرندہ آپ کے لئے حقیقت نہیں رہے گا اور وہ غیر حقیقت میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی نے خوب کہا ہے کہ آپ کمرے کے اندر نہیں رہتے، بلکہ کمرہ آپ کے اندر رہتا ہے۔ اس طرح وہ پرندہ آپ کے لئے تو کوئی حقیقت نہیں رہے گا، مگر بیک وقت اپنے طور پہ تو وہ پرندہ حقیقت ہی بنا رہے گا وہ پرندہ اس وقت عدم وجود میں نہیں چلا جائے گا تو اسی طرح "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کا ایک دوسرے کے لئے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان دونوں کو الگ کر کے بحث تمحیص کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

مذکورہ چاروں اصطلاحات کی اصل حقیقت جاننے کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر پھر کن الفاظ میں ادب کی تعریف (Defination) بیان کی جائے، پھر ہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں ادب کا کردار کیا بنتا ہے۔

1953ء میں اس دور کے جدید ادبی رویوں اور خیالات کے حامل چند ایک نوجوان ادباء اور شعراء نے اپنے کمزور حالات کے باوجود مل کر جارج پلمپٹن (George Pilimpton) کی زیر ادارت Paris Review نامی سہ ماہی ادبی مخزن نکالا۔ چونکہ یہ نوجوان اس وقت کی دنیائے ادب کے مشہور و معروف ادباء اور شعراء کی تحریروں کا معاوضہ ادا نہیں کر سکتے تھے، پھر یہ کہ بڑے ناموں کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ قوی امکانات موجود تھے کہ آگے چل کر یہ مخزن بند ہو جائے گا، یہ باتیں ذہن میں رکھ کر یہ تجویز نکالی گئی کہ بڑے ادباء اور شعراء کی تحریریں خریدنے کی بجائے ان سے غیر معمولی انٹرویو لئے جائیں کہ ان انٹرویوز کی ایک تو ادائیگی نہیں کرنی پڑے گی دوسرا یہ کہ یہ بڑے نام Paris Review کے ٹائٹل کی زینت بنیں گے تو مخزن بھی چل پڑے گا۔ اس طرح کم خرچ بالانشین کے مقولے پہ عمل کرتے ہوئے اپنے دور کے ان ذہین نوجوانوں نے پہلا انٹرویو انگریزی ادب کے بہت بڑے ناولسٹ ای ایم فاسٹر سے لیا۔ اس طرح مخزن کا سلسلہ چل پڑا۔

ان لمبے، غیر معمولی، غیر رسمی اور آزادانہ انٹرویوز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے مشہور و معروف اشاعتی ادارے Penguin Books والوں نے ان انٹرویوز کے حقوق حاصل کر کے Writers at work کے عنوان سے کتاب چھاپی ہے، جس کی سات جلدیں پاکستان کی کتابوں کی مارکیٹ میں آ چکی ہیں، باقی ایک دو جلدیں اس وجہ سے نہیں پائی جاتیں کہ ان میں بین الاقوامی ادب کے چند ایک ایسے انٹرویوز شامل ہیں، جن کو پاکستان میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

مختلف زبانوں کے ادباء اور شعراء کے ان انٹرویوز میں گھوم پھر کر مختلف الفاظ میں ایک سوال ضرور پوچھا گیا ہے "ادب ہے کیا چیز؟" اور پھر حیرت انگیز طور پہ ایک ہی جواب مختلف الفاظ میں دیا گیا ہے، ان جوابات کا اگر ہم نچوڑ نکالیں گے تو ادب کی تعریف کچھ اس طرح بنتی ہے:

"ادب کا فن پارہ اس کو کہا جا سکتا ہے، جس میں لکھنے والا زندگی کو اس طرح Explore کرے کہ وہ تحریر ایک طرف قاری کی حس جمال (Aesthetic sense) کو جا کر چھو جائے تو دوسری طرف قاری کے ذہن میں زندگی سے متعلق ایک یا زیادہ مسائل کے بارے میں ایک یا زیادہ سوالات کھڑے کرے، ان مسائل کا حل قاری پہ چھوڑا جائے کہ وہ اپنے مخصوص پس

منظر میں رو نُران کے بارے میں سوچے۔"

میرے خیال میں اس بدلتی دنیا میں ادب کی اس سے بڑھ کر کوئی مناسب اور وقت کا ساتھ دینے والی تعریف (Defination) نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی اپنا اپنا خیال ہے، جو جس کو بھائے کسی کے خیالات پہ قدغن لگائی نہیں جا سکتی۔

اب آیا جائے ہمارے ادب کے ایک دوسرے پہلو پہ۔ اس دور کے انتہائی مشہور و معروف روشن صحافی اور افسانہ نگار، رشیدہ رو کا پوشنسکی نے وسطی ایشیا کا دورہ کرتے ہوئے تاجکستان میں فارسی بولنے والی ایک نوجوان ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا کہ "آپ تاجک لوگوں اور ازبک لوگوں میں کیا فرق ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی چلاتے ہوئے بڑے فخر سے کہا کہ "ازبک بیوپاری ہیں اور ہم تاجک لوگ شاعر ہیں۔ ہم لوگوں میں یہی فرق ہے" فارسی زبان کی ایک عام قاری کا بڑے فخر سے کہا ہوا یہ جملہ اپنے اندر ہمارے لیے بہت بڑے معنی رکھتا ہے۔

اگر ہم مغربی ادب اور جنوبی ایشیا کی دیسی زبانوں میں تخلیق ہونے والے ادب کا موازنہ کریں گے تو ایک فرق واضح طور پہ نظر آئے گا۔ گو کہ مغربی ادب میں معیار چاہے مقدار کے حساب سے شاعری کی کوئی کمی نہیں پائی جاتی، مگر اس کے باوجود ان کے ہاں نثری روایات مضبوط نظر آتی ہیں، جن پہ موجودہ مغربی ادب کی بنیاد کھڑی کر دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ دور کے مغربی ادب میں لکھی جانے والی سنجیدہ شاعری نثر کے مقابلے میں خال خال نظر آتی ہے، پھر یہ مغرب کا قاری بھی اس شاعری میں اتنی دلچسپی نہیں لیتا۔ لے دے کر اب وہاں جو زیادہ تر شاعری تخلیق ہوتی ہے، وہ کسی نہ کسی گانے کی دھن کو مد نظر رکھ کر تخلیق کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں شاعری کی روایات کا اثر بڑی شدت سے پایا جاتا ہے یعنی کہ ہمارے موجودہ ادب کی بنیاد شاعری پہ کھڑی نظر آتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ قرۃ العین حیدر جیسی اعلیٰ پائے کی ناول نگار، افسانہ نگار اور دانشور کو یہ کہنا پڑ گیا کہ مغربی ادب کی روایت تو نثر ہے، مگر مغربی ادب کے برعکس پورے انڈو پاک کے ادب کی سب جڑیں جا کر شاعری میں ملتی ہیں۔ یہ رائے کسی شاعر کی نہیں بلکہ انڈو پاک کی بہت بڑی نثر نگار کی ہی ہے۔ میرے خیال میں اگر اردو ادب کا مختصر جائزہ لیا جائے تو اردو ادب کی یہ روایت، دکنی سے لے کر مرزا غالب تک اور میر تقی میر سے لے کر فیض احمد فیض تک کئی ایک رنگوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح سندھی ادب میں یہ روایت بھاگو بھان کے تہلکہ انگیز Epic سے لے کر شاہ لطیف کی شاعری تک اور سچل سرمست سے لے کر شیخ ایاز تک کئی ایک بھاری بھرکم شعراء کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ یہی حال پنجابی ادب، پشتو ادب اور بلوچی ادب کا ہے، جن زبانوں کی شاعری میں ایک سے ایک بڑا نام پایا جاتا ہے۔ ہماری ان زبانوں میں نثر کی روایت تو بہت دیر سے آئی اور اردو ادب میں نثر کو جلا دینے والوں میں منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، راجندر سنگھ بیدی، محمد طفیل وغیرہ اور بذات خود قرۃ العین حیدر کے نام آ جاتے ہیں۔ اسی طرح سندھی ادب میں مرزا قلیچ بیگ، بھیرومل مہر چند، امرلعل ہنگورانی، آسانند مامتورا، گنگا رام سمراٹ، جمال ابڑو اور نسیم کھرل وغیرہ آ جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم جب اپنی نثر پہ نظر ڈالتے ہوئے تنقید تشخیص کرتے ہیں تو وہ شاعری کی نکتہ نگاہ سے کرتے ہیں تو یہ طے شدہ بات ہے کہ مغربی ادب کے برعکس ہماری نثر کی کرنیں شاعری سے پھوٹی ہیں۔ ہماری سوچ قدرے شاعرانہ ہے، اسی وجہ سے اکیسویں صدی کی بدلی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار سے متعلق بات کرنے کے لئے ہمیں اس حقیقت کو مد نظر رکھنا پڑے گا، کیوں کہ روایت کو ہم جدید ادب سے اس طرح الگ نہیں کر سکتے، جس طرح دریا کے

بہتے ہوئے پانی کو بیچ میں سے لاٹھی مار کر الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اس اکیسویں صدی کے ٹیکنالوجی کے دور میں رہتے ہوئے بھی ہمارے ہاں ایک مضحکہ خیز جملہ بار بار سننے اور پڑھنے کو ملتا ہے کہ یہ فلاں ادب علاقائی ہے اور فلاں ادب قومی ہے۔ پتہ نہیں کس نے، کیوں اور کب یہ بات اڑا دی، جو میری طرح کے قاری کو آج تک سمجھ میں نہیں آ رہی۔ انگریزی ادب میں استادانہ حیثیت رکھنے والے امریکی ناول نگار ولیم فاکنر سے جب پوچھا گیا کہ جناب آپ محض اپنے علاقے کے پس منظر میں رہ کیوں لکھتے ہیں؟ کیا آپ کو علاقائی رائٹر نہ کہا جائے؟ اس پہ انہوں نے صاف صاف جواب دیتے ہوئے کہہ دیا کہ، کیوں نہیں، میں ایک علاقائی ادیب ہوں۔ پوری دنیا کے سب کے سب ادیب علاقائی ہی ہوتے ہیں۔ کوئی بھی ادیب اپنے علاقے کے پس منظر میں رہ کر ہی لکھ سکتا ہے۔ کوئی ادیب اپنے پس منظر کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

میرے خیال میں اس مسئلہ پہ ولیم فاکنر کی اس رائے سے زیادہ کوئی مضبوط اور حقیقت پسندانہ رائے ہو ہی نہیں سکتی، موجودہ دور کے شاندار ادیبوں کو ہی نظر میں رکھ لیں تو آپ کو بین اوکری (Ben Okri) اور جے ایم کوئٹزی (J.M Coetzee) کی تحریروں میں بالترتیب نائجیریا اور ساؤتھ افریقہ کا پس منظر نظر آئے گا۔ پابلو نیرودا کی شاعری اور گارشیا مارکئز کی نثری تحریروں میں بالترتیب چلی اور کولمبیا کا پس منظر ملے گا۔ گاؤ شن جیان Gao Xinjian تو اپنی جوانی میں ہی ثقافتی انقلاب کے دوران چین چھوڑ چکا تھا۔ مگر یہ نوبیل انعام یافتہ ڈرامہ نگار اور ناول نگار اب تک اپنے علاقے کی پس منظر میں رہ کر لکھتا چلا جا رہا ہے۔ چلئے یہ تو ہوئیں دور کی باتیں۔ ہم اپنے علاقوں پہ نظر ڈالیں تو شاہ لطیف کو سندھ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سائیں بلھے شاہ کو پنجاب سے کاٹ کر پھینکا نہیں جا سکتا اور مرزا غالب کو دہلی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مقامیت یا علاقائیت تو ہر بڑے شاعر اور ادیب میں پائی جاتی ہے۔ گو کہ ان شعرائے کرام کو زمان کے خیال سے آفاقی شعراء کہا جاتا ہے، مگر مکان کے لحاظ سے ان شعراء کرام کی آفاقیت کی بنیاد تو علاقائی ہی ہے۔ زمین سے کٹ کر ہوا میں اڑ کر بھلا کون لکھ سکتا ہے۔ پھر آپ جدید نثری ادب پہ آئیں تو قرۃ العین حیدر کو لکھنو سے الگ نہیں کر سکتے۔ چاہے وہ بنگال کے پس منظر میں ہی آخر شب کے ہم سفر جیسا ناول لکھتی پھریں۔ اس ناول میں لکھنویت صاف صاف نظر آتی ہے۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کو پنجاب سے الگ کر کے پڑھنا تو عجیب و غریب مضحکہ خیز حرکت لگتی ہے۔ میں تو ہوا ایک Educationist، مگر کل کلاں میرا اول ادب لکھنے کو آتا ہے، وہ چاہے انگریزی ہو، اردو میں ہو یا سندھی میں، مگر اس میں سیوہن شریف ضرور نظر آئے گا۔ یہ جو مقامیت یا علاقائیت کو نظر انداز کر کے قومی ادب کا الگ سے راگ آلاپا جاتا ہے، یہ راگ اس دور میں نہیں چل سکتا۔ کیا اردو زبان کی کوئی مقامیت نہیں؟ اگر کوئی اردو کو مقامیت سے کاٹ دیتا ہے تو پھر وہ ہوا میں اڑتا ہوا بلکہ یہ تو پھر خود اردو کی تذلیل ہوگی کہ کوئی زبان خلا میں نہیں بستی۔ دنیا کی ہر زبان کسی نہ کسی علاقے سے ہی جنم لیتی ہے۔ زمین سے کٹ کر کسی زبان میں بھی، کوئی بھی ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ خود آفاقیت بھی تو ایک ایسے درخت میں اُگے ہوئے پھولوں کے مانند ہے، جس درخت کی جڑیں زمین کے ہی کسی علاقے میں پائی جاتی ہے۔ حاصل مطلب یہ ہوا کہ اکیسویں صدی میں رہ کر اس واضح حقیقت کو کسی بھی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اس دور کے معروف چیک ادیب میلان کندیرا Milan Kundera حال مقیم فرانس نے آج کے دور کے جبر پہ چوٹ کرتے ہوئے بڑی پتے کی بات لکھی ہے، جو میلان کندیرا کا ہی خاصہ بنتی ہے، انہوں نے لکھا ہے:

"پہلے نظریات پائے جاتے تھے، بعد میں نظریات کی جگہ زمینی حقائق نے لے لی، مگر اس دور میں زمینی حقائق کی جگہ تصوریت Imageology نے لے لی ہے۔"

اگر اس بات کے آخری حصے کو آسان الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ بات کچھ اس طرح بنتی ہے کہ موجودہ دور میں سرمایہ داری سے منسلک میڈیا کی جو جنگ چھڑی ہوئی ہے، اس میں کالے کو سفید اور سفید کو کالا کہہ کر نظریات، حقائق، مسائل اور شخصیات کو اپنی تشکیل شدہ تصوریت میں ڈھال کر لوگوں کے اذہان پر تھوپنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

میلان کندیرا کی لکھی ہوئی یہ بات ایک خوف ناک قسم کے جبر کی صورت میں دن بہ دن صحیح ثابت ہوتی چلی جا رہی ہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت Global Village کی گھڑی ہوئی اصطلاح کا چلایا ہوا چکر ہے۔

اصل میں دنیا میں جو بڑے بڑے مالیاتی ادارے اور بزنس سے متعلق بڑی بڑی کمپنیاں ہیں یا پھر چند ایک سامایہ دار لوگ ہیں، انہوں نے اپنے شکار یعنی غریب ممالک کے غریب عوام کو مزید لوٹنے کے لئے Corporate Globalization کا چکر چلایا ہوا ہے، تا کہ غریب ممالک کے غریب لوگوں میں جو تھوڑا بہت خون رہ گیا ہے، وہ بھی چوس لیا جائے۔ Global Village کے بنائے ہوئے اس تصور کی بنیاد اسی ظالمانہ نکتہ نگاہ پہ کھڑی کر دی گئی ہے۔

اس دور میں میڈیا کے سامنے جو بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی بھی مقبول اخبار یا ٹیلی ویژن کا چینل بغیر بھاری بھرکم مالی قوت کے چل نہیں سکتا۔ مالی قوت حاصل کرنے کے لئے یا تو خود چینل یا اخبار کسی ایسی پارٹی کی ملکیت ہوتا ہے جس کے پاس بھاری بھرکم رقم موجود ہے یعنی کہ پارٹی خود سرمایہ دار ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ پارٹی سرمایہ دار ہونے کے ناتے خود کار عمل کے طور پہ کارپوریٹ گلوبلائزیشن کی نمائندگی کرتی ہے یا یہ کہہ لیجئے کہ وہ پارٹی ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ طور پہ گلوبلائزیشن کے مقامی ایجنٹ کے طور پر کام کرتی ہے، اگر اس طرح کی کوئی پارٹی کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے بچھائے ہوئے جال سے نکل کر کام کرے گی تو پھر اس کا خاتمہ بالخیر ہو جائے گا اور سیٹھ اپنی برادری سے کٹ کر اپنے آپ کو فٹ پاتھ پر پائے گا۔ یہ صورت حال کوئی بھی سسٹم یا میڈیا کی مالک یا پارٹی قبول نہیں کرے گی، سوائے اس کے کہ کوئی سسٹم یا پارٹی کسی خاص عقیدے کی حامل ہو کہ اپنے عقیدے کے لئے فٹ پاتھ پر جا کر گرنا اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی مگر سرمایہ داری کی دنیا میں اس طرح کی پارٹی کی موجودگی ظاہر ہے کہ تقریباً مفقود ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس دور میں کوئی بھی اخبار یا کوئی بھی ٹی وی چینل بغیر اشتہارات کے چل نہیں پائے گا، پھر چاہے وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، ظاہر ہے کہ یہ اشتہارات کارپوریٹ گلوبلائزیشن کا کوئی بھی نمائندہ یا ایجنٹ ہی دے گا۔ جب یہ نمائندہ کسی اخبار یا چینل کو بھاری بھرکم رقوم کی صورت میں دے گا، تو میڈیا کو بھی بدلے میں کارپوریٹ گلابلائزیشن کی خواہشات کو ہر صورت میں مدنظر رکھنا پڑ جائے گا تو اس طرح آج کل کا میڈیا بھی کارپوریٹ گلوبلائزیشن کا ایک طرح سے نمائندہ بنا ہوا پایا جاتا ہے۔

اگر اسی بات کو دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو خود کارپوریٹ گلوبلائزیشن کو اپنے پروڈکٹس بیچنے کے لئے اور اپنے لئے خریداروں کی فوج ظفر موج پیدا کرنے کے لئے اشتہارات کے ذریعے میڈیا کا سہارا لینا پڑتا ہے کہ میڈیا کے بغیر کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے نمائندے وہ کچھ کر نہیں پائیں گے جو چاہتے ہیں۔ اس طرح میڈیا بھی ان کے سامنے ایک بھاری بھرکم پارٹی ہے، بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ میڈیا ایک طرح سے کارپوریٹ گلوبلائزیشن کی مجبوری ہے تو میڈیا ہی ہے جو کنزیومر سے یہ بات منوانے

میں کامیاب ہوتا ہے کہ اگر فلاں کریم آپ اپنے جسم پہ لگاتے رہیں گے تو آپ کالے رنگ سے چھٹکارا پا کر گورے رنگ کے بن جائیں گے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جس کے ذریعے انسان کو بیوقوف بنا کر اسے ذہنی غلامی کی طرف لے جاتا ہے اور بقول میلان کندیرا، حقائق کی جگہ تصوریت Imageology نے لی ہے۔

اس تصوریت یا ذہنی غلامی کو کارپوریٹ گلوبلائزیشن اور میڈیا مل کر پیدا کرتے ہیں جو دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس دور میں اس گٹھ جوڑ کو توڑنا تقریباً ناممکن سا دکھائی دیتا ہے کہ ایک جبر کی سی صورت اختیار کر چکا ہے، جو انساں کے بیڈ روم تک پہنچا ہوا ہے۔

اس کی باوجود کارپوریٹ گلوبلائزیشن سے جنم لینے والی اصطلاح گلوبل ویلج کا کوئی کتنا بھی راگ آلاپتا پھرے، مگر شہر کراچی کے نزدیک بیابانوں کے شکار کوہستان کے علاقے کا کوئی بھی گاؤں قطعی طور پہ کسی بھی صورت میں سوئزرلینڈ کا کوئی شاندار گاؤں نہیں بن سکتا اور نہ ہی مستقبل قریب میں کوئی ایسی صورت حال جنم لے سکتی ہے اور نہ ہی شہر کراچی واشنگٹن بن سکتا ہے، بلکہ دونوں میں جو فرق ہے، وہ کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے شاخسانے سے بڑھتا چلا جائے گا اور امیر غریب کو کھاتا چلا جائے گا۔ ہم ہیں کہ معروف پولش نسل کے امریکن ادیب جیرزی کوسنسکی Jerzy Kosinski کی میڈیا کی ذہنی ڈکٹیٹرشپ اور عدم شناخت کے موضوعات پر لکھے ہوئے ناول Being there کے مرکزی کردار کی طرح لاشعوری طور پہ تصوریت کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں اور پتلیاں بن کر دوسروں کی انگلیوں کی حرکات پہ ناچ چلے جا رہے ہیں، جبکہ جن امیر ممالک نے یہ تصوریت دی ہے، وہاں کے نہ صرف عوام اس تصوریت کے خلاف مظاہرے پہ مظاہرے کئے جا رہے ہیں، مگر ساتھ ساتھ جن ماہرین اقتصادیات نے اس تصوریت کو جنم دیا ہے، ان کو موجودہ دور کی تازہ آواز کے طور پہ برطانیہ کے مشہور و معروف صحافی اور ادیب مارٹن ایمس Martin Amis نے تو Death of mega Intellectuals تک کا خطاب دے دیا ہے۔ مگر چونکہ ہمارے ہاں یہ تصوریت ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے تو اس دور کا ہمارا ادب بھی زندگی کے اس بھاری بھرکم پہلو کے میلے سے بچ نہیں سکتا۔ ہمیں اپنے موجودہ ادب میں اس صورت حال کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا۔

ان سب حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے ہاں کچھ لوگ یہ باتیں بھی کرتے اور لکھتے ہیں کہ اس جدید دنیا کے ادب کے کردار کا تعین کیا جائے۔ کسی حد تک یہ بات تو صحیح بھی ہو سکتی مگر اس کے باوجود سب سے بڑی اور بھاری حقیقت تو یہ ہے کہ ادب کے کردار کا تعین کوئی اور نہیں بلکہ خود ادب کرتا ہے۔ بلکہ یہ بات زیادہ مناسب ہے کہ ادب خود اپنا راستہ بناتا جاتا ہے۔

سندھ کے کسی مچھیرے نے خوب کہا کہ "سائیں، بادشاہ دریاؤں کا سودا نہیں کرتے، بلکہ دریا بادشاہوں کا سودا کرتا چلا آیا ہے اور کرتا رہے گا"۔ میں تو نہ کوئی ادیب ہوں اور نہ ہی بادشاہ، مگر یہ سب کچھ لکھنے کے وقت مچھیرے کی طرح یہ بات میرے سامنے آتی ہے کہ ادب بھی ایک دریا ہے، چاہے وہ قدیم دور کا ہو یا اس جدید دور کا، وہی سب کا سودا کرتا ہے اور ہر دور میں اپنا کردار خود بخود ادا کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس دریا کے سامنے بند نہیں باندھا جا سکتا۔

اصل میں اس موضوع پر غور کرتے وقت کہ آج کی بدلتی دنیا میں ادب کا کردار کیا ہے؟ ہم عموماً یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ بدلتی ہوئی دنیا اور ادب کوئی الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ بدلتی ہوئی دنیا اور ادب یہ تو ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں یا ایک ہی حقیقت کی دو صورتیں یا دو پہلو ہیں۔ فطرت کو ہی الگ ایک طرف رکھیے۔ انسانی سوچ کے باعث جو تبدیلی دنیا میں یا کسی انسانی معاشرے میں آتی ہے دراصل ہم اس کو بدلتی ہوئی دنیا کہتے ہیں اور پھر یہ انسانی سوچ بھی عموماً حقائق پہ ہی زیادہ ہوتی ہے۔ انسان نے اپنے لئے ابھی تک بہت سی قدریں تو بنا ڈالی ہیں یہ تو فکر ہیں لیکن ان پر عمل جو او براہ راست نہیں ہوتا بلکہ صحیح معنوں میں اس وقت ہوتا ہے جب وہ ان حقائق میں کوئی تبدیلی لے آتا ہے۔ ان حقائق کی تبدیلی کو آپ بالکل سائنسی انکشاف یا سائنسی ایجاد کا نام دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آدمی نے یہ سوچا یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ دنیا کے سفر کے ضمن میں فاصلوں کو کم کرے یعنی سفر کرنے والی سواری کو تیز رفتار بنائے اور یوں اس خواہش یا اس سوچ کے تحت مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں ایجاد ہوئیں، موٹر بسیں، ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز وغیرہ وغیرہ کیا یہ ایجادیں نہیں ہو گئے۔ آدمی نے پہلے تیز رفتار سواریوں کی خواہش کی اور پھر اس کے نتیجے میں اس نے یہ تیز رفتار سواریاں ایجاد کر کے دنیا کے فاصلوں کو کم کر دیا۔ اس طرح پہلے انسان اپنے دشمن کے ساتھ تن تنہا ہاتھا پائی کرتا تھا پھر اس کے ہاتھ میں تلوار آئی ہوگی اس کے بعد تیر کمان سے اور پھر بندوق اور اب آخر میں ایٹم بم تک نوبت پہنچ گئی ہے بلکہ اس سے بھی آگے

یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ خواہش کرنا انسان کے ذہن کا اولین کام ہے اور اس کے نتیجے میں وہ سوچنے کا آغاز کرتا ہے گویا خواہش انسان کو غور و فکر اور سوچنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ خواہش کرنے اور سوچنے سے انسان سب سے پہلے جو چیز پیدا کرتا ہے وہ ادب ہوتا ہے۔ انسان اپنی خواہش اور سوچ کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی تحریری شکل میں اور کبھی تقریری شکل میں۔ یہ اظہار کتنا بھی مبتدیانہ کیوں نہ ہو آپ اسے بلا خوف تردید ادب کا نام دے سکتے ہیں۔ یہی بات کہ ادب پہلے تخلیق ہوتا ہے اور اس میں ادب عالیہ کے پھول چند نے بعد میں لگنے جاتے ہیں ابتدائی ادب کو آپ دیکھیں گے تو اس میں آپ کو تکلف کے بغیر انسان کی خواہشات کا اظہار سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ پرانی داستانیں اٹھا کر دیکھئے آج کی جدید ترین ایجادات کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوگا۔ اب پرانی کہانیوں میں جو شہزادے اپنی معشوق شہزادیوں سے ملنے کے لئے کل کے گھوڑوں پر چڑھ کر آیا کرتے تھے وہ آج ہوائی جہاز اور بجلی کا چرخی ابتدائی شکل نہیں تو اور کیا تھی۔ اس طرح آج

کی کوئی بھی بڑی سے بڑی ایجاد لے لیجئے اس کی ابتدائی صورتیں پرانی کہانیوں اور داستانوں میں با آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔

آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ آج جو ہمیں ہماری دنیا بدلتی ہوئی نظر آرہی ہے وہ انہیں سائنسی ایجادات کے باعث ہے۔ ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر نے ہماری دنیا میں جو کم تبدیلی پیدا نہیں کی وہی بھی حال ہوائی جہازوں کے باعث ہوا ہے اور یہی حال ایٹم بم کے ایجاد سے ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی جیسی جیسی خواہش کرتا ہے اور جیسے جیسے اس خواہش کا اظہار ادب کے ذریعے ہوتا ہے اور پھر ادب کے اظہار کے بعد یہ خواہش ٹھوس صورت اختیار کرتی ہے ویسے ویسے دنیا بدلتی چلی جاتی ہے۔

آج جو کہا جا رہا ہے انسان شعر و ادب سے دور ہوتا جا رہا ہے اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ انسان نے خواہش کرنا چھوڑ دیا ہے سائنسی ایجادات نے اس کی بہت سی مادی خواہشات کو پورا کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ خواہش کرنے سے بیگانہ سا ہوتا رہا ہے لیکن انسان خواہشات سے اپنے آپ کو زیادہ دیر تک بیگانہ نہیں رکھ سکتا۔ جو انسان شعر و ادب سے دور ہوتا ہوا نظر آرہا ہے وہ ایک وقتی بات ہے دوسرے اب چونکہ اس کی مادی خواہشات کافی حد تک پوری ہو رہی ہیں اس لئے اب وہ اعلیٰ اقدار کو عمل میں لانے کی طرف سنجیدگی اور خوبی کے ساتھ متوجہ ہوگا اور یہ توجہ انسان کو ادب ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے اب میرے خیال میں بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور موثر ہوگا۔ نہ یہ کہ وہ دنیا بیزار زندگی سے مایوس ہو جائے ایک ادیب کو زندگی اور دنیا سے مایوسی نہیں ہوتی۔ ادیب کو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے ارتقا کی کوئی انتہا نہیں یہ تو آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے لہٰذا مایوس ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

دنیا جتنی تیزی سے بدل رہی ہے اور کوئی دو تین صدی پہلے بھی اسی رفتار سے تبدیل ہوئی تھی اور اس دوران بھی یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ اب ادب کا کردار کیا ہوگا؟۔۔۔ادب کا کردار کیا تھا۔ جدید اردو ادب تو اسی زمانے میں پیدا اور بلاشبہ ہماری دوسری زبانوں میں بھی اعلیٰ ترین ادب (خصوصاً) شاعری بھی اسی عہد کی دین ہے۔ اس لئے اگر یہ سوال اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ موجودہ انقلابات اور اس کی ٹیکنالوجی کے باعث ادب کا مستقبل مخدوش ہو گیا ہے تو یہ اس چھوٹے سے کرۂ ارض پر بسنے والے ایک چھوٹے سے دماغ کا خدشہ تو ہو سکتا ہے مگر

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

کہ ابھی تو یہ وہی دنیا میں بڑی گرہ کشائی ہوئی ہے اور تسخیر کائنات کے بہت سے حیرت انگیز مراحل باقی ہیں اگر یہ معلوم موجود ہے تو پھر ادب کی تخلیق بھی کہیں رکتی نظر نہیں آتی۔ سو ادب کا ایک یہ پہلو ہے اور دوسرا یہ کہ جیسے جیسے ابلاغ کے نئے میدان سر ہوتے جائیں گے تخلیقی ذہن ان حدود کے اندر فکر و تخیل کرتے رہیں گے کیونکہ فکر و نظر کے عمل میں تخلیقی توسیع اور نئے سے نفسیاتی سانچے بھی ڈھلتے رہیں گے اور یہ جو ہونے کا عمل ہے بقول اقبال "[illegible] منزل نہیں ہے"۔

سوال یہ ہے کہ بدلتی دنیا میں ان مختلف زبانوں کا مقدر کیا ہوگا جن میں ماضی میں اعلیٰ ادب تخلیق ہوا۔ برصغیر میں سنسکرت کی مثال دی جا سکتی ہے۔ زبان تقریباً ختم ہو چکی مگر کیا اس طرح اس زبان میں خلق کئے گئے شاہکار بھی تبدیلی کے ہاتھوں دریا برد ہو چکے؟

بدلتی دنیا۔۔۔یعنی دنیا میں جو تند تبدیلی آ رہی ہے اس کی اپنی نوعیت کیا ہے؟ حصول آسائش و لذت کا جو ذہن اور جسم کے مطالبوں کی تکمیل؟ گزشتہ صدی کی دو عالمگیر اور بے شمار علاقائی جنگوں اور اکیسویں صدی میں یک طاقتی حکومت کا منصوبہ مقصود کیا ہے؟ مادی فتوحات اور ہر نوع کے وسائل کا مخصوص مادی فوائد کے لئے استحصال اور استعمال۔۔۔تو یہ صورت حال قرون اولیٰ بعد ماقبل تاریخ کی صورت حال سے کیسے مختلف ہوئی۔۔۔محدود پیمانے پر مثال برصغیر پر آریاؤں کے حملہ اور دراوڑوں کی رفت جنوب کی پسپائی کی ہے۔ آج کے آریا سوائے مختلف نوعیت کی یلغاروں کے انسان کی تالیف قلب کے لئے کچھ اور بھی کر سکے یا سوز جگر کو اپنی آخری انتہاؤں تک پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

تو آدمی عہد حاضر کے آریاؤں کی یلغاروں کے باوجود انسان بننے کی خواہش بھی رکھے گا، کوشش بھی کرے گا اور اس راستے پر کارواں بھی بناتا چلا جائے گا اور خیر اور شر کی کشمکش بھی جاری رکھے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا خیر اور شر کی بنیادی نوعیت بدلتی دنیا میں سر بسر تبدیل ہو جائے گی؟ کیا آدمی جغرافیائی اور ملکی، نسلی اور لسانی حدود سے اوپر اٹھ کر بھی اپنے خیر کو بدستور دوسروں کے لئے شر بناتا رہے گا؟ اس کیفیت میں خیر و شر، جو تضادات پیچیدہ اور غیر انسانی ہیں جو اب تخلیق ہوا کیا، وہ تبدیلی کی فلک بوس لہر میں غرق ہو جائے گا اور یہ ہونے والا ہے تو پھر موجودہ اور مستقبل کی تبدیلیوں میں ادب کا کوئی کردار نہیں رہے گا لیکن اگر یہ نہیں ہوگا اور ہو بھی نہیں سکتا تو پھر ادب کا ایک کردار مستقبل کے بیرونی اور اندرونی تضادات میں شعلہ ساماں رہے گا۔۔۔۔

ایک اور سوال۔ کیا ہونے والی تبدیلیوں میں اقدار کا مفہوم بدل جائے گا؟ اور صرف اور صرف مثبت اقدار رہ جائیں گی اور منفی اقدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیا کوئی ایسی شے ہے جس میں صرف اور صرف مثبت ہی ہو اور منفی کا پہلو بالکل نہ ہو؟۔۔۔ ہمیں دنیا میں یا کائنات میں شاید کوئی بھی ایسی شے وجود نہیں رکھتی جو صرف اور صرف یک طرفہ خواص رکھتی ہو۔ ہاں خواص کا تعین ایک حد تک اضافی ہوتا ہے مگر مکمل طور پر اضافی نہیں ہوتا۔

توقع ہے کہ سیاسی تبدیلیوں میں ادب کا فعال کردار اور تخلیق دونوں ساتھ ساتھ چل کر ہی پڑھنے سننے والوں میں کوئی مقام حاصل کر سکے گا کیونکہ قاری یقیناً اس ادیب شاعر کی تخلیق کے لئے چشم براہ رہے گا جو موجودہ اور غیر موجودہ دونوں صورتوں میں زندگی کے محاذ پر کھڑے ہر دو صف آرا نظر آئے گا۔۔۔۔ ہمارے اپنے عہد میں برصغیر میں ایک مثال فیض احمد فیض کی ہے جو کچھ انہوں نے پہلے تخلیق کیا وہ ایک مقام پر آکر تاریخ کا رہا لیکن جب کردار کی آزمائش سر پر ہوئی تو فیض کی شاعری کا مفہوم ان کی غیر معمولی سرگزشت سے جڑنے میں رنگ کی بامراد ہوا۔۔۔ فیض کے عہد کے کئی بڑے شاعروں نے بڑی شاعری کی مگر مخصوص کردار کے حوالے سے

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

سوال یہ نہیں ہے کہ ترقی ہوئی دنیا میں ادب باعث کشش بحال اور تسکین نہیں بلکہ موجودہ تہذیبی تصادم میں ادب نے فکری تبدیلی کے لیے تازہ دنے کا کام دیا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ رونما ہونے والے واقعے سے پہلے فکری تخلیق کاری کے ذریعے کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان ہی کے ذریعے جواز ڈھونڈا جاتا ہے کیونکہ تمام نظریات اور ازم اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے شعر و ادب کو ہی ذریعہ بناتے ہیں۔ فرائیڈ کی ستر ویں سالگرہ کے موقع پر جب اس کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ انسانی لاشعور کو اس نے دریافت کیا تو اس نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ انسانی لاشعور کو اس سے پہلے شاعر اور ادیب دریافت کر چکے ہیں، اس نے اس دریافت کو منضبط علم کی صورت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بعض نفسیاتی اصطلاحیں یونان کی ادبی تخلیقات سے اخذ کی ہیں۔ Oedipus comple جس میں بچہ کا اپنی ماں سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتا ہے جو نفسیاتی الجھن بن جاتا ہے یہ اصطلاح اس نے یونانی ڈرامہ نگار سوفوکلیس سے لی ہے۔ سادہ الفاظ میں ان خواہشات کا اظہار ان باتوں میں ہے کہ آسودہ زندگی گزارنے کی خواہش غیرت قومی کا احساس اور اظہار، تہذیب میں نئے عناصر پیدا کرنے کی قوت، جبر اور سماج سے احتجاج، نئے انتخاب اور جدت میں مشکل خیزی سے پرہیز، محنت کو ترقی کے انسانی دور میں شامل کرنا، بحر اور میدانوں پر کنٹرول، بے معنی ہے جس چیز پر کنٹرول ضروری ہے وہ انسان کی ذات ہے معاشی ترقی میں تہذیبی اقدار کا تحفظ اور انسانوں کی محرومی کا احساس ہونا چاہیے۔

ادب سمندر پار دونوں طرف پہنچ رہا ہے لیکن اس میں کونسا پیغام ملتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی قدریں ہم سے مختلف نہیں۔ ان کے مقاصد برسر اقتدار طبقے کی معاشی پالیسی ہے۔ اب ایشیا بھی ہیجان خیز گھمبیرتا میں اترا ہے علاقائی قومیں ایک دوسرے کے متنازعہ مفادات اور معاشی ترجیحات کی وجہ سے معاشی اور معاشرتی ارتباطات کو آسانی سے بحال نہیں کر سکتے۔ یہ عصری سماج کا المیہ ہے کہ ہماری جمہوری سماجی تعمیری ہم تک محرکات Drive ترغیب آفرینی Stimulus اور جواب response کی زبان میں پہنچتی ہے۔ یہ آزاد انسان کی زبان نہیں غلاموں کی زبان ہے۔ آزاد انسان کی زبان مقصد، انتخاب اور فرق شناسی پر منتج ہوتی ہے۔

ہمارے سامنے منظر نامہ یوں ہے کہ گلوبلائزیشن کا چرچا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے کاروبار کے راستے میں سرحدوں کی رکاوٹ کو برداشت نہیں کرتیں۔ WTO کی آمد آمد ہے۔ چھوٹے ملکوں کی زراعت اور صنعت کی حفاظت خطرے میں ہے، سنٹرل ایشیا کی گریٹ گیم نے نئی کروٹ لے لی ہے۔ فرانس کے ایک لکھاری نے 9/11 کے حقیقی واقعے کو ڈھکوسلا کہہ دیا

۔سلمان رشدی نے Mercauary write بن کر اپنی خواہشات کو آٹھ زبانوں میں منتقل کر کے خوب دولت کمائی۔ احمد رشید نے طالبان لکھ کر انعام و اکرام حاصل کیا۔ ہم نے اپنی تہذیب پر ضرب کاری لگا کر ایک متابعت کی جس کی وجہ سے اپنی شعائر کے قربان ہونے پر کف افسوس بھی نہ ملا۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد اسلامی ملکوں میں دس ملکوں کا اضافہ ہوا ہے تو اس سے کیا فرق پڑ گیا۔ Arther نے The Battle For God اور ایروشلم لکھ کر اسرائیل اور فلسطین کے حقیقت پسندانہ تحفظ کا اظہار پیش کیا، بڑی طاقتوں نے عیسائیت پھیلانے کو جس مکاری کے ساتھ چھپا رکھا ہے تو ہم نے بھی بڑی نامعقولیت کی حد تک اسلامی انتہا پسندی اور در پردہ اپنی ملائیت کا اظہار کیا ہے۔ یہ تصادم تہذیب کا نہیں بلکہ ترجیحات کی جنگ ہے جس میں احتیاط اور اپنی شناخت برقرار رکھنا ہمیں درپیش ہے۔

جب آئن سٹائن نے امریکی صدر کو جنگ کے آخری دنوں میں ایک خفیہ خط لکھ کر بتا دیا کہ جاپان نے جو ہری مواد تیار کیا ہے تو اس کے فوراً بعد ہیروشیما پر بم برسائے گئے۔ نصف صدی کے بعد یہ صنعت پوری دنیا میں پھیل گئی بیسویں صدی میں ہلاک ہونے والے انسانوں سے کوئی سبق نہیں لیا گیا۔ اصول برداشت اور ترجیحات کا یہ تنازعہ پورے کرہ ارض پر مسلط ہے انسان اتنا عاجز ہو گیا ہے کہ عقل و تدبیر کے علاوہ جمہوری قدروں کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی۔ ترجیحات کے نیے حاکموں کو لایا جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ مرحوم پروفیسر مجتبیٰ حسین نے "آگ کا دریا" ناول کو تہذیب کا ایک دھارا دیا تھا اس کے کردار ہر زمانے کے ساتھ بدلتے رہے اور اب کلیشور نے اس کتاب "کتنے پاکستان" ناول میں وہی انسانی تاریخ سے وابستہ ہجرت کے واقعات اور نوسٹلجیا اور تشدد اور انتہا پسندی سے متاثر ہو کر معاشرتی خاکہ پیش کیا ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ادیب دیکھتا رہ گیا وہ کہنا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ پوکون کے بعد ہمارے مور یا تو ختم ہو گئے یا دیس چھوڑ کر چلے گئے لیکن کیا چاغی کے بعد تمہارے مجبور کے چہروں پر مدھ مکھیاں ابھی بھی آتی ہیں۔ ہاں بودھی ورکش میرے اس جھولے میں اسی کی پودھ ہے۔ بودھی ورکش کی جڑیں ننھے کیطرح سارا وش یعنی (زہر) پی لیتی ہیں۔ پہلا بودھی ورکش میں پوکھران میں لگاؤں گا اور پھر سرحد پار کر کے دوسرا ورکش چاغی کے پہاڑوں میں لگاؤں گا۔ تو میں چلوں!"

ہندوستان کے ناول نگار نے سب گروہوں، فرقوں، قبیلوں اور بٹے ہوئے انسانوں کو ایک عالمگیر وحدت میں دیکھنے کا عندیہ دیا ہے۔ کیا ہمارے یہاں بھی فرقہ پرستی سے میرا لکھنے والوں میں یہی جذبہ موجود ہے؟

مجھے خریدا گیا جھوٹ بولنے کے لیے
وہی سزا بھی ہے میری جو میرا پیشہ ہے

ایک اہم رجحان Consumarism صارفین تحریک سے پیدا ہوا ہے جہاں فرد کے مفادات کو سماج پر ترجیح دی گئی ہے۔ ادیب فرار کا راستہ اختیار کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرہ اور ملک اور دنیا کے مسائل بہت پیچیدہ ہوئے ہیں وہ خود صارف بن کر اس تحریک کا حصہ بن گیا۔ یقین جانیے ہمارے ادیب اور شاعر منفعت یا جذبے کی خاطر فرقہ پرستوں کے سیاسی کھیل میں شامل ہونے سے نہیں ہچکچاتے۔

اردو ناول نگار ذوقی نے موجودہ عہد کے تناظر میں سوچ سمجھ کر رائے دی ہے "یہاں جنگ برائے جنگ ہو رہی ہے آدمی کو بچانے کے لیے اربوں کھربوں کے میزائل خرچ کر دیئے جاتے ہیں اور لاکھوں آدمیوں کو مار کر لاکھوں آدمیوں کے بچنے کا جشن منایا جاتا ہے"۔ ایک انسانی ماڈل مکاؤف کے چیمبر میں تیار ہوتا ہے ایک بھیڑ ڈولی میاتی ہوئی آپ کے سامنے آ جاتی ہے ایک

ہوائی جہاز ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو پھیلاتا ہوا گزر جاتا ہے اور چند شیو سیونگ چودہ فروری ویلنٹائن ڈے یعنی محبت کے دن پر پابندی لگانے کے لیے نکل آتے ہیں الجھا وا ہی الجھا وا ہے۔

ڈاکٹر جینوم کے ذریعے انسان کو مرنے سے روکنے کی تیاری کرتے ہیں To be or not to be is the question ہے شکسپیئر زندہ ہوتا تو کچھ اور کہتا ہونے اور نہ ہونے کے بیچ یہ دنیا پھنس گئی ہے۔

کچھ ٹوٹ رہے ہیں، نئے اصول بن رہے ہیں یہ دور دراصل ہمارے لئے نہیں شگفتہ فرائڈ کے لیے تھا۔ وہ دیکھتا کہ چالیس سال پار کے باپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ایک باپ جو اپنے بچوں کو ان کی اپنی آزادی کے ساتھ اتار تو لیتا ہے مگر اس کا بچپن برقرار رہتا ہے اور وہ وہی رہتا ہے اندر سے پرانی سنار ایک ڈائنا سور۔

سچ تو یہ ہے کہ نئی دنیا کے غم اتنے بڑھ گئے کہ ہمارے آنسو خشک ہو گئے ہمیں اپنے آپ سے فرصت نہیں۔ ہم تہذیبی طور پر اس گلوبلائزڈ اور نیبرا ائزڈ ماحول میں ٹکراؤ کے شکار نہیں۔ ایک ناول نگار نے تمام اقدار کا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔

اس اندھی، کانی اور بہری ریس میں تھپلے ہوں کے گملوں کی پرواہ ست کیجئے چھوٹے شہر چھوٹے لوگ چھوٹی دنیا میں پیسے کی اور سپاہیوں کی پرواہ مت کیجئے۔ ایک Big پور ہوگا۔ زندہ رہنے کے لیے کوئی ڈیل نہیں ہوگی ہم لغت سے no اور possible کو خارج کر دیں گے۔ آپ نے بچوں کے ویڈیو گیم دیکھے ہیں زیادہ تر بچے کیا دیکھتے ہیں وحشی اور war داڑھی لگائے اسامہ پر امریکی گولہ باری ہو رہی ہے۔ بچے تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہیرو کو ولن اور ولن کو ہیرو بنایا جا رہا ہے۔

کتنی مشکل دنیا میں وقت گزار رہے ہیں جس میں کتابیں پہلے لکھی جاتی ہیں اور اس پر عمل بعد میں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں قومی زبانوں کی شناخت اور اس میں تخلیق ہونے والا ادب قاری تک نہیں پہنچ رہا اور قاری بیچارے کا لیول اتنا گر چکا ہے کہ وہ صرف شام کا اخبار پڑھ لیتا ہے۔

تہذیبی استحکام اور ذہنی ترقی کے لیے مفاہمت اور برداشت کی ضرورت ہے۔ بدلتی ہوئی دنیا کے واقعات براہ راست ہم پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ میڈیا اس سلسلے میں ادب سے بہت آگے چلا گیا ہے۔ عام قاری اور ناظر کو مثبت طرز کا ابلاغ ضروری ہے میڈیا مقابلے کی نشریات جاری رکھے ہوئے ہے، جب کہ ادب ایک حقیقی اور فطری تبدیلی کے ساتھ ابلاغ چاہتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا خوب کہا ہے "ادب بغاوت کا اظہار تو کر سکتا ہے لیکن اظہار سے بغاوت نہیں کر سکتا"۔ نئے تناظر میں ادب کے سلسلے میں یہ بنیادی بات ہے۔

Scanned by CamScanner

پروفیسر انوار احمد

اس وقت دنیا میں تاریخ کے خاتمے، تہذیبوں کے تصادم، طاقت ور کی طرف سے کمزور پر پیشگی حملے کی تقدیس؟ آزاد منڈی، بھاری جیبوں سے ریزش کے زر سے وابستہ غریبوں کی واحد امید یا فریب اور دنیا کی اکلوتی سپر پاور کی ثقافت اور زبان کی ہمہ گیری کا اطراف میں چرچا ہے مگر اس دنیا کے معلوم نقشے پر بڑے بڑے تغیرات اور انقلابات کے باوجود یہ کہنا کہ اس دنیا میں جوہری طور پر کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی کہ ادب یا ادیب کے کردار پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آئے، بظاہر بے خبری یا لاعلمی پر مبنی ایک رائے دکھائی دے گی۔ تاہم اس نقطہ نظر کی پرکھ کے لیے ہم تخیلی طور پر ایک آزمائش کر سکتے ہیں، وہ یوں کہ فرض کر لیجئے کہ وہ چند سچے لوگ اس دنیا میں دوبارہ پیدا ہو گئے، جنھوں نے اپنے نظریات کی صداقت کی خاطر زہر کا پیالہ پیا تھا، پھانسی پر جھولے تھے، سنگ سار ہوئے تھے، جلاوطن ہوئے تھے اور معتوب ٹھہرے تھے مگر مسلسل طور پر ان کے نام تخلیقی دنیا میں فیض رساں رہے ہیں۔ کیا ہم میں سے کوئی سچ مچ یہ خیال کرتا ہے کہ ہماری یہ بدلتی ہوئی دنیا سقراط، حسین، منصور، سرمد، زرد اشت، ناظم حکمت اور منٹو سے کوئی مختلف سلوک کرے گی۔ سو میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ اوزاروں، ہتھیاروں، حکمت عملیوں اور ایجنسیوں کے ناموں پر اثر پذیری کے فرق کے باوجود ایک دنیا سیانوں اور طاقت وروں کی ہے، جس میں عافیت، آسودگی اور کامیابی و کامرانی کے اپنے طریقے اور معیارات ہیں اور ایک دنیا ان معیارات سے انحراف کرنے والوں کی بھی ہے اور اس کی قیمت ادا کرنے والوں کی بھی ہے، جنھیں آپ ابنارمل کہیں دیوانہ کہیں مگر وہ لوگ ہمیشہ سے ہیں اور ہر دور میں ان آفاقی قدروں کی حفاظت کرتے ہیں جنھیں زمینی حقائق وقتاً فوقتاً مسخ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

میں ادیب کے بارے میں کوئی رومانوی تصور پیش نہیں کر رہا کیوں کہ دنیا میں لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں جو لفظوں سے کھیلتے ہیں، کبھی خرید کر اور کبھی بیچ کر۔ وہ کسی بھی خیال یا نقطہ نظر کے بارے میں نظام کے محافظوں کی جانب دیکھتے ہیں کہ اس کی موافقت کرنی ہے یا مخالفت۔ چند ایسے ہنر فروش بھی ہو سکتے ہیں جو خسرو کے عشرت کدے پر مزدوری کی بجائے شیریں کی خواب گاہ اور بارگاہ میں باریابی کو زندگی کی سب سے بڑی کامرانی سمجھتے ہوں، حالانکہ یہ بھی خسرو ہی کی خدمت بجا لانے کی ایک صورت ہے۔ چند ایسے قلم کار بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے فن کی معراج سرکاری پذیرائی کو خیال کرتے ہوں یا ایک بہت بڑے حلقے کی آٹوگراف طلبی کو مجید امجد کی حسرت کا کفارہ خیال کرتے ہوں، مگر ہر معاشرے اور ہر دور میں کوئی ایک ہی تخلیق کار ہوتا ہے جو طاقت وروں کی منشاء کے مطابق دیکھتا نہیں، انہی کے وضع کردہ انسلاکات کی مطابقت میں محسوس نہیں کرتا اور ان کی جانب سے

فراہم کردہ لفظوں کے کونے میں اظہار نہیں کرتا۔ اس عہد کے بے بس اور بے کس لوگ یا شاید بے زبان لوگ اس کی کتاب خریدنے کی صلاحیت بھلے نہ رکھتے ہوں، آٹوگراف بھی نہ لیتے ہوں، اس کے گرد حلقہ زن بھی نہ ہوتے ہوں اور شاید اسے زیر عقوبت دیکھ کر اپنی سسکیوں کو بھی اپنی میلی پوٹلیوں میں چھپا لیتے ہوں، مگر انہیں یقین ہوتا ہے کہ یہ ہمارا سچا دوست ہے، یہ طاقت وروں کے ایماء پر ہمیں نہیں کہے گا کہ پیدا کرنے والے کی منشاء یہ ہے کہ ہم سے شرف آدمیت چھین لیا جائے اور ہم بنیادی انسانی ضرورتوں کو بھی ترستے رہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اس تخلیق کار کے سینے میں وہ سورج ہے جس کی روشنی اور تمازت آخر کار ہر آنگن میں پہنچے گی۔ ن۔م۔راشد نے تخلیق کار کو اندھا کباڑی کہا تھا جب کہ مجید امجد نے تخلیقی عمل کو عمل خیر کہا تھا جو بدلتے کے فریب میں مبتلا دنیا میں بھی ایک پیہم عمل کے طور پر جاری ہے اور ہر معاشرے کی ہر دور میں ضرورت ہے۔ شمیم حنفی نے ایک جگہ لکھا ہے" آنے والے دنوں سے زیادہ مجھے بیتے ہوئے دنوں سے ڈر لگتا ہے۔" ہم جس خطے میں ہیں وہاں ہمارا مستقبل ماضی کی کثرت تعبیر کے پاس گروی ہے۔ مگر یہ بات عجیب ہے کہ بعض مصلحتوں کا نقاب اترنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ حکمرانوں اور بظاہر تاریخ سازوں کی بصارت کے مقابلے پر ہمارے تخلیق کاروں کی بصیرت تاریخ، تہذیب اور انسانی اقدار کو وقتی اور ہنگامی مصلحتوں سے جس طرح پامال ہوتا دیکھ رہی تھی، پرتھوی، غزنی اور غوری بتانے والے جتنی بھی کروازالیں، اس فرق کو چھپا نہیں سکتے۔ سو ہمارا ایک تخلیق کار انتظار حسین ادیب کو کہانی کہنے والے کو شہرزاد کے منصب پر بٹھاتا ہے اور خواب دیکھتا ہے کہ آج کی شہرزاد اس خطے کے جابروں کی نفسیات بدل سکتی ہے۔ قرۃ العین حیدر انقلاب ایران کے ملبے پر کھڑی ہو کر سوال کرتی ہے کہ نوجوانوں کے منہ میں موت آفریں نعرے دے کر ہم اپنی اجتماعی زندگی کو کس طرح تازگی اور روشنی سے محروم کر رہے ہیں۔ کوئی اس کو تاریخ کا خاتمہ کہے، کوئی ٹیکنالوجی کے ہاتھوں انسانیت کی موت کوئی اسے یک قطبی دنیا کہے یا کچھ اور۔ واقعہ یہ ہے کہ خیر اور شر کا جدل جاری ہے اور کسی تخلیق کار کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حق کیا ہے، روح عصر کیا ہے اور اس کے واشگاف اظہار کی قیمت کیا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم

اگر یہ مان لیا جائے کہ حسن خیر ہے اور خیر حسن ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہم ایک بدصورت دنیا میں رہ رہے ہیں۔ یہ بدصورت دنیا ہمیشہ سے بدل رہی ہے لیکن ذرا گہرائی سے دیکھیں تو کبھی بدلی ہی نہیں۔ پہیہ چل رہا ہے لیکن پہیے کا دھرا ساکن ہے۔ سیاہ فام ذلتوں کے غول سخی بھر سفید رنگ برہمنوں سے مسلسل جنگ میں ہیں لڑتے ہیں ہارتے ہیں، پھر لڑتے ہیں۔ جینے کے شوق کی ایک بے صرفہ لڑائی جاری ہے۔ ہر آدمی کے اندر کسی کونے کھدرے میں کوئی شاعر رہتا ہے جس نے شوق شمر کے لئے نہیں، اجتماعی خودکشی کو ٹالنے کے لیے حقیقت کے ساتھ خواب کی گرہ باندھ رکھی ہے۔ ورنہ

بے گزشت کہ آدم دریں سرائے کہن
مثال دانہ تہ سنگ آسیا بود است

یہ سنگ آسیا یعنی آدمی کو دلنے والی چکی کا پاٹ گزری ہوئی صدیوں میں بھلے ہاتھ یا پنے کی مدد سے چلتا تھا لیکن نئی ہزاری میں یہ پاٹ ڈیزی کٹر اور ٹام ہاک کی چنگاریاں اڑاتی گراریوں پر ہزاروں دولت کی توانائی سے چل رہا ہے اور اس سے آگے نیوکلیئر ہولوکاسٹ کا منظر نامہ مرتب ہو رہا ہے جس میں نہ چکی رہے گی نہ اس کا دانہ۔ بس رہ جائے گا اللہ کا نام اور عدن سے آدم کی دوبارہ واپسی کا انتظار جوز مین کرتی رہے گی۔

اب سٹیج کے اس ممکنہ آخری شو میں ادب کا کیا کردار رہ جاتا ہے! جبکہ سٹیج کی فٹ لائٹس، پردے کھینچنے اور گرانے کا اختیار ہماری ایج آف ریزن کے میڈیا مین کے ہاتھ میں ہے جو اپنے زور دروغ قلم سے صلیب اور سولی جیسی انسانی ایثار کی دائمی علامتوں کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ بس ذرا کیمرے کا زاویہ بدلنے کی دیر ہے، ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ کا سماں دینے لگتی ہے۔ ڈھائی تین صدی بوڑھا سکیاولی ترقی پاتے پاتے اب دنیا کا سربراہ اول بن گیا ہے۔ ایجاد و اختراع اور دانش کا کرشمہ دیکھئے کہ آدھے آدمی نے پورے آدمی پر قبضہ جما لیا ہے۔ ادب کو عالمی استعمار کی دانستہ اور غیر دانستہ ضرورت کے تحت دیس نکالا دیا جا رہا ہے۔ افلاطون کی خیالی ریاست کی یہ شق مکمل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ میں اپنی متعدد نظموں میں اس بات کا اشارہ دے چکا ہوں۔ ادب برے وقتوں کی مار میں ہے اب سچ، حسن، محبت، آزادی، خیر جیسی تجریدیں بھی باس دینے لگی ہیں۔ وہ جو مقتل کھولے بیٹھے ہیں اور انسانی اقدار کے سری پائے بیچتے ہیں انہیں ایسی متروک تجریدوں سے بو ہی نہیں آنی چاہیے۔ پرانے بادشاہ محبت بانٹنے والے ولیوں اور رشیوں کی قدر کیا کرتے تھے۔ اب بیچارہ شاعر اپنی برسوں کی تنگ دستی کی بوند بوند ٹپکی ہوئی کمائی سے یہی کوئی تین پانچ سو کی تعداد میں اپنا نسخۂ وفا چھپواتا ہے، دوستوں میں بانٹتا ہے اور پھر اسے کتاب کے فٹ پاتھیوں کے

باں ارزانی کی گرد میں پڑا ہوا دیکھتا ہے۔ ادب کی یہ بے توقیری دنیا بھر میں ہو رہی ہے۔ گاہے گاہے کوئی اردو ن وقتی کسی مغربی نقاد کی سند پر قبولیت بھی پالیتی ہے۔ مغرب میں شاعری کی آخری بلاک بسٹر "ویسٹ لینڈ" تھی جو آج سے کم و بیش اسی برس پہلے تخلیق ہوئی۔ بلاک بسٹر لکھتے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہو رہی ہے کہ میں خود کس قدر کمرشلائز ہو چکا ہوں۔ کیا ادب واقعی دنیا بدر ہو رہا ہے؟ کیا ادب کے کردار پر بات کرنا اس کی رہی سہی پذیرائی اور خوش فہمی تو نہیں؟

میں اس غضب کی ہوئی یا بدبختی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار پر آخری بات کرنے سے پہلے آج کی انسانی صورتحال کی اسی دنیا کے بدن سے نکلے ہوئے خون سے تصویر بنا کر دکھانا چاہتا ہوں۔ بیشک آپ اسے کھلی آنکھوں سے بھی دیکھ رہے ہیں۔ یہ دنیا ایک آسیب زدہ دنیا ہے۔ میں کالج کے زمانے میں بوٹنی لیب میں کھڑے ایک انسانی پنجر کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر یہ ڈھانچہ الماری سے نکل کر چلنے لگ پڑے تو پھر کیا ہو۔ یہی کہ جب یہ شہر کے وسط میں پہنچے گا تو شہر خالی ہو چکا ہوگا لیکن نہیں ہمیں برسوں سے ایتھوپیا اور کئی دوسرے افریقی ملکوں میں ایسے لاکھوں کروڑوں زندہ انسانی ڈھانچے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری آنکھوں نے اس آسیب زدگی سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ آدمی وہ بلا ہے کہ بھوت بھی اس سے پناہ مانگیں۔ میں ادب سے یہی درخواست کر سکتا ہوں کہ وہ آفاقی مضامین کی جستجو سے نکلے اور اس دنیا اس اسفل آفاق پر بھی توجہ دے۔ آج عدل و انصاف اور انسانی اقدار کی جو بیت کذائی دیکھنے میں آ رہی ہے، الاماں ایک مخروطنما یا اہرام نما منظر نامہ مرتب کر رہی ہے، عدل و انصاف اور انسانی اقدار کے ساتھ جو بڑے ملکوں میں میکرو لیول پر ہو رہا ہے، وہی کچھ چھوٹے ملکوں میں خردہ سطح پر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ معیشت کی مندی سے مندی کی معیشت کا سفر تو طے ہوا اب نئی سنچری کے قیام اور ملٹی نیشنلز کی حکمرانی نوشتہ بر دیوار نظر آ رہے ہیں۔ یورپ کی جمعیت حوصلہ بخش ہے لیکن اسے اتحاد کے لیے پہلے دو عالمی اور ایک سرد جنگ لڑ کر اپنا فاسد خون نچڑوانا پڑتا ہے۔ ادب اس انسان پرستی کو محض ایک نعرہ سمجھتا ہے جو مغرب کے سیاسی متن کا حاشیہ ہے اور ترک عیسائیت سے پیدا شدہ خلا کو پر کرنے کی ایک ضرورت مندانہ کوشش ہے۔ ادب انسان پرستی کے اس تصور کو مانتا ہے جو جذبے کے ارتفاع اور بصیرت کی گہرائی سے جنم لیتا ہے اور یہ تصور اس یقین سے مشروط ہے کہ اخلاق، انسانی وجود کا ماخذ ہے اور آتما بناتا ہے۔

آج کی انسانی صورتحال مایوس کن اندیشے پیدا کر رہی ہے، زیادہ گھمبیر ہو گئی تو یہ سونامی کے چند جھٹکوں کی طرح بستیوں کی بستیاں اجاڑ بھی سکتی ہے۔ میں یاسیت پسند نہیں۔ یوں بھی شاعری میں قنوطی کی کوئی گنجائش نہیں شاعری نے آج تک کوئی شوپنہار پیدا نہیں کیا۔ انسانی محبت ایک طے شدہ آفاقیت بھی ہے اور شاعری کا مذہب بھی۔ سولہ فروری کا دن (جو اتفاق سے میرا جنم دن بھی ہے) مجھے بسنت کے میلے جیسا لگا جب مغربی دنیا کے کروڑوں لوگ ایک بے جواز اور ناساوی جنگ کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ یہ برف میں سرسوں کے پھولنے کے جشن کے دن تھا۔ میں جبر کی مزاحمت کرنے والوں کو انسان دوست سمجھتا ہوں، دکھ میں مبتلا انسانوں کی دستگیری کرنے والوں کے لیے گہری عقیدت رکھتا ہوں۔ نیلسن منڈیلا، ریم الریاشی، راشیل کوری، مدر ٹریسا، ایدھی اور اسی قبیل کے ان گنت گم نام لوگ نقد انسانیت ہیں۔ وہ نام نہیں علامتیں ہیں ایسے لوگوں نے اپنے عمل سے شاعری تخلیق کی ہے۔ یہ مختلف جنتوں کے راہ رو، ہومر اور بلھے شاہ کے قبیلے کے ہی لوگ ہیں۔ یہ انسان پرستی کی کوئی ڈاکٹرین نہیں بناتے، انسان پرستی پریکٹس کرتے ہیں۔ ادب انہیں ہی پروٹوٹائپ بنا کر سچ اور حسن کی پرکھ کرتا ہے۔ دنیا کا پہلا گیت لکھنے والے

زندگی کے حسن کو جس طرح دیکھا، میں اسے دیکھ نہیں سکتا، تضاد و تصادم کی صدیاں اور تاریخ کا جبر درمیان میں حائل ہے لیکن اقبال کا ایک شعر میں نے ہمیشہ سے اپنے کیسے میں رکھا ہوا ہے:

گفتند جہان ما آیا بہ تو سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

نطشے اسے اپنی زبان میں ٹرانسویلیوایشن آف آل ویلیوز (Transvaluation of oll values) کہتا ہے۔ کل کی دنیا میں فرد اور اجتماع کی آزادی اور بدلتی ہوئی دنیا کے خطرات ادب سے اسی مزاج کا تقاضا کرتے ہیں۔ ریئلزم، سرریئلزم، جدیدیت، مابعد جدیدیت، سٹرکچرلزم، نظم اور غزل کے تنازعے۔ یہ جمالیات اور ہیئت کے مسائل ہیں، ان پر بے شک بحث جاری رکھی جائے۔

مختار علی نیّر

ادب ازل سے لیکر آج تک ہر دور اور ہر زمانے میں انسانی معاشرے کی موثر اور متعین اکائی رہا ہے۔ عہد عتیق میں بھی اسے مذہب کا حصہ گردانتے ہوئے اعلیٰ اقدار کی روئیدگی، شرافت کی پہچان اور انسانیت کی جان سمجھا جاتا رہا ہے اور اس کا تقاضا تھا کہ انسان نے پہاڑوں اور درختوں سے اتر کر زمین پر مل جل کر رہنا سیکھا۔ اسی نے رشتوں کی پہچان کروائی اور حضرت انسان کو ادب کی اولین صفت حیا اور لحاظ سے روشناس کروایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ارتقاء میں ادب، مذہب کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے بلکہ مذاہب عالم کی تعلیمات میں ابتدا ہی سے ادب پیش پیش ہے۔ جمالی کیفیات میں اگر ادب کی چاشنی شامل نہ ہوتی تو اس کی ہیت، حالت اور معنی بدل جاتے۔ ادب ہر زمانے اور ہر عہد میں انسانی معاشرے کی تطہیر کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اجزائے کائنات کا اپنا فرض وقت کی پابندی اور بچے تلے انداز میں نبھانا بھی ادب ہی کی تو ایک قسم ہے۔ اس لیے تخلیق کائنات میں ادب ایک اہم جزو کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔

اس بات کا تعین محال ہے کہ ادب اپنی علیحدہ ہیت میں کب وجود میں آیا البتہ یہ یقینی امر ہے کہ انسانی اقدار اعلیٰ کی تمیز ادبی جذبے سے ہی ہوئی اور نیک و بد کی تمیز میں علیحدہ شکل اختیار کرتے ہوئے ادب نیکی کی علامت، حیا کا خزانہ اور شرافت کا منبع ٹھہرا لیکن مذاہب عالم کی تاریخوں میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ادب نیکی کی توضیحات و تشریحات اور ہر دور میں اس دور کے رائج عقائد کی ترویج و ترقی اور فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے اور بری سے بری بات میں بھی ذرہ بھر اچھائی کو اجاگر کرتا رہا۔ اس بات سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ ادب انسانیت کی ہی خشت اول ہے:

خشت اول چون نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

یہی بات ہے کہ ادب میں نیک جذبوں ہی کو ابھارا جاتا ہے، اچھے خیالات کو جلا دی جاتی ہے اچھی امیدیں وابستہ کر کے جد و جہد کی جاتی ہے۔ ہر زمانے میں انسانی ذہن کی ترقی، خیالات کی تبدیلی، علوم نو کا سامنا، ایجادات میں حیرت انگیز کارنامے، طب اور سائنس میں برپا انقلاب کا ادب نے خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہوئے گلے سے لگایا اور بنی نوع انسان کو قدرت کی نعمتوں سے آشنا کرانے کے لیے اپنی تحریک جاری رکھی۔

اب حضرت انسان نے اس دنیا پر قدم رکھا اور جنگلوں کی خاک چھاننا شروع کیا اور اکیلا بھی تھا تو اس وقت نہ تو اس کے پاس ادب تھا نہ مذہب کیونکہ جب انسانیت ہی نہیں تھی تو اس کی اقدار پر کیا بحث مگر جب ایک سے دو ہوا اور دو سے چار اور پھر

بے شمار، تو مختلف ذہنوں کے امتزاج سے جو شکل وصورت ہمارے سامنے آئی اسے ہی معاشرے کا نام دیا گیا۔ ارتقاء کی پہلی منزل کا نام دیا گیا۔ رشتوں کی پہچان کا زمانہ ٹھہرا۔ بڑوں کے احترام کا دور آیا۔ نیک اور بد کی تمیز کی کڑیاں بننے لگیں۔ آبادی کے پھیلنے سے وراثت کی اکائیاں بننے لگیں۔ علیحدہ علیحدہ رہ کر بھی آپس میں مل بیٹھنے کو جی چاہا۔ مصیبت کی اس گھڑی میں ایک دوسرے کے درد کو محسوس کیا، اپنے سرمائے کے تحفظ کا خیال دل میں جاگزیں ہوا۔ غرضیکہ تحفظات کے حوالے سے جنگل سے درختوں اور درختوں سے پہاڑوں پر رہنے کی ضرورت کا احساس ہوا اور پھر بے خوف ہو کر دوبارہ میدانوں میں رہنا سہنا اور اپنی حدود کی حفاظت کی فکر نے پریشان کیا تو کہیں جا کر حضرت انسان کی اصل شکل وصورت سامنے آئی۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ مندرجہ بالا کیفیات کو ماضی میں کتنا زمانہ دیں۔ ہزار، لاکھ، کروڑ سال یا پھر اس سے بھی زیادہ انسان کی یادوں بدلتی ہوئی شکلیں جن جذبوں کے تحت ترقی کی راہ پر گامزن رہیں ان میں سب سے بڑا جذبہ ادب ہی ہے جس کے پلنے کے لیے جس ودیعت کی ضرورت تھی، وہ انسان اپنے کلبوت میں ازل سے ہی لیکر آیا تھا۔ اس دنیا میں تو صرف تحریک کی دیر تھی۔ جب تحریک ملی، بیرونی اثرات نے دفاع کے لیے مجبور کیا تو انسان نے اس طاقت سے کام لینا شروع کیا جس سے ادب کے سرچشمے پھوٹتے ہیں اور اس تحفے کے بارے میں خداوند عالم کتاب مبین میں خود فرماتے ہیں، میں نے تمہیں اس دنیا میں بھیجا ساتھ عقل سلیم کے، جی ہاں یہی وہ عقل سلیم ہے کہ جس کے فرائض میں وہ سب کچھ شامل ہے جن کا ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں۔ اور ساتھ ہی دنیا میں حضرت انسان کی ادلتی بدلتی حالتیں کہ جن میں سدھار لانے کے لیے ادب ہر دور میں مختلف روپ دھار کر دنیا اور اس کے باسیوں کو رہنے کے لیے رنگ ڈھنگ کی ہدایات سے نوازتا ہے۔

جب انسان نے نباتات سے فائدہ اٹھانا سیکھا، حیوانات کو قابو میں لایا، زمین کا سینہ چیر کر لعل و جواہر کا مالک بنا، قدرت کے خفیہ رازوں کے ادراک کا طریقہ سیکھا تو اسے ہم نے ترقی یافتہ دنیا کہا اور اس ترقی یافتہ دنیا کے لیے ادب نے ہی ایسا معاشرہ ترتیب دیا کہ حضرت انسان ہر لمحے دنیا میں تبدیلی لاتا رہا۔ ادب ہی نے تو وقت سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ دیا۔ پھر دیئے سے دیا جلا، روشنی پھیلتی گئی، دنیا حسین بنتی گئی، عقل کے پہلے تحفے ادب کو بروئے کار لاتے ہوئے حضرت انسان نے دنیا کے ہر خطرناک سے خطرناک مرحلے میں سینہ سپر ہونا سیکھا۔ یاد رکھیے عقل کی بات بے پر کی نہیں ہوتی، عقل کا مشورہ بے ادبی اور گستاخی نہیں ہوتا۔ عقل سراپا علم ہے اور کون نہیں جانتا کہ علم ہی تو سراپا ادب کا نام ہے۔ انسان اس دنیا میں مختلف صورتوں سے جس طرح رہنے سہنے اور اس دنیا میں آکر اسے کیا کرنا ہے، اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جس جذبے اور جدوجہد کا سہارا لینا پسند کرتا ہے وہ اس کے اندر کا عظیم پرزہ عقل ہے جو ادل بدل کر اسے ہر زمانے میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ سکھاتا ہے، اگر یہ عقل کہ جس کا دوسرا نام ادب ہے اسے اس بحث میں سے نکال دیں تو پھر ہماری کائنات کے ہر پہلو میں ایسی تاریکی چھا جائے گی جسے جہالت کا نام دیکر آپ جان نہیں چھڑا سکیں گے۔

روز اول سے ہی خاص طور پر ہماری دنیا پر قدرت کی جو مہربانیاں ہوئیں ان میں اشرف المخلوقات پر قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان رہی کیونکہ اس نے عقل کے ذریعے ملے ہوئے حواس خمسہ سے کام لیا اور ادب سے پیار مانگا جس نے اسے دنیا ہی کیا پوری کائنات سے آگاہی دی اور اپنے علاوہ، اپنی دنیا کے علاوہ دیگر ستاروں اور سیاروں سے بھی واقفیت حاصل کی۔ عقل نے کہا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں اور ادب نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ آپ

نے دیکھا ادب نے انسان کی حالت بدلنے کا کیسا عظیم نسخہ پیش کیا کہ اگر دنیا بدلتی ہے تو پھر اپنے مقصد سے پیار کر کے اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے کچھ اور نہ سوچ۔ جو وہ مہربان جو گل و بلبل کو ہی ادب سمجھتے ہیں صراحی اور پیانے سے ہی رغبت کو ادب کہتے ہیں، وصال و فراق تک ادب کو محدود رکھتے ہیں وہ ادب کی اس قدیم اکائی سے واقف نہیں ہیں جو تخلیق کائنات کی شرط اول رہی ہے۔ شیطان کو اس اکائی کے ادب ہی کے لیے تو کہا گیا تھا وہ نہ مانا اور پھر جس زندان لعنت میں وہ گرفتار ہے اس سے حضرت انسان بخوبی آگاہ ہے کہ ادب ابتدائی طور پر "کن" کی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ مذاہب عالم جن سے مراد آفاقی نظام الانے والے ،خدا کا پیغام لانے والے اپنے پیغاموں میں ادب ہی کی تلقین کرتے ہیں اور جن انسانوں کو ہدایت ہو جاتی ہے تو پھر وہی اقوام ادلتے بدلتے معاشروں سے گزرتی ہوئی آج زندہ ہیں۔ ادب کو بروئے کار نہ لا کر جن اقوام نے کوشش کی دنیا میں زندہ رہنے کی ان کا نام و نشان تک نہیں رہا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

میں پہلے بھی عرض کرتا ہوں کہ حالت کو بدلنے کیلئے جن جذبوں کو بروئے کار لانا چاہیے جن اقدار کو اپنانا چاہیے ان میں سرفہرست اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے جو تحفہ دیا گیا ہے اسے ہم بلا شبہ ادب ہی کہیں گے۔ یہ عالمگیر حقیقت ہے کہ بے ادب بے مراد اور باادب بامراد ہی ہوتا ہے۔ انسان کی چھوٹی موٹی تبدیلی بھی ادب ہی سے فروغ پا کر تبدیلی کا احساس دلاتی ہے اور یہ امر واقعی ہے کہ جب انسان ادب کا دامن تھام لیتا ہے تو شعوری اور لاشعوری طور پر اس کی دنیا میں مثبت اقدار کا نزول ہوتا ہے اور زمانے کی طویل اور نہ ختم ہونے والی کہانی میں رنگینیاں ابھرآنے لگتی ہیں۔ اب چونکہ یہ طریقہ کار وقت کے ساتھ ساتھ خاموشی سے رواں ہے لہذا بعض اوقات بدلتی ہوئی دنیا میں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

تاریخ گواہ ہے کہ دنیا نے جو پلٹا کھایا اور جیسا پلٹا کھایا اور اس کی وجہ سے جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں ادب نے اپنی بنیادی خصلت کو نہ چھوڑتے ہوئے زمانے کے مطابق اول بدل کر حضرت انسان کی رہنمائی کی اور اسے اس عالم ناپائیدار میں چند روزہ حیات مستعار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے قابل بنایا۔ غرضیکہ دنیا کو خوبصورت بنانے والے حضرت انسان کو جنگلوں اور جہالت سے اٹھا کر تہذیب و تمدن سے آشنا کرانے والا یہی ادب ہے جو مختلف ادوار میں مختلف صورتیں اپنا کر انسان کو انسانیت کا شعور دیتا رہا، ادب ہر دور کے مذہب اور عقیدے میں اپنا حصہ بناتا رہا، ہر دور کے معاشرتی اصولوں میں حق و انصاف کے حوالے سے ادب اپنا فرض ادا کرتا رہا کیونکہ ادب ہی تو انسانیت کا جزو اعظم ہے۔ ادب کے بغیر انسانیت نامکمل ہے اور انسانیت کے بغیر نیک معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔ یہ نیکی بدی کے ٹکراؤ کا شعور بھی ادب ہی کی مرہون منت ہے ورنہ انسان اب تک جنگلوں پہاڑوں کا باسی ہوتا اور دوسرے جانوروں کی طرح ان میں مل جل کر زندگی گزار رہا ہوتا۔ فرق صرف اتنا ہوتا کہ حضرت انسان حیوان ناطق ہوتا مگر ادب نے ہر دور اور ہر بدلتی حالت میں انسان کو دعوت دی کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اسی پہچان نے اسے دوسری مخلوقات سے الگ کیا اور اشرف المخلوقات کے اعزاز کے قابل بنایا اور دنیا پر حکمرانی کے خیالات سے معمور کیا جس کی صورت آج ہمارے سامنے ہے۔

آسمانی کتابیں اور صحائف کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیا ان میں بے ادبی سکھائی گئی ہے نہیں بلکہ مذہبی حوالے سے دنیا کی ادلتی بدلتی تصاویر کی یادگاریں ہیں جو ان صورتوں میں تبدیلی لیکر نازل ہوئیں۔ حمورابی کا قانون بھی بگڑے ہوئے

معاشرے کو نیک معاشرے کی صورت میں لانے کی ایک ادبی کاوش ہے۔ تابوت سکینہ بھی بدلتی ہوئی دنیا میں ادبی نوادرات کا مجموعہ ہے۔ میثاق نامہ عہد عتیق بھی قدیم ادب کی یادگار ہے۔ اقوام عالم کا مل بیٹھنا بھی ایک قسم کی ادبی کاوش ہے کہ اس میں عنوان بنی نوع انسان کا تحفظ اور خدمت ہے۔ غرضیکہ ہر وہ بات جس میں نیکی کا عنصر پایا جائے وہ ادب کی ہی ایک صورت ہے اور بدلتی ہوئی دنیا میں ادب نیکی کردار کا مجموعہ ہے۔ ادب ہی وہ ہمدرد لوگ پیدا کرتا ہے جو دنیا میں بھلائی پھیلاتے ہیں، ثقافت کے علمبردار ہوتے ہیں، انسانیت کے محافظ ہوتے ہیں، معاشرے کی تطہیر کا باعث بنتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ نیکی کا مجسمہ ہونے کے حوالے سے ہر برائی کے آگے سینہ سپر ہوتے ہیں اور یوں معاشرے کا توازن بگڑنے نہیں پاتا۔ اس کی اکائیاں اپنے ماحول کو اس انداز سے برقرار رکھتی ہیں تاکہ قبائل کی آپس میں تمیز ہو سکے۔ اب چاہے بدلتی ہوئی دنیا کی انسانیت کا تقاضا، نیک و بدکی پہچان ہو، خیر و شر کا معاملہ، دن رات کی تمیز ہو کہ سورج اور چاند کی انسانی زندگی میں اہمیت و افادیت، جوان دلوں کے فسانے ہوں کہ موت و حیات کی کشمکش، جو باادب ہو بامراد ہوا۔

جی چاہتا ہے کہ ایک خوبصورت سی قدیم مثال ادب کے حوالے سے پیش کروں۔ حضرت علی علیہ السلام سے ایک صحابی نے پوچھا، یا علی میرا سلام ہو اور ساتھ ہی سوال ہے کہ دنیا کی ہر چیز اگر جمع کرتے رہیں تو ایک دن پہاڑ بن جائے گا۔ یعنی بڑھتے دن بڑھتی ہی رہے گی۔ مگر یہ عمر ہے کہ ہر لمحے گھٹتی ہی جاتی ہے۔ کیا اس کو بھی ذخیرہ کیا جا سکتا ہے، کیا یہ عمر بھی بڑھ سکتی ہے؟ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔ ہاں کیوں نہیں۔ صحابی بولا تو پھر بتایئے کیسے؟ آپ نے فرمایا "جس نے دنیا سے کام لیا ادب کو بروئے کار لایا، مودب ہو کر بڑے بزرگوں کی بات پر کان دھرا، ان خداوند عالم اس کی عمر میں برکت دیتا ہے اور جس نے ادب کا دامن چھوڑا، بدلحاظی، گستاخی اور بے حیائی کو اپنایا اس کی عمر تیزی سے گھٹتی ہے" بس چاہیے کہ ہر حال میں ہر پہلو سے ہر لمحے کو ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ زندگی کی راہ کے ہر موڑ پر اس کے بغیر کامیابی ناممکن ہے یوں ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہر دور میں ادب کا کردار بے مثال رہا ہے اور اس کے ہونے سے دنیا ہزاروں سالوں کا سفر طے کر کے کائنات کا دل بنی ہوئی ہے۔

دنیا ہمیشہ ادلتی بدلتی رہی ہے تغیر و تبدل کا یہ سلسلہ روز اول سے ہی جاری ہے۔ حضرت انسان کا ذہن جتنا وسیع ہوتا جاتا ہے کائنات کے سربستہ راز بھی تسلسل سے سامنے آ رہے ہیں۔ لہٰذا ادب کی ذمہ داریاں کچھ بڑھ گئی ہیں اب گل و بلبل اور مینا و جام کے ساتھ کائنات کی کھوج اور اصلیت کو جاننا بھی ادب کا حصہ بن چکا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس قدر تیزی سے اپنے چکر کو پورا کرنے والی بدلتی ہوئی دنیا بڑی ہنگامہ خیز بھی ہے اور کسی حد تک بے حس بھی اور یہ بے حسی ادب کی دنیا میں کبھی کبھی بے ادبی کی صورت بھی اختیار کر جاتی ہے لیکن خیر اب تو اس بے ادبی کو بھی ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ قدیم و جدید تہذیبوں کا سنگم کبھی کبھی کچھ نہ کچھ رنگ لاتا ہے اور ادب اب بھی آج کل کے خیالات و افکار میں ڈھل کر اپنی تحریک جاری رکھے ہوئے ہے لیکن نئی نسل کو رعایت دیتے ہوئے اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم عہد میں ادب کا جو کردار ہوا کرتا تھا آج اس سے کئی گنا زیادہ ذمہ داری اس پر لازم ہے۔ البتہ ایسی بے ادبیاں کہ جن کو ادب کا نام دیا جاتا ہے اس سر دردی کو بھی ادب میں برداشت کرنا ہوگا۔

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

ڈاکٹر سلیم اختر

جہاں تک بدلتے معاشرہ میں ادب کے کردار کا تعلق ہے تو یہ کوئی آج کی بحث نہیں بلکہ یہ بحث اتنی پرانی ہے جتنے افلاطون اور ارسطو۔ یہ افلاطون تھا جس نے ادب و شاعری اور فنون لطیفہ کے اخلاقی جواز کو چیلنج کیا۔ بچوں کی نصابی کتب حتیٰ کہ لوریوں تک کو سنسر کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور شاعروں کو اپنی "جمہوریہ" سے جلاوطن کر دیا۔ افلاطون نے اچھا کیا یا برا اس بحث میں الجھے بغیر اس امر پر زور دیا جا سکتا ہے کہ اس انداز نظر کو تقویت اس مفروضہ سے ملتی ہے کہ معاشرہ میں مروج اخلاقی اقدار اور مسلمات مطلق ہیں جبکہ ادب و شاعری اور فنون لطیفہ اضافی ہیں۔ لہٰذا اضافی مطلق کے زیر معیار رہے۔ وہی مجہولی اور مزدوروالی پرانی مثال۔

سوال یہ ہے کہ ادب کو کیوں معاشرتی معیار کی کسوٹی پر رکھتے ہوئے معاشرہ کے لیے مفید یا ضرر رساں ہونے کا فتویٰ صادر کیا جائے اور اسی سے پیوستہ یہ سوال کہ فتویٰ ساز کو کس نے یہ حق دیا کہ وہ کسی تخلیقی شخصیت کی تخلیقی فعلیت کی جانچ کے لیے کسوٹی قرار پائے اور اس امر کا تعین کرے کہ یہ تحریر، شعر، تصویر، فلم معاشرہ کے لیے ضرر رساں ہے لہٰذا اسے مسترد کر دیا جائے۔

اگر ایسا فیصلہ ادبی ناقد یا وہ شخص کرے جسے ادب و شعر اور فنون لطیفہ کی جانچ کی مہارت حاصل ہو جس نے تخلیق، تخلیقی عمل اور ان سے وابستہ مسائل و مباحث کے سمجھنے میں بسر کی ہو تو صرف ایسا شخص ہی اس طرح کا فیصلہ کرنے کا اہل ہے اور وہ بھی صرف ادب و شعر کی فنی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی حد تک، اس شرط کے ساتھ کہ اس فیصلے کا ادبی جمالیات کے تقاضوں کے تابع ہو سکے۔ اخلاق سدھار کے لیے نہیں، معاشرتی معیار و اقدار اگر ژرف نگاہی سے اور غیر جذباتی ہوئے بغیر اس پر غور کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ معاشرہ کے معیار و اقدار کو ثبات نہیں یہ نہ صرف یہ کہ ہمیشہ متغیر رہے بلکہ بدلتے سیاسی حالات، جنگوں اور نظریات و تصورات کے باعث بعض اوقات تو ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ معاشرتی اقدار و معیار خارج سے نافذ ہوتے ہیں اور مذہب و اخلاق سے ان کا جواز فراہم کیا جاتا ہے جبکہ ادب کے اپنے معیار و اقدار ہوتے ہیں جو معاشرے میں مروج جمالیات سے متاثر تو ہو سکتے ہیں مگر ان کا معاشرہ کی اخلاقیات کے تابع ہونا ضروری نہیں۔ ادب اعلیٰ شخصیات کے اس تخلیقی عمل کا ثمر ہے جو صرف ان ہی سے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ ذاتی ہے اور باطن کا چمتکار، جبکہ معاشرہ محض افراد کا اژدہام ہوتا ہے۔ ادیب کیونکہ معاشرے میں زیست کرتا ہے، اور ناپسندیدگی کے باوجود معیار و اقدار کی پابندی بھی کرتا ہے، اب یہی نہیں بلکہ اسے قاری بھی اپنے معاشرہ ہی سے ملتے ہیں۔ لہٰذا اس کے ادب نے اسی معاشرہ میں فروغ پایا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ ادیب کو ادبی حیات

بھی اپنے ہی معاشرے میں میسر آتی ہے۔ معاشرہ، ادیب اور ادب کی صورت میں جو مثلث تشکیل پاتی ہے اس میں سے کون سا زاویہ سب سے زیادہ مستحکم ہے اور کون سا زاویہ کمزور ہے؟ تو اس اصول کا قطعی جواب دینا آسان نہیں کہ تینوں ہی باہم مربوط ہیں اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو مولانا حالی نے سب سے پہلے مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری اور سوسائٹی کی باہمی اثر پذیری کے ضمن میں اس امر پر زور دیا تھا کہ بری سوسائٹی کی وجہ سے شعراء بگڑتے ہیں پھر ان کی بری شاعری سوسائٹی میں مزید بگاڑ پیدا کرتی ہے جس کے زیر اثر شاعری اور بری ہو جاتی ہے اور یوں بھی vicious circle کی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حالی کے اس تجزیہ کی اساس معاشرہ میں مروج اخلاقیات پر استوار تھی مگر انہوں نے مروج اخلاقیات کی گہرائی میں جا کر تجزیاتی مطالعہ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ انہوں نے اس کے مسلمات کو چیلنج کیے بغیر ظاہری صورت ہی میں قبول کر لیا۔ دراصل اسی رویہ کی وجہ سے ہی سب سے بڑا غلط مبحث جنم لیتا ہے کہ مروج اخلاقی معیار و اقدار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ان کی چھان پھٹک نہیں کی جاتی اور ان کی بنیاد کو چیلنج نہیں کیا جاتا۔

ان کے منفی پہلو واضح بھی ہوتے ہیں لیکن بزرگوں کی روایات کے نام پر انہیں قبول کر لیا جاتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ بزرگ کون تھے؟ مردہ بزرگوں کی مردہ روایات زندہ افراد کے لیے کردار و عمل کا معیار کیسے قرار پا سکتی ہیں؟

معاشرہ کسی کو کچھ نہیں دیتا لیکن قدغنوں کی صورت میں وہ جس منفی صورتحال کی آبیاری کرتا ہے وہ ادب، شعر اور فنون لطیفہ کی تخلیق سے وابستہ آزاد تخلیقی عمل میں مزاحم ہوتی ہے اس پر مستزاد یہ امر کہ ہم بے حد منافق معاشرہ میں زیست کرنے پر مجبور ہیں اس لئے ہمارے ذہن، زبان، قلم اور دل میں باہم موافقت نہیں ملتی۔ تخلیق کا یہ چار کھونٹ ہی ہے لیکن تخلیق کا گل بکاؤلی تو پانچویں کھونٹ میں ملے گا۔ پانچواں کھونٹ تو ادیب کے باطن میں ہے جہاں کی سیر کے لیے فقط اسم اعظم درکار ہے مگر ہم اسے فراموش کر چکے ہیں۔

مجھے دیگر ممالک کا تو علم نہیں مگر ہمارے پاس تو ادیب گویا سوپ کی طرح ہوتا ہے۔ مذہب، رسوم و رواج، اخلاق، قدغن، الغرض ادیب اور اس کے ادب کی پرکھ کے لئے ہر وہ معیار اپنایا جاتا ہے جس کا ادب سے وابستہ تخلیقی عمل، ادیب کی نفسیات اور اسلوب کی جمالیات سے کسی طرح کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک انتہاء پر عمران، دوسری انتہا پر ملا ادھر کنواں ادھر کھائی۔ جدید طرز احساس کا حامل آزاد طبع ادیب معاشرہ کے ساختہ معیاروں سے خود کو باآسانی ہم آہنگ نہیں کر سکتا۔ ادب کیا ہو؟ اس امر کا تعین معاشرہ کے برعکس خود ادیب کو کرنا چاہیے۔ ادب کی پرکھ کا حق ادبی نقاد کو حاصل ہے کسی بنیاد پرست کو نہیں میں یہ تو نہیں کہتا کہ ڈپٹی نذیر احمد آج کی اصطلاح کے مفہوم میں بنیاد پرست تھے لیکن ان کی اصلاح پسندی ادب کو بھی "توبۃ النصوح" کی سطح تک لے آئی تھی۔ اردو کا پہلا ناول نگار "گندے اور ناپاک" ہونے کی وجہ سے ناولوں کو پسند نہ کرتا تھا چنانچہ "رویائے صادقہ" میں یوں لکھا:

"یا بڑی فضیلت پناہ لیاقت دستگاہ ہوئیں تو ناول یعنی قصہ کہانی کے ڈھکوسلے بانکنے لگیں اور قصے بھی گندے اور ناپاک

"توبۃ النصوح" میں نذیر احمد نے کشمکش کی تصویر کشی کی ہے۔ نصوح کا بگڑا بیٹا کلیم باپ سے جھگڑ کر گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اس کے بعد بیٹے کا کتب خانہ دیکھتا ہے تو بقول نذیر احمد:

''مجبوٹے قصے، بے ہودہ باتیں فحش مطالب، بے مضمون، اخلاق سے بعید، حیا سے دور اور فصوح ان کتابوں کی جلد کی عمدگی، خط کی پاکیزگی، کاغذ کی صفائی، عبارت کی خوبی، طرز ادا کی برجستگی پر نظر کرتا تو کلیم کا کتاب خانہ اس کو ذخیرہ بے بہا معلوم ہوتا مگر معنی و مطالب کے اعتبار سے ہر جلد سوختنی اور دریدنی تھی۔''

کیا کچھ نذر آتش ہوا فہرست ملاحظہ فرمائیے:

''کلیات آتش، دیوان شرر، دوامو خت امانت، فسانہ عجائب، گل بکاؤلی، آرائش محفل، مثنوی میر حسن، مضحکات خان عالی منتخب غزلیات جرأت، ہزلیات جعفر زٹلی قصہ ہجویہ مرزا محمد رفیع سودا، دیوان جان صاحب، بہار دانش با تصویر، اندر سبھا، دریائے لطافت میر انشاء اللہ خان، کلیات رند اور دیوان نظیر اکبر آبادی''

ان میں سے ایک دو کتابوں سے قطع نظر'' تمام کتابیں نہ صرف یہ کہ کلاسیکی ادب کا سرمایہ ہیں بلکہ ہماری جامعات کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب نے انشاء کی ''دریائے لطافت'' کو بھی جلا ڈالا۔ انہوں نے نام سے اندازہ لگاتے ہوئے اسے مجموعہ لطائف جانا ہوگا جبکہ یہ تو (اب تک کی تحقیق کی روشنی میں) اردو زبان میں لسانیات کی اولین کتاب ہے مگر انہوں نے لطافت کو ''کثافت'' جانا کہ انشاء سے بھلا اور کس بات کی توقع ہو سکتی تھی۔ سیدھی سی بات ہے اگر آتش'' نذر آتش ہو سکتا تھا تو دریائے لطافت کیوں نہیں جو انہیں دریائے معاصی نظر آتی ہوگی لیکن زمانہ بڑا ظالم ہے جو سلوک نذیر احمد نے ادب کے ساتھ محض لکھنے کی حد تک روا رکھا ان کے ساتھ عملاً ایسا کیا گیا کہ ازواج مطہرہ پر ان کی تالیف امہات الامہ دہلی کے چوک میں نذر آتش کی گئی۔ کچھ عرصہ بعد پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' بھی بحق سرکار ضبط کر کے جلا یا جاتا ہے، مثنوی ''زہر عشق'' کی اشاعت ممنوع قرار پاتی ہے اور ''انگارے'' بھی۔ منٹو اور عصمت پر مقدمات! آج ہم ان کے مطالعے کے بعد یہ سوچتے ہیں کہ ان میں کیا خرابی تھی؟ کیا یہ محض طہارت پسندی کا نشانہ بنے یا واقعی ان سے اخلاق خراب ہو سکتے تھے اور پھر اس سے پیوستہ سوال اور کیا واقعی اخلاق کچے دھاگے جیسا ہوتا ہے جو کسی فلم، افسانہ یا ناول سے فوراً ہی خراب ہو جاتا ہے۔

شکر ہے کہ اب معاشرہ بگاڑنے اور اخلاق خراب کرنے کی ذمہ داری فلم اور ٹیلی ویژن نے سنبھال لی ہے اس لئے ملا لوگوں کو اب گھر گھر عریانی اور فحاشی کا سیلاب نظر آتا ہے۔ سو اس سیلاب کے نتیجہ میں ادب اور ادیب کی جان بخشی گئی۔ بڑے شر نے چھوٹے شر کو کم اہم ثابت کر دیا۔ ہر معاشرہ کی اخلاقی اور اس سے جنم لینے والی سیاسی، سماجی اور قانونی بنیادیں ہوتی ہیں جو اقدار و معیار اور اداروں کی صورت میں معاشرہ پر اثر انداز ہوتی ہیں مگر ہم عہد منافقت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے ہمارے معیار اور اقدار ہمارے اعمال سے رنگ اثبات حاصل نہیں کرتے۔

ادھر آزاد تخلیقی لعلیت کا حامل ادیب بنیادی طور پر (Non conformist) یعنی عدم مفاہمت پسند ہوتا ہے، دراصل عدم مفاہمت پر مبنی تخلیقی رویہ بھی ادب کا معاشرتی کردار اور ادیب کی سماجی کمٹمنٹ کا مظہر ہوتا ہے۔ ہر دور کے معاشرہ کے مطالبات اور ان کی تکمیل کے لیے ترغیبات و تحریصات تبدیل ہوتی رہتی ہیں لیکن عدم مفاہمت پسند رویہ اپنی اساس میں پائیدار اور استوار رہتا ہے۔ ادھر ادب اس کا مظہر قرار پاتا ہے۔

معاشرہ مستحکم ہو تو اسے ادب یا کسی بھی چیز سے خطرہ محسوس نہیں ہو سکتا۔ یعنی بے بنیاد معاشرہ خوفزدہ معاشرہ ہوتا ہے۔

خوف چیزوں کو ان کے حجم سے بڑا دکھا کر خوف میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں معمولی نوعیت کے مباحث کے نتیجہ میں بھی اسلام خطرہ میں پڑ جاتا ہے، دوقومی نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے اور ملک کا مستقبل مخدوش ہو جاتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ادیب اور اس کا ادب آزاد تخلیقی فضا میں قلم کاری کرے تو معاشرہ کو اپنے خوف اور فوبیوز ختم کرنا ہونگے ہم سارتر اور ڈیگال کی مثال دیتے ہیں مگر ڈیگال جیسا ظرف کتنے حکمرانوں میں ہوگا؟ اس پر کبھی غور نہیں کرتے۔

ٹرائے کی دس سالہ طویل جنگ نے جن ہیروز کو جنم دیا اور واقعات کو شہرت دی ان میں نسبتاً ایک غیر معروف کردار فیلو طیطس کا بھی ہے جس کے ایک پھوڑے کے تعفن سے اس کے ساتھی اتنے عاجز آ گئے کہ اسے ایک جزیرے میں بے یار و مددگار چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جنگ میں ایک ایسا موقع آتا ہے جب فتح حاصل کرنے کے لیے فیلو طیطس کی طلسمی قوتوں کی حامل شمشیر کی ضرورت پڑتی ہے تب یونانی اس کے پاس جاتے ہیں، گزشتہ رویہ کی معافی مانگتے ہیں اور پھوڑے کا تعفن گوارا کرتے ہوئے اسے ساتھ لے جاتے ہیں اور اس کی تلوار کی مدد سے فتح حاصل کرتے ہیں! معاشرہ اور ادب وادیب کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے اگر معاشرہ بے روح اور جامد نہیں اور اسے اپنے جمال اور جمالیات کی ضرورت ہے تو پھر اسے ادب اور ادیب کو بھی گوارا کرنا پڑیگا..... ان کے تعفن سمیت۔

ارباب یوسف رجا چشتی

اس موضوع پر بات کرنے سے پہلے مرحلۂ فکر میں ذہن کے مطلع پر تین الفاظ روشن نظر آتے ہیں جنہیں خصوصی توجہ چاہئے ہیں۔

۱۔ بدلتی ہوئی دنیا

۲۔ ادب

۳۔ کردار

لہٰذا اپنی گفتگو کو اسی ترتیب سے مربوط کر کے موضوع متعلقہ کو جانچنا مناسب ہوگا اور یہ موضوع فی الحقیقت ایک دو نوک سوال ہے جنہیں بدلتے ہوئی دنیا میں ادب کا کردار کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے شاید یہ بھی کہ یہ کردار کیا ہو سکتا ہے؟

پہلے ہم "بدلتی ہوئی دنیا" کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ویسے تو دنیا مختلف حوالوں سے ہر لحہ بدل رہی ہے، سائنسی تجربات ہر لحہ علم و فکر کے نئے نئے دریچے کھول رہے ہیں اور سائنسی ایجادات اپنے منافع و مناقص کے اعتبار سے انسانیت کو ششدر و مبہوت کئے ہوئے ہیں۔ ایک لمحہ انسان کو مثبت ایجادات کے باعث واطمنان و ابتہاج بخشتا ہے تو دوسرا لمحہ تباہ کن ایجادات اور مہلک ہتھیاروں کی وجہ انسان کو ششدر بلکہ رہین تخوف کئے ہوئے ہے۔ ایک خوف آفریں سامان تجیر اسلامی دنیا کی سائنسی دور میں پسماندگی ہے۔ اسلام جو کہ مذہب انسانیت ہے، اس کائناتی ماحول میں انسانیت کے لئے سب سے زیادہ متفکر ہے لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ اہل اسلام اس سے بے نیاز و بے خبر ہیں۔

ادب اور اسلام میں قدر مشترک یہ مقدس حقیقت ہے کہ اسلام پوری انسانیت کی فلاح و بہبود اور امن و سلامتی کو یقینی بناتا ہے جبکہ ادب پوری انسانیت کے لیے امن و سلامتی چاہتا ہے اور میرے عقیدے میں تو اگر ادب امن و سلامتی اور ارتقائے خواص انسانیت کا داعی نہیں تو وہ ادب نہیں اور اگر ادب جنگ وجدل کی دنیا ڈھونڈتا ہے تو وہ انسانیت کا قاتل ادب نما ہو سکتا ہے، ادب نہیں۔ یہاں میں ابتدائی طرف ایک بار پھر واپس آ کر پہلے مسئلے پر دعوت فکر دیتا ہوں۔ جنہیں ہم بدلتی ہوئی دنیا سے کیا سمجھتے ہیں۔

دنیا کے نا ملے بدلنے کیلئے ایک عام اور معروف لفظ تو انقلاب ہے لیکن دنیا کی سیاسی تاریخ میں یہ لفظ اتنا زیادہ اور اتنے تواتر سے استعمال ہوا ہے کہ اپنی روح سے عاری ہو چکا ہے اور ادب بدلتی ہوئی دنیا میں زیادہ معروف ہو چلا ہے۔ اسے بدقسمتی

سے اس بدقسمت دن سے منسلک کر دیا گیا ہے جب اہل پاکستان اپنے عظیم قائد کے یوم وفات میں ان کی روح کے ایصال ثواب کے لیے دنیا میں مصروف تھے کہ صدی کی مہیب ترین سازش بروئے کار آئی اور مرکز تجارت عالمی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو تباہ کر کے اسے مسلمانوں اور خصوصاً القاعدہ کی کارستانی قرار دیا گیا۔

اور اس منحوس واقعے کو بش نے صلیبی جنگ (بقول جارج بش) کا جواز بنایا اور افغانستان سے فارغ ہو کر عراق کو تباہ کیا اور اب ایران پر الزامات کی بوچھاڑ کر کے حملے کے جواز پیدا کرنے کی کوشش میں ہے جبکہ البرادی کہہ رہا ہے کہ ایران میں کوئی ایٹمی ہتھیار نہیں ملے۔ یہ وہی بہانہ ہے جو عراق پر استعمال کیا گیا اور عراق کی تباہی کے بعد بھی کوئی ثبوت ہاتھ میں نہ آیا جو تباہ کن ہتھیار کی تعریف میں آ سکے۔ یہی رٹ ایران کے متعلق جاری ہے اور ہر مسلمان ملک کے خلاف یہ الزام دہرا کر اسے تباہ کرنے کا جواز بنانے کی کوشش جاری ہے چنانچہ ایران کے بعد شام، سعودی عرب، مصر اور خدانخواستہ پاکستان اور تمام مسلمان ممالک امریکہ سے خطرہ محسوس کرنے میں حق بجانب ہیں لیکن بدقسمتی سے تاریخ کے انتہائی نازک بلکہ خطرناک موڑ پر اتحاد کی ضرورت کا احساس نہیں کرتے جبکہ قرآن کریم نے **اعتصمو و بحبل الله جميعاً و لاتفرقو** کا واضح حکم دیا ہوا ہے لیکن سب مسلمان ممالک تفریق اور باہمی اعتماد کے فقدان کا شکار ہیں۔

ایک انفرادی اسلوب کا ادب اس قسم کے حالات میں اقبال کے قلم سے تخلیق ہو کر اپنی اہمیت واضح کر چکا ہے بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ادیب اپنا فرض پہچانے اور اس کا احساس کرے کہ ایک ایک عمل دنیا کے سامنے اور خصوصی طور پر دنیائے اسلام پر واضح کرے اور یہ جو دنیا کا جغرافیہ تبدیل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے اس کا احساس جملہ انسانیت کو دلانا ادیب کا فرض ہے کہ تاریخ جب کروٹ لیتی ہے تو وہ جغرافیے کو توڑ پھوڑ دیتی ہے جو عموماً انسانیت کی قوت انجذاب کے لیے سخت امتحان کا مرحلہ ہوتا ہے۔

اب آیئے ادب کی طرف۔ یہاں پہنچ کر ذرا ٹھہرتے ہیں اور ادب کی پہچان کی کوشش کرتے ہیں۔

عمومی معروف طور پر تو ادب سے مطلب افسانہ و تنقید لیا جاتا ہے جبکہ شاعری کو ادب کا ساتھی کہا جاتا ہے۔ ادب کا حصہ نہیں کہ عموماً لٹریچر کے معنی شعر و ادب کئے جاتے ہیں گویا شعر، ادب کا حصہ نہیں، رفیق یا رقیب ہے حالانکہ شاعری بھی ادب ہی ہے۔

مناسب ہوگا اگر ہم لغات سے ادب کی تعریف پوچھیں۔

تقریباً سب اچھی لغات ادب کے معنی بہت وسیع مطالب کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ مثلاً

1 ۔ادب :۔ ہر شے کا انداز داور حد نگاہ رکھنا، اچھی روش، قاعدہ ، سلام، ایک علم جس کے جاننے سے کسی زبان کے بولنے میں لغزش اور خطا واقع نہیں ہوتی ۔ تمیز، شائستگی، دستور، قاعدہ، حفظ مراتب، علم زبان جس میں صرف و نحو، لغت، عروض انشا و معانی اور بیان وغیرہ داخل ہیں۔

۲۔ غیاث اللغات میں ادب کی تعریف یوں ملتی ہے۔

"انداز ہ وحد ہر چیز نگاہ داشتن، و بمعنے دانش و طور پسندیدہ و علوم عربیہ۔"

اسی ناتے سے غیاث اللغات ادیب کو جو معنی دیتی ہے وہ بھی جامع کے علاوہ دلچسپ ہیں، یعنی

۳۔ آداب جمع ادب و بمعنے علم عربی و ایں را ازاں ادب می گویند کہ بدیں نگاہ داشتہ می شود خود را از خلل در کلام عرب، و آں دوازدہ قسم است، علم لغت، علم صرف، علم اشتقاق، علم نحو، علم معانی، علم عروض، علم قافیہ، و ایں ہشت اصول اند و علم رسم الخط و علم قرض الشعر، و آں علمست کہ امتیاز کردہ میشود بداں میان شعر ے کہ سالم از عیوب است یا غیر سالم از عیوب است و علم انشا منشآت و خطب و رسائل، و علم محاضرات یعنی علم تواریخ و مانند آں و ایں چار فروع اند (از منتخب)

ویسے اگر مختصر ترین اور سادہ ترین تعریف ادب کی کی جائے تو کہا جا سکتا ہے ایسی با صلاحیت دلکش تحریر جو قاری کے ذہن اور دل کو متاثر کر کے اپنا ہمنوا بنائے۔

ہمارے برصغیر میں بدلتے ہوئے حالات کا محور پاکستان اور بھارت کے بیچ امن کی مساعی ہیں جو آج کل "کاتا اور لے دوڑی" کی صورت لئے ہوئے ہیں اور اس میں جذبات کی تیز یہ کیفیت ٹی وی مباحثوں اور ٹی وی ڈراموں سے اٹی پڑی ہے۔ لیکن اس تیزی سے انس و محبت کی دوڑ لگاتے ہوئے حد فاصل کا تعین نظر نہیں آتا۔ مثلاً بھارت کا ہندو نوجوان پاکستان کی مسلمان لڑکی سے محبت کرتا ہے جو شادی پر منتج ہوتی ہے صرف یہ موضوع فلسازوں کے لیے پسندیدہ ترین ہو گیا ہے لیکن مجھے اس کی عمر کم تکتی ہے۔ قوموں میں محبت اور بھائی چارہ اچھی بات ہے لیکن رومانس اور شادی کے علاوہ بھی اس موضوع کی اہمیت اجاگر کی جا سکتی ہے بشرطیکہ آئیڈیالوجی زخمی نہ ہو اور اس دور میں سوچ سمجھ اور فراست کی ضرورت ہے کہ سیواجی اور افضل خان کی کہانی تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اب ہندوستان اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ وطن رہ کر بھی انسانیت کے ناتے خوشگوار تعلقات کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اس لئے کہ ادب کا کوئی وطن نہیں۔ ادب صرف کائنات کا باسی ہے اور کائنات کو خوش اور مامون دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ اقبال کی سنیئے:

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ادب قوم، رنگ و نسل، قبیلے، خاندان وطن گروہ بندیوں سے بے نیاز و ماورا ہے۔
ادب کی تخلیق انسانیت کی مثبت اقدار اور صالح انسانی جذبات کی مرہون منت ہے۔

ایک عرصہ ہوا اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے منعقدہ ایک سیمینار میں ادیب اور مملکت کے موضوع پر کئی نامور ادبا اور اساتذہ ادب نے مقالات کے ذریعے اپنے وقیع خیالات کا اظہار کیا تھا جن میں مملکت کا مطلب اپنی مملکت یعنی پاکستان سمجھ کر زیادہ تر اس بات پر بحث مرکوز رہی کہ اپنی مملکت سے ادیب کا تعلق اس کا رویہ اور اس کے فرض کی نوعیت کیا ہے اور کیا ہونی چاہیے۔ اس سے مقصد ایک ہی سوچ پیدا کرنے کی سعی تھی کہ ہمارا ادیب اپنی مملکت کے ناتے اگر اپنے فرائض کما حقہم ادا نہیں کر رہا تو اسے اس کا احساس دلایا جائے۔ وہ اگر ادا کر رہا ہے اور اس کا عرفان مملکت یا اعیان مملکت کو نہیں تو ان پر اظہار حقیقت کر کے ان کے احساس فرض کو جھنجھوڑا جائے۔

مذکورہ سیمینار میں پروفیسر فتح محمد ملک نے ایک دلچسپ حقیقت کا ابتداہی میں اظہار کرتے ہوئے کہا تھا
"قیام پاکستان سے پہلے ہم جس وطن کے باسی اور جس مملکت کے شہری تھے پاکستان اس وطن اور اسی مملکت کی نفی سے وجود میں آیا ہے۔ ہمارے ادیبوں کی غالب اکثریت تحریک پاکستان سے اتعلق تھی اس لئے اس کے نزدیک پاکستان کا قیام

بھونچال کی مثال تھا۔" (ادیب اور مملکت ادبیات)

پروفیسر فتح محمد ملک نے منٹو کے مضمون زحمت مہر درخشاں کا حوالہ دیا تھا جس میں منٹو نے اپنے اور ندیم صاحب اور ساحر سے ملاقات کے بعد ان کے ذہنی انتشار کا باعث بننے والے بھونچال کا اظہار کیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ دونوں مرحومین (منٹو اور ساحر) کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ منٹو کی الجھن دور ہوئی یا قائم رہی۔ ساحر لدھیانوی سے چند دن میری ملاقات رہی لیکن وہ چونکہ مہمان تھے اور میں ذہنی طور پر اس مقام سے بہت دور تھا اس لئے ساحر نے پشاور سے وقت رخصت ٹرین میں بیٹھتے ہوئے مجھ سے یوں گلہ کیا کہ آپ کے خلوص سے ہم کچھ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ شاید یہ اس لئے کہ احمد فراز، محسن احسان، شاہد نصیر، محمد حسین عطا، اور مقصود زاہدی ان کے ہمنوا ہو گئے تھے اور مجھے ذہنی اختلاف کے باعث ان سب نے ملا کا خطاب دے رکھا تھا۔

آج اس الجھن سے بچتے ہوئے اس موضوع کو سمجھنے کے لیے آسان یوں کہنا ہوگا کہ ہم انسانیت کے ناتے ادیب کے کردار پر فکر مرکوز کریں کیونکہ ادب کا کردار فی الحقیقت ادیب کے کردار کا عکس ہوتا ہے۔

ادیب کو خداوند کریم نے احساس کے دانش اور فراست کی ایسی عجیب دولت عطا کر رکھی ہے کہ وہ مستقبل میں بہت دور تک جھانک سکتا ہے اور ہمارے ایک ادیب نے مستقبل کے امکانات کے متعلق شکوہ کیا ہے جو فی الحقیقت ایک تنبیہ ہے۔

"ہمیں پاکستان کے ادب زادوں سے گلہ ہے کہ ان سے پھر کوئی اقبال نہ اٹھا جو یہ سمجھا اور سمجھا سکے کہ تصور پاکستان (اپنی مملکت) سے انحراف کی راہ ، اکھنڈ بھارت پر جا کر ختم ہوتی اور یہ وہ مقام ہوگا جہاں ہماری فنی اور تخلیقی شخصیت اپنے تمام تر حسن سمیت فنا ہو کر رہ جائیگی۔" (فتح محمد ملک ادبیات مارچ 1990ء)

ہمیں بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں کچھ مہیب قسم کے خطرات کا خدشہ ہے اور ایسے میں کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمیں قومی یکجہتی، صحیح معنوں میں قومی یکجہتی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ انفرادی انا کو اجتماعی انا یعنی قومی انا میں تبدیل کیا جائے جو مسلسل ارتقاء پذیر ہو کر ملی انا کی صورت اختیار کرے۔

ملت اسلامیہ کے اردگرد خراشوں کی آوازیں آ رہی ہیں اور ملت اسلامیہ کے سب اجزائے ترکیبی ارادتاً بکھرے ہوئے ہیں اور بکھرتے جا رہے ہیں لیکن احساس زیاں نہیں اور جو طوفان دائیں بائیں شور کرتے ہوئے ہماری مملکت کی طرف لپک پر آمادہ نظر آتا ہے اس میں ہمیں قومی یکجہتی بلکہ ملی یکجہتی کا ادراک، ارتقاء اور اظہار ضروری ہو جاتا ہے۔ دانشور اور ادیب ہمیں تلقین کرتا ہے کہ اجتماعی قومی انا کو عملی صورت دینے کا عزم کر لینا چاہیے اور اسے ملی انا کی صورت اختیار کرنے کے اسباب پیدا کئے جائیں اور پھر یہ بھی سوچ لیں کہ اس ملی انا کی بالیدگی کے لیے اجتماعی کردار کی تشکیل میں ادب کیا کردار ادا کرے گا۔

قوموں کے تشخص کا بڑا دشمن انفرادی انا کا جذبہ ہے جو علاقائی سوچ کا بیج بوتا ہے اور یہ بیج درخت بننے میں زیادہ وقت نہیں لیتا یوں اس کا شعور پیدا کرنے کے لیے ادب ایک کارگر ذریعہ ہے۔

محسن کی صورت یہ تعصب تجھے کھا جائے گا
اپنی ہر سوچ کو محسن نہ علاقائی کر

(محسن احسان)

اور ملت کے ناطے سوچیں تو علاقائی، تہذیبی، وطن کی محبت اور وطن کی عظمت ظاہر کرتے ہوئے وطن پرستی کا نغمہ الاپنے لگتا ہے۔ ایسے میں ادیب تنبیہ کرتا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

(اقبال)

اس وقت ملت پر عجیب وقت پڑا ہے اس لیے ادب کو اپنا کردار انفرادیت، علاقائیت، وطنیت سے باہر نکل کر ملت کے ناتے ادا کرنا ہے۔ ممکن ہے جہاں کسی کی سوچ ملت کے ناتے سے کردار کی تحدید کا خوف محسوس کرے لیکن ابھی اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہیں کرنا چاہیے کہ اسلام کائنات کا مذہب ہے اور اسلام کی تمام تعلیم پوری کائنات کے فلاح و بہبود کی داعی ہے۔

بد قسمتی سے کم علمی کے عذاب میں مبتلا مبلغین نے اسلام کے اس روشن ترین پہلو کو نذر ظلمات کرنے کیلئے جواز ڈھونڈنے کو اپنا فرض اولین بنالیا ہے جس سے نہ صرف انسانیت پر رعشہ طاری ہے بلکہ خود اسلام کے کائناتی کردار پر بھی شک کی نگاہیں پڑ رہی ہیں۔

آج کے سب سے بڑے عالمی مسئلے کو بھی باوجود اس حقیقت کے کہ دنیا کو جس دہشت گردی کا سامنا ہے، اسے سوچیں اور معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس کا منبع کیا ہے اور کہاں ہے تو محسوس ہوگا کہ جو اس کے خلاف خوفناک رہا ہے وہی اس کا منبع ہے۔

اس مسئلے کو مغربی طاقتوں نے اسلامی تعلیمات سے منسلک کر دیا ہے یا سمجھ لیا ہے اور اسلام کے دوست نما دشمنوں نے اس کو تقویت دی اور مغرب نے بلا سوچے سمجھے اضطراری کیفیت میں اسے بنیاد پرست مسلمانوں پر تھوپ دیا ہے اور اس فکر کو تقویت بخشنے والی یہی کم فہم بلکہ کج فہم فرقہ پرست قومیں ہیں جو اسلام کا جھنڈا اٹھا کر غیر اسلامی سفاکانہ اقدامات کر رہی ہیں جبکہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق اسلام پوری کائنات کی فلاح کا داعی ہے صرف مسلمانوں کا نہیں۔ اللہ کے انعام و اکرام اور فلاح کا استحقاق قرآن کریم پوری کائنات کو مہیا کرتا ہے۔

"بے شک مومنین اور یہودی اور عیسائی مجوسی جو خدا کو مانتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لیے سزا کا کوئی خوف نہیں نہ ہی انہیں سزا ملنے کا غم ہوگا۔" (سورہ بقرہ نمبر 1 پارہ)

اقبال نے جس نظریہ وطنیت کے خلاف اپنی تخلیقات میں اظہار کیا ہے وہ رنگ، نسل، ذات، صوبے اور علاقے کی بنیاد پر انسانی معاشرے کو چھوٹی موٹی قومیتوں میں تقسیم کرنے کا عمل ہے۔

"یورپ نے پندرہویں صدی میں وطنیت کا شوشہ چھوڑا تا کہ وطن یا علاقہ کے نام پر مسلمانوں میں پھوٹ پڑ جائے۔"

ڈاکٹر وقار احمد رضوی (مقالہ قومی یکجہتی میں زبان و ادب کا کردار، مجلہ ادبیات، جلد 1، شمارہ نمبر ۳، صفحہ ۲۵۵)

ادب اگر امن اور سلامتی کا داعی ہے تو وہ سچا ادب ہے اور اگر اسے مخالفین کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ سیاسی ادب ہو سکتا ہے۔ یہ ادب نہیں اور بہترین ادب اور امن اور سلامتی کا تمام علم ہمیں قرآن کریم سے ملتا ہے جو اوپر کی دو آیات سے واضح ہے۔ کائنات میں امن و سلامتی کے لیے بہترین مساعی اہل علم کا کام ہے جبکہ سیاست میں امن و سلامتی کا یقین

نہیں ہو سکتا ۔قرآن کریم سے ہمیں علم ملتا ہے اور فی الحقیقت جملہ علوم قرآن کریم ہی میں ہیں ۔

جميع العلم فی القرآن لکن .تقاصر عنه انهام الرجال

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں ۔

''ادب کا کام اپنے معاشرے کی جڑوں کو سیراب کرنا ہے ،عوام سے اپنا رشتہ ناطہ مضبوط کرنا ہے قاری تک ان باتوں کو پہنچانا ہے جن کو اس نے ٹوٹے پھوٹے انداز میں محسوس تو کیا تھا لیکن پوری طرح محسوس نہیں کیا تھا ۔اسی احساس سے وہ شعور پیدا ہوتا ہے ۔جو ادب کا کام ہے ۔''(ماہ نو ،مارچ1990 ،صفحہ15)

بدلتی ہوئی دنیا میں مختلف قسم کی دوڑیں لگی ہوئی ہیں ۔اسلحے کی دوڑ حصول زر کی دوڑ ،اقتصادی برتری کی دوڑ ،ٹیکنالوجی کی دوڑ اور یہ دوڑیں افتراق وانتشار پیدا کرتی ہیں ،قوموں میں افتراق یعنی بین الاقوامی افتراق ،(افتراق بین الملل)قومی افتراق مجلسی افتراق ۔ہم افتراق کے ان مراحل سے ہی خوفزدہ ہیں اور ہونا بھی چاہیے جہاں قومی افتراق وانتشار نظر آتا ہے اور قومی یکجہتی پر حملے ہوتے ہیں ۔قومی یکجہتی کے سلسلے میں ادب کی کارکردگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے بالخصوص اس زبان کے ادب کو بھی جو پورے ملک میں رابطے کی زبان متصور ہوتی ہو ۔پاکستان میں اردو زبان ہی رابطے کی زبان ہے ۔''

اور رابطہ یکجہتی کی طرف سفر کا نام ہے اور جیسے اردو ادب برصغیر میں یکجہتی کا ابلاغ کرتا ہے ویسے ہی کسی زبان کا ادب متعلقہ ملک یا ممالک میں یکجہتی کی راہ دکھاتا ہے ۔

ادیب کی سوچ کائناتی امن و بہبود ،بھائی چارے اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی خالق بھی ہوتی ہے اور ضامن بھی ۔ دنیا میں کہیں بھی انسانیت کو دکھ پہنچے وہ دکھ بالکل اسی طرح اتنی ہی شدت سے ادیب محسوس کرتا ہے اور اس کے خلاف قلمی جہاد کرتا ہے چنانچہ آج کی دنیا میں کہیں بھی انسان کی تذلیل تحقیر ہو ،انسانیت کے خلاف تشدد ہو ،ظلم ہو کسی چھوٹے بڑے منظم گروہ کی طرف سے ہو یا کسی حکومت کی طرف سے ،ادب اس کے خلاف فوری ردعمل کا اظہار کرتا ہے یعنی ظلم اور تشدد کے خلاف آواز اٹھاتا ہے ۔ادب کا عرفان لطیف احساسات اور روشن ذہن کو وہ مثبت کردار عطا کرتا ہے جو عالم انسانیت کو مدلل اور دلکش اسلوب کے ذریعے جھنجھوڑتا ہے اور ایک خوشگوار ماحول اور انسانیت نواز دنیا کی تخلیق کرتا ہے ۔فلسطین ہو یا کشمیر ،افریقہ ہو یا جنوبی ایشیاء جہاں کہیں انسانیت دکھ میں ہو ،ظلم کا شکار ہو ،کردار کی منفی اقدار کی ترجیح ہو ادب اس کے خلاف بھرپور آواز اٹھاتا ہے اور انسان کے لیے فکر اور مثبت سوچ کا میدان مہیا کرتا ہے یعنی کائنات کو پر امن ،انسانیت نواز اور تشدد ،بے رحمی سے پاک خوشگوار دنیا میں تبدیل کرنے کے لیے آواز اٹھاتا ہے ۔

خوشگوار عالمی ماحول پیدا کرنے کے لیے عملی جدوجہد کے ساتھ تبلیغ کا عمل کیسے آسان بنایا جا سکتا ہے اس کا آسان جواب یہی ہو سکتا ہے کہ احترام آدمیت اور ایثار بہترین اور یقینی طریق کار ہے جس کی تبلیغ ادب دلکش طریقے سے کر سکتا ہے یعنی تشدد اور دہشتگردی کے خلاف ذہن انسانی کو تیار کیا جائے ۔اس عالم کے حصول کے لیے قرآن کریم سے ہدایات واضح اور قابل عمل صورت میں موجود ہیں ۔مثلاً دہشت گردی کے خلاف قرآن کریم میں اصول واضح ہے جیسے قتل کے متعلق ارشاد ہے ۔

یہ ارشاد ہے''جس نے کسی ایک نفس (انسان)کو قتل کیا (تو گویا)اس نے تمام (عالم کے)انسانوں کو قتل کیا ۔''

''جس نے (عملاً قصداً)کسی ایمان والے کو قتل کیا اس کی جزا جہنم ہے ۔''

اور یہ ارشاد ہے:

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد نہ کرو تو وہ (اپنی طاقت کے گھمنڈ میں) کہتے ہیں کہ ہم تو انسانوں میں اصلاح اور مصالحت کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو کہ یہی لوگ فی الحقیقت فساد پھیلانے اور کرنے والے ہیں لیکن انہیں اس کا شعور نہیں" (سورۃ البقرہ)

اور

"ان کو بہترین انداز میں نیکی کی ترغیب دو۔"

اسی طرح قرآن کریم میں جگہ جگہ وضاحت سے صلہ رحمی، عدل، امن، بھائی چارے اور انسانی ہمدردی کا سبق دیا گیا ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دہشت گردی، انسان کشی وہ بڑے عوامل ہیں جو مختلف سطحوں پر فساد اور بدامنی کی ترویج کا باعث ہیں لہذا آج کی فساد زدہ انسانیت میں طاقت کے بل پر امن کو تباہ و برباد کرنے کی جو مہیب لہر اٹھی ہے اس کی وجہ سے مظلوم و مرحوم قوموں کی زندگی اجیرن ہوئی ہے۔ جس کے خلاف میدان تیار کرنا خدا کا حکم ہے اور اس زمانے میں چونکہ پیغمبری کا سلسلہ ختم ہو گیا اس لئے یہ فرض اب ادب نے ادا کرنا ہے، بہ الفاظ دیگر بدلتے ہوئے مخدوش حالات میں سلامتی کے مذہب اسلام کی طرف لوٹنا ہوگا کہ اسلام سلامتی کا نام ہے اور چونکہ العوام کالانعام ایک حقیقت ہے اس لئے یہ فرض دانشور، شاعر اور ادیب کا ہے اور اس لیے یہ کام ادیب کی تخلیق یعنی "ادب" کا ہے۔

حکیم بلوچ

انسانی معاشرہ میں اتفاقات، حادثات اور تجربات نے انسانی رشتوں کی ہمواری اور ناہمواری میں بہت اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے، چاہے یہ رشتے انسان کے انسان تھے، انسان کے معاشرے سے یا انسان کے قدرت سے تھے، مگر یہ تمام رشتے باہم تصادم کی صورت میں پروان چڑھتے رہے چیلنج اور رسپونس کی متصادم کیفیت میں اپنے اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتے رہے۔ انہی کی کوکھ سے انسانی عقیدوں، معاشرتی اقدار، قومی خصائل اور تہذیبی رویوں نے جنم لیا تو تخلیق، تحقیق اور تاریخ کے ابتدائی ادوار ان ایام میں شروع ہوئے جب دجلہ، فرات کے دوآبہ میں انسان نے پہلی دفعہ جنگلی جانوروں کو سدھایا اور جنگلی پودوں کی کاشت کر کے فصل اگائی زمین سے پیوست ہو کر شہر آباد کئے اور متمدن زندگی کا آغاز کیا۔

حمورابی نے قوانین اور فرامین مٹی کی تختیوں پر لکھ کر ان کو "لوح محفوظ" بنا دیا اور انسان کو امر و نہی کے عواقب میں جکڑ لیا۔ عام انسان کاشت کار بنا، زمین کی آبیاری اور فصلوں کی دیکھ بھال میں افتادگاں خاک بنا رہا، اور اصحاب عقد و حل کاشت کار سے ملتنک۔ بلا محنت کے وصول کرتے رہے اور فرصت و فراغ کے ان لمحات میں ذگرات کی ساتویں منزل پر متمکن ہو کر ہست و بود اور الوہی رشتوں کی تلاش میں خود شش جہت کا رب بن بیٹھے بادشاہ سارگان نے ذگروس کی کوہستانی شہزادی کے پیار میں معلق باغات بنا کر عجوبہ روزگار کارنامہ سرانجام دیا۔ انہی ذگرات اور معلقات کی سرزمین پر تہذیبوں کے نقوش وضع ہوتے رہے۔ مدائن آباد ہوتے رہے اور اجڑتے رہے اور بابلونیا تہذیبوں کا گہوارہ کہلایا۔ ان تہذیبوں کے فرامین، قوانین و تواریخ اور پند و نصائح کے خس و خاشاک کے ڈھیر میں سے ایک خط برآمد ہوا جو ایک بادشاہ نے اپنے بیٹے کے نام وصیت نامہ کی صورت میں لکھا تھا جو غالباً چار ہزار سال پہلے کا ہے ناقدین اور علماء بھی اس خط کو عالمی ادب کا پہلا نسخہ قرار دے چکے ہیں جو بابل اور نینوا کے تہذیبی ادب کی ادنیٰ جھلک ہے۔

بابلون کو بخت نصر نے آباد کیا، کوروش کبیر نے اس کو چھٹی صدی قبل مسیح میں فتح کر کے اپنی مملکت کا حصہ بنا دیا مگر اس کو تاراج نہیں کیا جو مقدونیہ کے سکندر اعظم کی فتح تک آباد رہا۔ وہ پہلا مغربی حملہ آور تھا جس نے پرسی پولس کو جلا ڈالا اور بابلونیا کو اجاڑا کہ اسے بھی سکندریہ کے نام سے دوبارہ آباد کرے۔ وہ اس وقت تک بارہ شہر سکندریہ کے نام سے آباد کر چکا تھا۔ مگر "فاتح عالم" کو ایک معمولی بھڑ نے یہ مہلت نہ دی کہ وہ اس کے کاٹنے کے شدید درد کو سہلاتے سہلاتے ترقی اور شراب گھول کر پیتا رہا اور درد جب تھما تو اس کی سانسیں بھی تھم چکی تھیں۔

اور اب مغرب کا تازہ ترین حملہ آور آقائے یک جہاں بن کر تہذیبوں کی اس گہوارہ سرزمین بطون کو پھر سے اجاڑ چکا ہے۔ یہ ان شہادتوں کی داستان رقم کرے گی گواہی دے گا اور کہے گا۔

اپنا فرض تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

اور یہ شہادت بھی لوح محفوظ پر رقم کر دے گا کہ غنیموں کے قدم بربادی تو لا سکتے ہیں مگر روشن دل و دماغ سے تخلیقی سچ کو بھی مٹا نہیں سکتے۔

اس وقت یہ ادب تخلیق ہو رہا ہے یا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک وقتی ابھار ہے یا ہمہ وقتی بانجھ پن یہ تو مستقبل ہی بتائے گا مگر یہ بضاعتی ایک مسلم تاریخی حقیقت کی ترجمانی ضرور کر رہی ہے کہ تاریخی تفسیروں اور سائنسی لکیروں نے بنی نوع انسان کے زمینی سفر کو جب بھی گوناگوں راحتوں اور لذتوں سے آشنا کر دیا تو اس کو آلام کے انبار گراں سے بھی دوچار کرنے کا موجب بنتا رہا کہ انسان جب ان آسائشوں اور آلائشوں میں کھو گیا تو وہ تخلیقی تمناؤں کے بے پایاں الاؤ کو روشن نہ رکھ سکا۔ اس کے امن و سکون کے صحرا میں بھیڑیے بے دھڑک گھستے رہے مگر اسی صحرا کے ژولیدہ اشجار کے چوب خشک سے الاؤ کی نئی آگ کو سلگانے کی لگن اس دل میں جاگ اٹھی جس نے پہلی بار کائناتی آتش سے خداوندوں کی مرضی کے برعکس ایک حقیر ذرہ آتش چرایا، تاریک رخشانی راتوں میں بنی نوع انسان کو اس کی روشنی میں بصارت اور حدت میں استراحت کی فیوض و برکات سے نوازا، بلکہ امید و آس کے ماہ لازوال کی بشارت دے کر خود لازوال ہو گیا اور ذرہ کو آفتاب بننے کی ہمت دے کر ابدی سرچشمہ حیات کے پانیوں کو پاکیزگی اور بالیدگی کے وہ جوہر بھی دے گیا جو مٹی کو ذرا سی نم دیدے، وہ کوزہ گر کے ہاتھوں جام جم بن جائے اور ایسی شاہکار تخلیق کر دے جس کے عکس میں وہ یقین بھی منکشف ہو جاتا ہے کہ خیر و شر کے پیہم تصادم میں، جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے کہ حق قائم رہتا ہے اور باطل مٹ جایا کرتا ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی رشتوں کو یوں بنتے اور بگڑتے دیکھ کر بعض صاحبان عقل و فراست نے ان حوادث اور واقعات کے نتائج کو تاریخی جبر سے تعبیر کیا مگر کچھ اولوالبصار نے انسانی معاشرتی عمل میں ہست و بود کے ان مظاہر کو پیداواری اور غیر پیداواری دو جاپن کے جدلیات کے عدسہ میں مثبت و منفی قوتوں کے باہمی تصادم و چپقلش کا ایسا سلسلہ جانا جو انسانی معاشرہ کی تاریخ میں ازل سے جاری ہے اور تا ابد جاری رہے گا مگر نہ یہ ایک جیسا رہا ہے اور نہ ایک سا رہے گا۔

یہ بہت بڑا موضوع ہے جس پر فلسفہ حیات اور بود و نابود آفرینش کے عقیدے استوار ہوتے آئے ہیں اور رواج پاتے رہے ہیں اور پھر ایسے ہی حادثات و تجربات سے گزر کر تغیر پذیر ہوتے رہے ہیں۔ تغیر واحد عمل ہے جو انسانی بود و باش، معاشرت اور سماجی اقتصادی اور سیاسی رشتوں میں جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ اسے ہم بدلتی ہوئی دنیا سے تعبیر کریں یا بدلتے ہوئے سماجی رشتوں کا نام دیدیں۔ بات ایک ہی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی شے کو ثبات حاصل نہیں ہے بجز تغیر کے، اور یہی تغیر پذیریہ اظہار ہے اس ذات کی اثبات پذیری اور اثبات کا کہ وہی خالق ہے جو خلق میں رشتوں سے آشنا کر کے اسے وجود لا وجود کی غیر مرئی سرحدوں تک پہنچا دیتا ہے تو عروج آدم خاکی سے فرشتے سہمے جاتے ہیں کہ نہ نوری ہے نہ ناری ہے مگر مخلوقات میں اشرفیت کے درجہ اول پر فائز کر دیا گیا ہے کہ آدم کو نطق، عقل اور ارادہ کی صفات عطا کی گئی ہیں اور اپنی صفات کی خمیر میں اسے علم

یعنی جاننے کی صفت اعظم سے بھی نوازا گیا ہے، اس لئے فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے جھک جاؤ کہ یہ جانتا ہے۔ یہ وہی کچھ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے ہو۔ سب جھک جاتے ہیں مگر ابلیس انکار کرتا ہے۔ بادی النظر میں یہ انکار ایک فرشتہ یا نور کا ہے آگ کی نسل سے یا اشرافیہ کے طبقہ سے تعلق کی بناء پر وہ اپنے تکبر و غرور پر قابو نہیں پا سکتا ہے کہ وہ ان قوتوں کی ہمہ وقت بالادستی کو مقدم جانتا ہے جن کا وہ نمائندہ ہے اور تغیر کے عمل سے منکر ہو کر وہ اپنے اور اپنے طبقے کی بالادستی کو دوام بخشنا چاہتا ہے۔ اسے ہر تغیر میں اپنے اور اپنے طبقے کی موت نظر آتی ہے مگر منشائے ایزدی یہی ہے کہ آدم خاکی کے ذریعہ تغیر و تحقیق کے ابدی سرچشموں کو صاف و شفاف اور رواں دواں رکھا جائے، اس لئے ذات باری تعالیٰ نے خالق اور مخلوق کے رشتوں کو خلاقی کے دائرہ کار میں ایسا استوار کیا جو پھیلتا ہے تو کائنات کی وسعت میں تنگئی داماں کے احساس میں کھو کر اپنے کو تنہا پاتا ہے اور پھر جب سمٹتا ہے تو کشف ذات میں اس ذات کو شہ رگ سے قریب تر پاتا ہے اور رجحانات کو بنتے دیکھ کر اپنے کو فنافی الذات میں کھو جاتا ہے تو تنہائی اور دو جاین دونوں سرک جاتے ہیں۔ ایک نیا رشتہ اور ایک نیا تخلیقی عمل شروع ہو جاتا ہے جو ایک بدلتی دنیا اور نئے عہد کا نقیب بن کر تاریخ فلسفہ، ادب اور ریاضی کو علم و عقل شعور و آگہی کے نئے زاویوں سے روشناس کر دیتا ہے۔ یہی وہ تاریخی لمحہ ہے جہاں سے وقت کی نئی گھڑی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لمحہ کا، وقت کا اور گھڑی کا ادراک ادیب شاعر اور دانشور کا امتحان بن جاتا کہ وہ روح عصر کے اس انکشاف کو اپنے ذہن کی لوح پر کیسے منعکس پاتا ہے اور اس عکس کو وہ کیسے رقم کرتا ہے، اگر اس کے ذہن کی لوح شفاف و منزہ ہے۔ اس پر کسی قسم کے تعصب، تکبر، تفریق کا سحاب سایہ فگن نہیں ہے تو اس انکشاف کو مضامین غیب سے تعبیر کر کے ہر فن کار ہر شاعر ہر ادیب وہ شاہکار تخلیق کر لیتا ہے جو اس کے عصری شعور کو نہ صرف اجاگر کرتا ہے بلکہ اس کے سماجی شعور کو خلاقی کے بلند ترین برج تک پہنچا دیتا ہے تو وہ ہر ذی شعور کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ تخلیق کار نے خلق کیا یہ اس کی اپنی آواز ہے۔ اس کا اپنا درد ہے، اس کا اپنا خوف ہے، اس کی اپنی رجا ہے، اس کا اپنا فردا بھی ہے جو زہر امروز میں گھل کر بھی شیرینی فردا کے شکر قند کی بشارت دے رہا ہوتا ہے۔ ادب میں یہ جوہر جام جم اس وقت در آتا ہے جب ادیب فن سے وابستگی کو افتادگان خاک کے آتش کے غم سے جوڑ کر کل کی نوید نو کا نقش جمیل ابدیت کے سنگ خارا پر برج فریدون کی مانند فروزاں کر دیتا ہے تو یہی ادب بدلتی دنیا اور رہتی دنیا تک حسن ازل کا کارنمک پرتو بن کر لازوال بن جاتا ہے۔

تغیر ایک حقیقت ہے۔ یونانی فلسفی ہیراکلیٹس نے دو ہزار سال پہلے ہی یہ حقیقت پالی تھی اور پارمینڈیز کے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا تھا کہ سچائی اور حقیقت جامد ہیں۔ سو دنیا مسلسل بدل رہی ہے اور بدلتی رہے گی مگر گزشتہ دو تین صدیوں سے تبدیلی برق رفتار ہے اور اکثر اوقات ادبی قوت متخیلہ کی اڑان سے آگے۔

تاریخ کا چلن ہے کہ آج گزشتہ اور آئندہ سے پیوست ہوتا ہے، گزشتہ ہی میں آئندہ کے رجحانات جنم لیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو انیسویں صدی میں پیدا ہونیوالے مفکرین اور سائنسدانوں نے بیسویں صدی کی فکری روش متعین کی۔ ارتقاء کا نظریہ بہت قدیم ہے۔ لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق تقریباً دو ہزار سال پہلے آئیونیا کے مفکر Anaximadev نے یہ کہا کہ انسان نے مچھلی سے ارتقاء کیا۔ بعد میں یہ تصور کسی نہ کسی سائنسی، فلسفیانہ، صوفیانہ اور شاعرانہ شکل میں پیش کیا جاتا رہا لیکن 1859ء میں چارلس ڈارون نے جس شکل میں اسے تشکیل دیا اسے بے حد قبول عام بھی حاصل ہوا اور اس کے خلاف شدید ردعمل بھی ہوا۔ اس ردعمل کے باوجود افکار کی دنیا میں اس نے دوررس نتائج مرتب کیے۔ اس کے زیر اثر Survival of the fitest کے اصول نے نطشے کو فوق البشر کے تصور تک پہنچایا جو بالآخر سیاسی میدان میں ہٹلر، مسولینی اور سٹالن کی شکل میں ظاہر ہوا۔ تیل کا پہلا کنواں بھی 1859ء میں دریافت ہوا جس نے مشینی قوت کو انسان کی زندگی میں ایک بے پناہ طاقت بخشی اور آگے چل کر دنیا میں وسائل کے حصول کی جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔

دنیا نے بیسویں صدی کے پہلے حصے میں دو عظیم جنگیں بھی دیکھیں جنہوں نے انسان کی اشرفیت، اخلاقیات اور اقدار پر کاری ضرب لگائی۔ دوسری جنگ عظیم تک ایٹمی توانائی کی دریافت اور اس کا منفی استعمال بھی ہوا۔ امریکہ نے دنیا کا پہلا ایٹم بم بنایا اور پھر اسے ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرایا۔ 1957ء اور 1968ء کے دوران انسان چاند تک جا پہنچا۔ خلاء کی تسخیر اور Big Bang Theory پیش کی گئی۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ ذرات بیک وقت مفرد اور مرکب ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اشتراکیت کا فلسفہ سیاسی قوت کے طور پر ابھرا جو بتدریج ایک سلطنت میں ڈھل گیا۔ اسی صدی نے ہٹلر کا عروج و زوال، برطانوی سلطنت کا ڈھلتا سورج اور اپنے آخری حصے میں سوویت یونین کو بکھرتے ہوئے دیکھا۔

روایتی انسان خدا، کائنات اور دوسرے انسانوں سے مربوط تھا۔ عہد جدید کے انسان کے یہ روایتی رشتے ٹوٹنے لگے۔ نطشے نے اعلان کر دیا: خدا مر چکا ہے۔ فطرت کو انسان نے اپنے مصرف کی چیز یعنی object قرار دے دیا۔ سائنس اور مشینی قوت سے اسے تسخیر کیا اور یوں وہ فطرت سے حریفانہ جدائی کا شکار ہوا۔ انواع کی کشمکش اور فردیت کے تصورات نے اسے دوسرے

انسانوں سے بیگانہ کردیا۔ انفرادیت پسندی کے اس دور میں ادیب کو بطور superman بے حد اہمیت ملی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر انفرادیت اور اجتماعیت کی انتہاؤں سے گزر کر انسان ایک ایسے معاشرے کے تصور تک پہنچ گیا جس میں نہ تو فرد معاشرہ پر اور نہ معاشرہ فرد پر حاوی ہو۔ حقیقت کے ادراک میں'' لامرکزیت'' کے رجحان کو تقویت ملی۔ جدید فزکس نے مرکزیت کے بجائے حقیقت کی ایسی ساخت دریافت کی جو باہمی روابط کے تانے بانے سے بنتی ہے۔ یہ بھی گمان کیا جانے لگا کہ جو ہر ایک صورت ہے مگر مواد کے اعتبار سے لہر (wave) ہے گویا مادہ ٹھوس نہیں بلکہ توانائی ہے۔ برگساں نے زمانہ کے بہاؤ اور زندگی کے ارتقاء کے تخلیقی ہونے کا نقطہ نظر پیش کیا۔

بیسویں صدی ہی میں نظریہ اضافیت نے نہ صرف فزکس بلکہ تمام علوم وفنون میں فکری انقلاب برپا کردیا۔ انیسویں صدی میں مصنف، اس کی زندگی اور عہد کے تاریخی پس منظر کو اہمیت حاصل تھی۔ بیسویں صدی میں مصنف کی بجائے متن پر زور دیا جانے لگا مگر اسی صدی کے آخر تک ساختیات کے مکتبے نے متن، مصنف اور قاری کو ایک تکون کے تین زاویے قرار دیا۔ بیسویں صدی میں ٹیلی فون نے فاصلوں کو قربتوں میں ڈھال دیا، ٹیلی ویژن سے معلومات میں اضافہ اور ادراک میں پھیلاؤ دکھائی دینے لگا۔ اکیسویں صدی کے آتے آتے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے انسان کے ذہنی افق کو عالمگیر وسعت بخشی وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہی دنیا کے دوسرے سرے پر ہونے والی کسی تقریب میں شریک ہو سکتا ہے، کسی بھی موضوع پر معلومات حاصل کر سکتا ہے، سات سمندر پار کسی سے بھی منٹوں میں رابطہ قائم کر سکتا ہے اور مکالمہ کر سکتا ہے۔ یوں انسان دنیا کا شہری بن چکا ہے اور خلوت معاشرتی ربطائی صورت رکھتی ہے، کیونکہ خلوت میں بھی فرد کی سوچ معاشرتی دنیا سے بندھی ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ انٹرنیٹ نے آدمی کی خلوت کو جلوت میں تبدیل کردیا ہے اور فرد کا دنیا سے امتزاج ایک لحاظ سے دکھائی دیتا ہے جب کہ بیسویں صدی کے وسط سے تعلق رکھنے والے وجودی مفکر ژاں پال سارتر کے لیے ایک اہم مسئلہ تھا کہ وجودیت کی فردیت اور مارکسیت کی اجتماعیت کو کیسے ہم آہنگ کیا جائے۔ اس نے بالآخر اس کے حل کے لیے'' تیسرے آدمی'' کا تعقل پیش کیا۔ اس تعقل کے مطابق ''میں'' فرد کمرے میں بیٹھا کھڑکی سے مالی کو باغ میں اور مزدور کو سڑک پر کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ لیکن ''میں'' ان دونوں سے باخبر ہوں اور وہ میرے شعور کا حصہ ہیں۔ یوں ''میں'' یعنی تیسرا آدمی ان دونوں کو اپنے شعور کے وسیلے سے مربوط کر رہا ہوں۔ اس طرح فرد اور اجتماع کا امتزاج پیدا ہوتا ہے۔

میرے نزدیک انٹرنیٹ کے ذریعے سے فرد اپنی خلوت میں دوسروں سے اور دنیا سے جو ربط پیدا کرتا ہے یا جس قسم کی شرکت حاصل کرتا ہے وہ شعور کا ربط تو ہے مگر وجودی ربط نہیں، کیوں کہ اس میں وجود کی کلیت داخل نہیں ہو سکتی۔

نسائیت کے افکار آزاد خیالی کے فلسفے کے بطن سے صادر ہوئے۔ میری ول سٹون کرافٹ، جان سٹورٹ مل اور ہیرئٹ ٹیلر نے آزاد خیال نسائیت کی داغ بیل ڈالی۔ بیسویں صدی میں تحریک حقوق نسواں متحرک ہوئی۔ اس صدی کے آخر تک یہ اپنی انتہا پسندانہ صورت میں مارلن فرنچ، فائرسٹون جیسے نسائی مفکرین کے نظریات کی شکل میں حیران بلکہ پریشان کرنے لگی آہستہ آہستہ جنسی آزادی، ہم جنسی کی طرف لے جانے لگی اور اب گے رائٹس (Gay Right) کی مہم واضح طور پر زور پکڑ گئی ہے۔ Lesbianism کا رجحان کھل کر سامنے آرہا ہے۔

عورت اور مرد کے درمیان تفریق خلیج بننے لگی اور اس وقت اس میں پھیلاؤ دکھائی دیتا ہے۔ ادب میں نسائیت کا نمائندہ

اظہار اور جینا ولف کی تحریریں ہیں۔ اردو ادب میں بھی نسائیت کے اثرات فکشن اور شاعری میں نمایاں ہو رہے ہیں۔

تیسری طرف فکری اور سیاسی جدلیات میں سوویت یونین اور اس کے بلاک کے خاتمے کے بعد جو خلاء پیدا ہوا اس میں ایک ادھ پکے جواب دعوی نے یک قطبی عظیم طاقت اور دعوی کو للکارا اور اس سے خوفناک تصادم ظاہر ہوا جس کے نتیجے میں اکیسویں صدی کے اوائل میں دنیا عموماً اور مسلم ممالک خصوصاً زیروزبر ہو گئے۔ اسے مبصرین کئی زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ اس منظر نامے کو تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ صلیبی جنگوں کا مشابہ بھی قرار دیا گیا۔ خیر و شر کی ازلی ابدی جنگ بھی کہا جاتا ہے۔ بہت سے اسے شیر اور بکرے کا مکالمہ بھی تصور کرتے ہیں اور اسے جدیدیت و روایت کی جدلیات کا رنگ بھی دیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کو کوئی نام بھی دیا جائے اور اس کا کسی بھی زاویے سے محاکمہ کیا جائے یہ واضح ہے کہ اس کے نتیجے میں مذاہب، ممالک اور تہذیبوں کے درمیان سنگین مغائرت ظاہر ہوئی، اور دنیا کے کئی حصوں میں ناانصافی اور محرومی کا احساس کرب کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ جب بیسویں صدی کی آخری دہائی تھی تو امریکہ میں فوکویاما کی کتاب The end of history and the fast man لکھی گئی جس کے مطابق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا نظام مارکسیت میں بیان کیے گئے مقامی، معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام اور غیر طبقاتی معاشرہ کی منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں ایک شخص اپنی مرضی کی ہر چیز حاصل کر سکتا ہے اور اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتا ہے۔ اس لئے فوکویاما کے مطابق:

''تاریخ کا عمل ختم ہو گیا ہے اور اب آئندہ نظریاتی جنگوں کا کوئی امکان نہیں۔''

لیکن نو ستمبر کے واقعے نے ثابت کیا کہ جب فوکویاما صاحب مندرجہ بالا سطریں لکھ رہے تھے وہ اس سے بے خبر تھے کہ تاریخ کا جدلیاتی عمل جاری ہے کیوں کہ حقیقت یا ساخت ماورائے قاعدہ ہے۔

یہ تو تھی بدلتی ہوئی یا بدلی ہوئی دنیا کی رام کہانی۔ آئیے اب موضوع میں پنہاں دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں یعنی اس دنیا میں جو بدل چکی ہے اور بدل رہی ہے، ادب کا کیا کردار ہے۔ گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی تبدیلیاں سائنسی، فلسفانہ، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور سائنسی نوعیت کی ہیں اور ادب پر کسی نہ کسی انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثلاً ڈیکارٹ کی منطقیت کے نتیجہ میں ادب میں رومانویت کی تحریک ظاہر ہوئی جو آگے چل کر علامت کا روپ دھارنے لگی۔ اسی طرح مارکس کے نظریات نے برصغیر میں ترقی پسند تحریک کو جنم دیا۔ وجودیت کے فلسفے نے ساری دنیا کے ادب پر عموماً اور فرانسیسی ادب پر خصوصاً گہرے اثرات مرتب کئے۔ سائنسی نظریات نے سائنس فکشن پیدا کیا۔ دنیا کی دو بڑی جنگوں نے ادب پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

اگلا سوال جو ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ادب ان تبدیلیوں کا اثر قبول کرنے میں محض مفعول ہے؟ اور منفعل کیفیت میں رہتے ہوئے صرف ان تغیرات کا عکاس ہے یہ ایک پیچیدہ سوال ہے تاہم میری ناقص رائے میں تمام تغیرات اور ادب کے درمیان دوطرفہ تعلیلی تعلق ہے۔ یعنی وہ ان کے زیر اثر ہوتا ہے لیکن تخلیقی تشکیل کے بعد وہ خود بھی انسانی شعور کو تبدیل کرتا ہے۔ شاید اس کا دائرہ و اثر اب اتنا وسیع نہیں جتنا روسو اور والٹیر وغیرہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے نقوش دیرپا ہیں۔

اس کے علاوہ ماورائے قاعدہ حقیقت یا ساخت کی طرح یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ تبدیلیوں کا اثر ادب میں کیا رخ، نہج یا روش اختیار کرے گا اور اس کی شکل کیا ہوگی۔ مثلاً برصغیر میں جب اشتراکیت کے زیر اثر خارجیت، ترقی پسندی اور حقیقت پسندی عروج پر تھی تو اس کے متوازی داخلیت، رومانویت اور علامتیت بھی چل رہی تھیں۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک تاثر یہ ابھرتا ہے جو مجموعی طور پر بدتی ہوئی اور بدلی ہوئی دنیا کے بارے میں ہے کہ عام طور پر تبدیلیاں جدلیاتی نوعیت کی ہیں اور مغائرت کے شدید احساس کو گہرا کررہی ہیں۔ اس وقت ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ، طاقتور اور کمزور، مرد اور عورت، غریب اور امیر، ٹیکنوجیکل اور نان ٹیکنولوجیکل قطبین کی صورت موجود ہیں۔ یہ تعین کرنا بہت دشوار ہے کہ ادب جدلیات اور مغائرت کی کیفیت میں اضافہ کرے گا، محض عکاسی کرے گا یا ترتیبی عمل کا مظاہرہ کرے گا یا صرف theroputic اقدار کا حامل ہوگا۔

دوسری طرف یہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ ادب عمل اور ردعمل کے اصول کے تحت ہونے کے باوجود ایک ایسا ردعمل ہے جو اپنے بعد ایک اور ردعمل کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ دعویٰ بھی ہے اور جواب دعویٰ بھی۔ وہ اختلاف وانحراف بھی ہے اور اعتراف بھی، وہ تصویر کا ایک رخ بھی ہے اور دوسرا بھی، اگر یہ تضادات امتزاج میں نہ بھی ڈھل سکیں تو کلیت کی شکل میں حقیقت ہیں۔ اس کی کوئی منطق نہیں اور اگر ہے تو اس کی اپنی منطق ہے۔ اس لیے ادب آج بھی تحریکی جمالیاتی صورت کی اثر پذیری کا حامل ہے اور کل بھی رہے گا۔ یہ کسی جامد متعین حقیقت کا عکاس نہیں بلکہ امکانات کے کھوج کا نام ہے اور امکانات ان گنت ہیں۔

فرخندہ لودھی

ادب زندہ، حساس شخص کا کسی حالت، قصے، واقع، عادت، دکھ، ناانصافی یا پھر خوبصورتی، مسرت، خوشی، ناکامیابی، بزدلی، بہادری جیسے کسی اپنے یا دوسرے کے تجربے کا ردعمل ہوتا ہے جو متغیر اظہار اور احتجاج کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

دیکھا جائے تو ادب زمانہ جدید کی پیداوار نہیں ہے نہ عظمت رفتہ کا ترجمان ہے۔ یہ لاشعوری طور پر انسان کی پیدائش کے دن اس کے ساتھ پیدا ہوا۔ غالباً اس دن جب پہلے انسان نے پہلی بار "میں" کے ساتھ "تو" کو تسلیم کیا۔ پھر رفتہ رفتہ "تو" اس کی زیست کی ضرورت بن گیا۔ "میں" کے لیے "تو" کا وجود اہم ہو گیا۔ یوں "تو" تمام فنون لطیفہ انسان میں اسی ادبی رجحان کی اپج کے مختلف رخ ہیں جو انسان کو میں سے تو کے سفر میں درپیش مختلف سمتوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ تمام فنون ادب کا بھائی چارہ ہیں، برابری ہیں۔

انسان قدرت کی وہ مخلوق ہے جسے خالق نے دیگر مخلوقات کی طرح جینے کی مہلت تو دی مگر اپنی ذات کا تحفہ دے کر "تلاش" "تو" کی موہوم تمنا میں الجھا دیا۔ اس طرح "تو" کی تلاش اس کی دنیاوی، مادی، روحانی اور اخروی حیات کا زینہ بن گئی۔ مدارج ارتقا طے ہونے لگے، پھر تکمیل ارتقاء میں "حسن" معیار مقرر ہوا۔ اب معیار حسن کے کتنے اظہار بنے اور اظہار کے طریقے بے شمار، اگر ادب کی ابتداء پر غور کریں تو بغیر ردوکد کے کہا جا سکتا ہے کہ ادب باقی تمام اظہار حسن اور معیار حسن کی نشوونما کا گہوارہ ہے۔ اس کی آفرینش کی پہلی شرط ہے ناموجود کے لیے موجود کی شہادت۔ وجود کا پہلا گماں ہے۔ ہونے نہ ہونے کے بیچ تو تک کی کھوج کو ذہنی آسودگی کے ساتھ آمادگی مہیا کرنے کا رویہ ادب ہے جو انسان اور دوسری مخلوقات میں واضح امتیاز پیدا کرنے کے لیے قدرت نے انسان کو عطا کیا اور اس طرح تمام مخلوقات میں اسے سرفراز کر دیا۔

ادب انسان کی ابتداء سے آج تک تعمیر معاشرت میں فطری طور پر جدوجہد میں مصروف ہے اور کسوٹی بن کر اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کی صورت کو مختلف پیمانوں میں ڈھال کر پیش کرنے کی روش نے فنون لطیفہ کے کئی رنگ اور بہت سے ڈھنگ اپنا لیے۔ یہ وقت گزرنے کے ساتھ اپنے اپنے معیار بناتے رہیں گے اور اس طرح انسان کے شعور کا ارتقائی سفر جاری رہے گا۔ جیسے بت تراشنا، سُر الاپنا، شعر کہنا یا معنی خیز معقول بات ادا کرنا ایک ہی جذبے کے مختلف رنگ ہیں، ذریعہ اظہار کے مختلف پہلو ہیں۔ انہیں مختلف حواس خمسہ کے ذریعے پیش کیا جاتا اور محسوس کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ان ہی حواس خمسہ کے مجموعی استعمال کی کمی بیشی، اتار چڑھاؤ کو بروئے کار لا کر ایک نیا مجموعی تاثر یا صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال تاثر قائم کرنا تمام

فرخندہ لودھی

ادب زندہ، حساس شخص کا کسی حالت، قصے، واقع، عادت، دکھ، ناانصافی یا پھر خوبصورتی، مسرت، خوشی، ناکامیابی، بزدلی، بہادری جیسے کسی اپنے یا دوسرے کے تجربے کا ردعمل ہوتا ہے جو شعر، اظہار اور احتجاج کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

دیکھا جائے تو ادب زمانہ جدید کی پیداوار نہیں ہے نہ عظمت رفتہ کا ترجمان ہے۔ یہ لاشعوری طور پر انسان کی پیدائش کے دن اس کے ساتھ پیدا ہوا۔ غالباً اس دن جب پہلے انسان نے پہلی بار "میں" کے ساتھ "تو" کو تسلیم کیا۔ پھر رفتہ رفتہ "تو" اس کی زیست کی ضرورت بن گیا۔ "میں" کے لیے "تو" کا وجود اہم ہو گیا۔ یوں "تو" تمام فنون لطیفہ انسان میں اسی ادبی رجحان کی انج کے مختلف رخ ہیں جو انسان کو میں سے تو کے سفر میں درپیش مختلف سمتوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ تمام فنون ادب کا بھائی چارہ ہیں، برابری ہیں۔

انسان قدرت کی وہ مخلوق ہے جسے خالق نے دیگر مخلوقات کی طرح جینے کی مہلت تو دی مگر اپنی ذات کا تحفہ دے کر "تلاش تو" کی موہوم تمنا میں الجھا دیا۔ اس طرح تو کی تلاش اس کی دنیاوی، مادی، روحانی اور اخروی حیات کا زینہ بن گئی۔ مدارج ارتقا طے ہونے گئے، پھر تکمیل ارتقا میں "حسن" معیار مقرر ہوا۔ اب معیار حسن کے کتنے اظہار بنے اور اظہار کے طریقے بے شمار۔ اگر ادب کی ابتدا پر غور کریں تو بغیر رد و کد کے کہا جا سکتا ہے کہ ادب ہی تمام اظہار حسن اور معیار حسن کی نشوونما کا گہوارہ ہے۔ اس کی آفرینش کی پہلی شرط ہے ناموجود کے لیے موجود کی شہادت۔ وجود کا پہلا گماں ہے۔ ہونے نہ ہونے کے بیچ تو تک کی کھوج کو ذہنی آسودگی کے ساتھ آمادگی مہیا کرنے کا راہ یہ ادب ہے جو انسان اور دوسری مخلوقات میں واضح امتیاز پیدا کرنے کے لیے قدرت نے انسان کو عطا کیا اور اس طرح تمام مخلوقات میں اسے سرفراز کر دیا۔

ادب انسان کی ابتدا سے آج تک تعمیر معاشرت میں فطری طور پر جد و جہد میں مصروف ہے اور کسوٹی بن کر اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کی صورت کو مختلف پیمانوں میں ڈھال کر پیش کرنے کی روش نے فنون لطیفہ کے کئی رنگ اور بہت سے ڈھنگ اپنا لیے۔ یہ وقت گزرنے کے ساتھ اپنے اپنے معیار بناتے رہیں گے اور اس طرح انسان کے شعور کا ارتقائی سفر جاری رہے گا۔ جیسے بت تراشنا، مسرا اپنا، شعر کہنا یا معنی خیز معقول بات ادا کرنا ایک ہی جذبے کے مختلف رنگ ہیں، ذریعہ اظہار کے مختلف پہلو ہیں۔ انہیں مختلف حواس خمسہ کے ذریعے پیش کیا جاتا اور محسوس کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ان ہی حواس خمسہ کے مجموعی استعمال کی بیشی، اتار چڑھاؤ کو بروئے کار لا کر ایک نیا مجموعی تاثر یا صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال تاثر قائم کرنا تمام

فنون لطیفہ کی اصل کاوش ہے یہ کاوش انسانی طبائع کی تربیت کرتی ہے پرورش کرتی ہے۔ پروان چڑھاتی ہے اور پہچان مقرر کرتی ہے اس طرح تمام فنون لطیفہ ادب کے نقیب ہیں۔ یہ سب انسان کی رسائی اور معاشرے کی خوبصورتی کے لیے اپنی اپنی طرز کی اہمیت رکھتے ہیں اور انسان کی بقا کی تمنا کے پرچارک ہیں۔ ان کو ادب کہنا بے جا نہ ہوگا یوں کہنے سے ادب کا گھیرا بے شک وسیع اور کارکردگی کی حدود پھیل جاتی ہیں۔ ادب کو ہم لفظ، قلم، زبان، موضوع، پیرائیہ بیان تک محدود کر کے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں لیکن یہ انسان کے حواس خمسہ کے جملہ ذرائع سے جڑا ہوا ہے جیسے دامن چولی سے۔

اس کی مثال کچھ اس طرح دی جا سکتی ہے کہ پہلے پہل جب کسی ماں نے ممتا کے ترنگ کے تحت اپنے بچے کے لیے ایک خاص لحن میں لوری کے بول گنگنائے ہوں گے پھر رفتہ رفتہ ان بولوں میں سر سے رچاؤ پیدا کر کے ابلاغ کو قابل توجہ بنایا ہوگا، وہی لمحہ ادب کی تخلیق کا لمحہ ہوگا۔

یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ شعور ذات سے آگہی کے بعد جب انسان نے جنسی جذبے کو محبت کا مطیع محسوس کیا ہوگا۔ اس دوران تجزیہ کرتے ہوئے سوچا ہوگا کہ محبت یا عشق جنس سے زیادہ بلند اور ماورا کوئی حس ہے اسی لمحے آداب عشق ادب کی بنیاد بن گیا۔ عاشق نے محبوب کی مدح میں بول بولے جو بیان ادب کا ذریعہ بنے۔ اظہار کی وارفتگی و پاکیزگی ہی عشق کے مختلف modes ہیں جو عشق کو کشش جنس سے الگ کرتے ہیں۔ حیوانی رویوں میں تطہیر و تنظیم لازم کر کے ایک مہذب معاشرے کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

مذاہب جو انسانی معاشرے کی تربیت و تنظیم کے سب سے بڑے اور اہم ذریعے ہیں، ان میں وقت کے ساتھ ساتھ لفظ گوش گزار کرنے کے طریقوں اور معنی کے ابلاغ میں حسن آتا گیا۔ اسلام سے پہلے کے قدیم الہامی صحیفے قرآن جیسے بلیغ اور فصیح نہیں ہیں۔ عرب میں یکے بعد دیگرے پیدا ہونے والی تہذیبیں اور معاشرے مثلاً یہودی، عیسائی اور مسلم تہذیبوں سے پہلے کے قدیم معاشرے مثلاً مصری تہذیب، ہندی تہذیب، چین، روم اور زرتشتی، مذہبی کتب کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ان پر معنی خیز لفظ کی طاقت بہت مدھم رفتار میں اثر انداز ہوئی اور اسی رفتار سے تعمیر و ترقی کا کردار ادا کیا۔ ایسے معاشروں میں دراصل دل و دماغ اور جسم کے ناتے وقتی اور مادی رہتے ہیں۔ معیار بدلتے رہتے ہیں۔ عقلی اور روحانی واسطے کمزور ہونے کی وجہ سے ذہن انسانی کو ارتقائی منازل طے کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان کے برعکس آج کی دنیا میں موجود جاری و ساری مبنی برحق چار مقدس مذہبی صحیفے، توریت، زبور، انجیل، اور قرآن ابلاغ کی ٹھوس بنیاد رکھتے ہیں اور اپنے گزشتہ سے پیوستہ ہیں اور اس کے ساتھ اپنے عہد کی ترجمان بھی ہیں۔ ان صحیفوں کی اثر پذیری کو ان ادوار اور معاشرتی ارتقاء کو مدنظر رکھ کر دیکھیں تو ذہن یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ صحیفے پیغمبروں کی انسانیت کے ساتھ محبت اور حکم خدا کی بجا آوری کا نتیجہ ہیں، جن کی تعلیم سے معاشرہ سدھار کی طرف چلتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صحیفے سماج کی تہذیب کے لیے اللہ کے مبعوث پیغمبروں کے ذریعے عوام تک پہنچے۔ بلاشبہ ان کا ابلاغ ادبی لحاظ سے بہترین فلاحی پیغام ثابت ہوا۔ انسان نے ترقی کی، معاشرتی حیوان کے بجائے انسان بن کر نئی بستیاں بسائیں، قرن در قرن عروج آدمیت کی ذمہ داری سنبھالی، اپنی حیوانی کمزوریوں پر قابو پانا سیکھا کیونکہ اسے اشرف ہونے کے اعزاز پر پورا اترنا تھا۔ اشرف المخلوقات ہونا ہی انسان کا منتہائے کمال ہے تا کہ وہ ایک دن اس مقام پر پہنچ جائے جس پر وہ اپنے خالق سے ہمکلام ہو سکے وہ بھید پا سکے جو کائنات اور جملہ مخلوقات کی تخلیق کا باعث ہے۔

انسانیت کے قافلے کو ابھی گزشتہ صدی میں کڑی منزل درپیش رہی جسے لوگ تحریک سوشلزم کے نام سے یاد رکھیں گے۔ اس ازم نے ادب میں نہ صرف جگہ پائی بلکہ اس کی وجہ سے بہت سا زندہ ادب تخلیق ہوا جس نے مثالی معاشرے کے خواب دکھائے۔ دنیائے ادب اور دنیائے عمل پہلو بہ پہلو چلتے معاشرے کی تبدیلی کا باعث بنے۔ یہ تبدیلیاں جو پورے گلوب میں واقع ہوئیں ادب کے کردار کی گواہ ہیں۔ تاریخ کا جائزہ بتاتا ہے کہ ادب کسی نہ کسی طریقے سے اور کسی نہ کسی نہج میں انسان سے مخاطب رہا۔ باشعور مخلوق انسان، ہمیشہ ہی ادب کا موضوع رہی کیوں کہ انسان کو اپنے حواس کی تعلیم و تربیت کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حافظے، غور اور جستجو کی صلاحیت سے انسان جانتا ہے کہ خدا نے اسے نائب مقرر کیا۔ وہ اپنے ماضی سے سبق سیکھتا ہے اپنے حال سے ہنر کا اکتساب کرتا ہے، مستقبل کے خواب دیکھتا اس کی پرورش حیات ہے۔ یہ سبق، یہ ہنر اور پرورش خواب اسے ادب تخلیق کرنے پر آمادہ کرتا ہے، مجبور کرتا ہے۔ انسانی برادری کے صحت مند، غم گسار اور ہونہار افراد اس شوق جنون کے تحت یہ خوشگوار فریضہ ادا کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

دنیا ایک متحرک اور ارتقاء پذیر concept کا نام ہے اگر یہ متحرک نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ بدلنا اس کی نامیاتی صلاحیت ہے لہذا تحرک ہی اس کی زندگی ہے۔

ادب نے دنیا کو سماجی اور احیاء کا راستہ دکھایا اور وہ اس میں پیدا ہونے والے میکانکی، حادثاتی، یا تخلیقی "چپ" دور کرنے کی سعی کرتا رہا۔ اسے خوبصورت، سڈول بنانے کی تمنا اور کوشش اس نے کبھی ترک نہیں کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کا انسانی معاشرہ گزشتہ زمانوں کی نسبت زیادہ باخبر، صحت مند، خوبصورت اور مستحکم ہے، پراعتماد اور متحرک ہے، ستاروں پر کمندیں ڈالنا اس کی آرزو ہے۔ ادب کا رشتہ انسان کے ماحول، اس کی حساسیت اور تعلیمی اساس کے ساتھ نہایت گہرا ہے کچھ اس طرح کہ لکھنے والا خفیف سے خفیف اور معمولی بات کو غیر معمولی بنا دے۔ جس کا قاری پر ردعمل بقول غالب کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

میں یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ادب ایک ایسا تحرک ہے جیسے دریا میں موج جو دریا کی روئیدگی کناروں سے اچھال کر آس پاس کو سرسبز اور شاداب کر دیتا ہے۔ آگہی کی نمی سماج میں سوچ کی طاقت بن کر معاشرے کو آنے والے زمانے کے لیے تیار اور ہموار کرتی ہے اس لیے وہ تخلیق، وہ ادب جس میں آگہی کا عنصر کم ہوتا ہے وہ اپنے معاشرے اور ماحول کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتا لفظوں کا زیاں، ردی فروشوں کی کمزور معیشت کا سہارا بننے کے سوا کچھ نہیں کرتا جو تخلیق حیات سے حیات حاصل نہیں کرتی وقت گزرنے کے بعد اس کی اثر پذیری چھن جاتی ہے۔ اثر چھوڑنا اور اثر لینا ادب کی زندگی کا تقاضا ہے اور اس طرح کہ وہ ہر سے، سماج کی اونچ نیچ، بہاؤ، ٹھہراؤ، تعفن، اچھلتا، سچلتا، کو نظر میں رکھے اور اک سبھاؤ کے ساتھ ردعمل ظاہر کرے۔ یہی ادب کا آموختہ اور اپج ہے اسی اپج اور آموختے سے وہ بدلتی دنیا میں کردار ادا کرنے سے کبھی منحرف نہیں ہوگا۔

طاہر محمد خان

ادب کی ابتدائی ہیئت یونانی رزمیہ شاعری کی شکل میں نمودار ہوئی ،اس میں نہ صرف جنگوں کی تاریخ کا ذکر ہوتا بلکہ رنج والم کے جوش وجذبات کا اظہار بھی ہوتا۔ شاعری ہی ادب کہلاتی ،ارسطو نے بوطیقا تصنیف کی اس کی نظر میں کلام جو بہ ارادہ موزوں کیا ہو۔ شاعری ہے اگرچہ یونانیوں نے دنیا کو فلسفہ دیا اور آج سارے فلسفے کی جڑیں اس میں پیوست ہیں لیکن فلسفے کو ادب نہیں کہا گیا۔

ہندو لٹریچر مہابھارت ،اپنشد اور رامائن بھی آزاد بحروں میں شاعری ہے جو رزم و بزم کے ساتھ الہیات کا ذکرواذکار ہے۔ علامہ شبلی نے کہا کہ ''شعراء فارس کے نزدیک شاعری دراصل تخیل کا نام ہے'' لیکن نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں شعر کی تعریف میں کہا کہ'' جس سے محبت اور غضب کی قوت جذبات مشتعل ہو'' اس لئے جو بھی تحقیق یا تصنیف اگر ہمارے اندر کسی بقوعہ کے بیان سے محبت ہمدردی رقت یا نفرت یا غضب کے احساس کو بیدار کرے اور ہم مصنف یا شاعر کے احساس میں شریک ہوں وہ تحریر یقیناً ادب کی تعریف میں آتی ہے۔

مولانا شبلی مغربی علماء کی تقلید میں ادب کو محاکاسی بتاتے ہیں'' جیسے کسی نقش کو دیکھ کر سارا منظر ہماری آنکھوں میں اجاگر ہوتا ہے اسی طرح شاعر اور ادیب بھی جب الفاظ میں منظر کشی کرتا ہے تو اس شے کے اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے،اس پر شعر کی تعریف صادق آتی ہے۔ دریا کی روانی ،جنگل کا سناٹا ،باغ کی شادابی ،سبزے کی مہک ،خوشبو کی لپٹ ،نسیم کے جھونکے ،دھوپ کی شدت ،گرمی کی تمازت ، پہاڑوں کی ٹھنڈک ،صبح کی شگفتگی ،شام کی دلاویزی ، رنج وغم ،غیظ غضب جوش، محبت ، حسرت ،خوشی اور افسوس کو بھی ان مناظر کی طرح بیان کرنا کہ ان کی صورت آنکھوں میں پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہو''۔

مولانا شبلی کی جامع تعریف سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ادب کا دائرہ وسیع ہے۔ ادب پوری انسانی زندگی کو محیط کرتا ہے،ہمارے قدیم ادباء نے نہ صرف مذکورہ بالا موضوعات کو بلکہ اس سے آگے بڑھ کر رکھا ہے۔

اس کے لیے غالب نے کہا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

ہمارا شعور و ادب دین ،حمد و نعت ،منقبت ،سلام ،مرثیہ ،تاریخ ،اخلاقیات اور آداب محفل بھی شعور کو محیط کرتے ہیں یہ

اثرات ہمہ جہت نظر آتے ہیں غالب جیسے غزل گو شعرا بھی ان مضامین سے صرفِ نظر نہیں کر پائے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

اور منقبت کا یہ شعر:

مشکیں غلاف کعبہ علیؓ کے قدم سے جان
ناف ہرن نہیں ہے یہ ناف زمین ہے

فارسی اور اردو میں ایک عرصہ تک پند و نصائح، اخلاقیات اور مجلسی آداب مرغوب موضوعات رہے، مولانا رومی، عطار اور سعدی نے انہی امور کو اپنا ہدف بنایا۔ نثر میں بھی گلستان سعدی کے علاوہ اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی نے بھی شہرت دوام حاصل کی۔ اردو میں ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری میں اخلاقیات اور مشرقی آداب کو موضوع بنایا۔ ان کے ناول ابن الوقت اور مرأۃ العروس مغربی تہذیب اور پرورش نسواں کو زیر بحث لاتے ہیں جبکہ اقبال اور مولانا حالی نے مشرقیت اور اسلامی آداب اور اخلاق کو موثر طریقے سے بیان کیا ہے:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیلؑ
سنگ بنیاد کلیسا رہ گئی قوم حجاز

اکبر الہ آبادی اور نظیر اکبر آبادی انہی موضوعات کو بیان کرتے ہوئے طنز و مزاح کا نشتر استعمال کرتے ہیں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

آپ نے ملاحظہ کیا ادب زندگی ہے اور زندگی ادب، جب تک انسان موجود ہے اس میں خوب اور خوب تر کی جستجو موجود ہے۔ انہی باتوں سے اس کی محبت نفرت غیظ و غضب کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور جب یہ اظہار تلفظ کا روپ دھارتا ہے اور الفاظ عبارت بناتے ہیں تو ادب جنم لیتا ہے۔ ادب کا ظہور جاری رہے گا اس لئے میں یہ نہیں مانتا کہ آئندہ صدیوں میں بھی ادب کی تخلیق رک جائے گی یا ادیب کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ ہمیں ادب کی ضرورت ایسے ہی رہے گی جیسے تنفس کی یا جیسے نطق یا غذا کی۔

انسان کا المیہ یہ ہے کہ ادب کو تخلیق کرنے والے ہر دور میں رہے لیکن ادب کو پڑھنے والے، سننے والے اس سے لذت حاصل کرنے والے یا اس کو Appreciate کرنے والے خال خال رہے۔ ابتدا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ناخواندگی تھی، لفظ کی اہمیت نہیں تھی۔ تحریر کی قیمت نہیں تھی جس کی وجہ سے ادب و شعر کو حرمت حاصل نہیں ہو سکی۔ اب جب دنیا میں خواندگی بڑھ گئی تو انسان فکر روزگار میں الجھ گیا۔ فکر معاش اور اندیشہ اولاد نے اسے بری طرح گھیر لیا ہے، اسے عشق اور لطافت کی فرصت نہیں ہوتی بقول غالب:

گو میں رہا رہین ستم ہائے روز گار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لیکن بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو دنیاداری کے ساتھ ساتھ علم و ادب سے رشتہ مسلسل استوار رکھ سکتے ہیں یہ عدیم الفرصتی پہلے بھی رہی اور آج ذرا زیادہ ہے۔ اس وجہ سے کم خواندگی کے ساتھ وقت کا فقدان بھی لوگوں کو علم، ادب اور شعر و سخن سے دور رکھتا ہے۔

عصر حاضر میں ایک عنصر مزید شامل ہوا ہے جو مطالعہ سے دوری کا باعث بنا ہے جس کو مختصراً ناداری کہا جا سکتا ہے جبکہ ناداری، غربت، افلاس، قوت خرید اور دیگر حاجات میں اضافہ ہمارے دور کے عمومی اقتصادی حالات ہیں جس نے متوسط اور غریب طبقات کو اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ وہ اپنے ذوق مطالعہ کی تشفی کریں۔ اس وجہ سے ایک بڑا طبقہ ادب سے دور ہوتا جا رہا ہے اس پر طرفہ ستم یہ کہ مطبوعات کی قیمت بہت زیادہ ہے اور ہر شعبہ زندگی میں آئے دن درجنوں کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ نئی فکر کے ساتھ چلنے کے لیے جتنے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اتنا بحث اب الگ رکھنا مشکل ہو گیا ہے جس نے علم و ادب سے ہمارا رشتہ محدود کر لیا ہے اگر چہ آسودہ حال ملکوں میں ایسا نہیں۔ یورپ اور امریکہ میں لوگوں میں پڑھنے کی عادت موجود ہے اور وسائل کا فقدان مطالعہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

ذوق مطالعہ، علم و عرفان و آگہی ایک تہذیب کا نام ہے ہم مسلمانوں میں اس تہذیب کی پرورش کبھی نہیں ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ ناخواندگی رہی۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ مسلمانوں میں علم عقیدے سے وابستہ ہے۔ عام مسلمان صرف ان دلائل کو سنتا ہے جو اس کے عقائد کی تائید کرتے ہیں۔ ایسے دلائل یا ایسی گفتگو جو اس کے عقائد کی نفی کرتے ہوں یا قدرے ناقدانہ ہوں ان سے دور بھاگتا ہے، بلکہ ان کو کفر و گناہ سمجھتا ہے۔ ہماری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہر دور میں ایک سرکاری رویہ مروج رہا۔ صاحب اقتدار امیر یا خلیفہ اور ان کے گرد چاپلوس علماء اس کا پرچار کرتے، ان عقائد سے انکار کرنے والوں کو کافر اور گردن زدنی قرار دیتے۔ ان انکار سے اختلاف کرنے والوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ اس لیے ہر دور میں مروج فرقہ اور فرقہ وارانہ انکار کو ہی تقویت ملتی رہی۔ اس عمل کا آغاز خلیفہ مامون عباسی کے دورے سے ہوا جب اس نے امام الرضا کو اپنا جانشین مقرر کیا اور ان کے نام سے سکہ جاری کیا آگے چل کر اس نے اعلان کیا کہ خلفاء راشدین میں حضرت علی افضل ہیں انہی کے دور میں یہ بحث بھی شروع ہوئی کہ قرآن خلق ہے یا حدث ہے لیکن معاشرہ ان امور پر کھلم کھلا بحث کے لیے آمادہ نہیں تھا اس وجہ سے علماء وقت نے بغاوت کر دی۔ اگر چہ مامون بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن عقائد پر بحث بند نہ ہوئی اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے جس نے عقائد پر تحقیق یا تنقید کے دروازے بند کر دیئے، اگر چہ ماضی میں ان امور پر فرقے وجود میں آتے رہے لیکن ہر فرقہ اپنے محدود دائرے میں پابند رہا۔

علمی تحقیق و جستجو کے لیے آزادانہ فضاء کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں ایسی آزادی کبھی حاصل نہیں رہی اس نے جستجو تحقیق اور اظہار رائے کو بری طرح متاثر کیا۔ اس نے بھی تقابلی مطالعہ مشاہدے اور جائزے کی عادت کو ختم کر دیا۔ آج بھی عالم اسلام میں شاذ و نادر ہی کوئی عالم نظر آتا ہے جو مذہب کو تقابلی جائزے سے جانتا ہو۔ یہ تنگ نظری پیدا کرتا ہے اور ذوق علم کو نقصان پہنچاتا ہے۔

ایک وجہ ہمارا نظامِ تعلیم ہے۔ تعلیم اکتسابِ علم نہیں بلکہ تکمیلِ درس ہے۔ ہمارا طریقِ تدریس تشویش پیدا نہیں کرتا نہ جستجو کا راستہ بتاتا ہے۔ یہ تو صرف طالبِ علم کی انگلی پکڑ کر راستے ندی پار پہنچا دیتا ہے اور بس! طالبِ علم ڈگری یا ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد کبھی کتاب کھول کر نہیں دیکھتا!! ماشاءاللہ۔ اس سے اسکول کالج اور نہ اس کے بعد اسے ذوقِ مطالعہ رہتا ہے وہ صرف [illegible] ہم پر زندہ رہتا ہے۔ اسے کوئی پتہ نہیں کہ دنیا میں علمی میدان میں کیا ہو رہا ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ ہمارے ایک فیصد لوگوں نے انتہائی دلچسپ کہانیوں از قسم داستانِ امیر حمزہ یا الف لیلیٰ وغیرہ وغیرہ تک کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

آج کل تو کمپیوٹر آ گیا ہے جو چند جوان کمپیوٹر کی دنیا میں داخل ہوئے ہیں وہ اپنا زیادہ وقت کمپیوٹر گیمز، چیٹنگ یا عریاں گانوں اور فلموں کے سننے اور دیکھنے میں گزار دیتے ہیں۔ ایک تو وہ مطالعہ سے دور ہو گئے ہیں اور جو علم و ادب اور سائنس کمپیوٹر فراہم کرتا ہے اس سے بھی بے بہرہ ہیں۔ چند امور گنوائے جن کے اغماض نے ہمیں علم و ادب سے بیگانہ کر دیا ہے اگر ان کی نفی سے ہم علم سے دور ہوئے ہیں تو ان کے اثبات سے یہ دوری کم ہو سکتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ زبان ہی وہ اوزار Instrument ہے جس کی بدولت انسان ایک دوسرے کے خیالات اور ذہنوں میں مقید افکار کو بات چیت کے ذریعے سے سمجھنے کے قابل ہے۔ نیز زبان ہی انسان کے لئے سب سے بہترین عطیہ خداوندی ہے جس کی بدولت نہ صرف یہ دیگر جانداروں سے ممتاز و ممیز ہے بلکہ آج کی یہ تمام تر ترقی زبان ہی کی مرہون منت ہے۔ زبان واحد ذریعہ ہے جو خیالات کو الفاظ کی مدد سے منتقل کرنے کا کام سرانجام دیتی ہے۔ زبان صرف پیار و محبت کا درس دیتی ہے اور یہ کسی بھی حالت میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے نفرت نہیں سکھاتی۔ تاہم اگر معاشرے میں کوئی فرد واحد اس نعمت خداوندی اور عظیم انسانی ورثے کو تعصب اور انتقام جوئی یا دہشت گردی کا ذریعہ بنائے تو اس کا یہ فعل معاشرے میں قابل نفرت اور قابل مذمت گردانا جاتا ہے۔

اس لئے کہتے ہیں کہ زبانیں محبت کا درس دیتی ہیں اور اپنے بولنے والوں کو قریب تر بناتی ہیں۔ زبان جہاں ایک عطیہ خداوندی ہے، وہاں یہ ایک شاہکار تخلیق بھی ہے جو انسان کو دیگر جانداروں سے ممتاز بنا کر ان پر حکمرانی کرنے اور انہیں اپنے طابع رکھنے کا ذریعہ ہے۔ انسان اپنی تمام تر ترقی اور برتری کے لئے زبان ہی کا مرہون منت ہے اگر چند لمحوں کے لئے انسانوں کی قوت گویائی معطل کی جائے تو یہ تمام سائنس اور ٹیکنالوجی اور ترقی کے طے ہوئے منازل دھڑام سے نیچے آجائیں، لہذا زبان ہی وہ قوت ہے جو فرد کو معاشرہ ساز بناتی ہے۔

ہر معاشرے میں انفرادی آزادی ہر انسان کا بنیادی اور پیدائشی حق ہوتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک معاشرے کے اندر کوئی بھی فرد تنہا زندگی نہیں گزار سکتا اور نہ ہی وہ سب لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ایسے میں انسانوں کا ایک دوسرے سے میل ملاپ اور آپس میں میل جول زبان ہی کی بدولت سے ممکن ہوا ورنہ زبان کے بغیر انسانی معاشرہ ایک بے ہنگم انتشار کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

کہتے ہیں انسان کی دنیا میں دو بڑی ضروریات ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہیں جو زندگی کی بقاء کے لئے ناگزیر ہیں جبکہ دوسری وہ ہیں جو تہذیب و تمدن اور تہذیبی ورثے کی تحفظ اور فروغ کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہیں، چونکہ معاشرہ یا سوسائٹی افراد سے تشکیل پاتے ہیں اور افراد ہی کی ترقی اور تحفظ کے لئے ہوتے ہیں لہذا افراد کی بہتر زندگی کے لئے اور معاشرہ میں نظم و ضبط اور شعوری ارتقاء کے لئے افراد کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ٹھہرتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ دنیا بھر کی ترقی یافتہ اقوام

نے اپنی ہی زبانوں میں تعلیم حاصل کر کے ترقی کی ہے۔ بقول ایک جاپانی دانشور کے کہ جاپان کی ترقی راز یہ ہے کہ جاپانی قوم ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم تک جاپانی زبان میں ہی حاصل کرتی ہے۔لہٰذا معاشرہ کی ترقی کے لئے زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

معاشرے میں انسانوں کا ایک دوسرے سے ملاپ بھی زبان ہی کا مرہون منت ہے اور زبان ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جو معاشرے میں ایک انسان کو دوسرے انسان کے قریب لاتا ہے، جس سے ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے کا شعور ابھرتا ہے۔لہٰذا افراد اور معاشرے کے درمیان رابطہ کا ایک بڑا ذریعہ خود زبان ہوتا ہے۔

بدلتی دنیا میں ادب کے کردار کے تعین سے پہلے چند باتوں کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا دنیا نے جس قدر تیزی سے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ اور جس تیز رفتاری سے سمٹ کر خال محبوب کی مانند ایک نکتہ پر مرتکز ہوتی جا رہی ہے۔ جہاں دنیا پہلے تو سمٹ کر ایک خلق (گاؤں) اور اس سے بھی سمٹ کر ایک کا نچ اور اب مزید سکڑ کا صرف ایک کلک (Click) کے فاصلے پر رہ گئی ہے۔ کیا سب کچھ ادب اور ادیب کے بغیر ممکن ہوا ہے، ناممکن ہے بلکہ یہ سب ارتقائی مراحل انسان نے ادیب کی رہنمائی اور ادب کی سیڑھی پر چڑھ کر طے کئے ہیں۔ کسی بھی زبان کے ادبی اقدار کا تعین اس زبان میں تخلیق ہونے والا ادبی مواد اور اس کی ہیت سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ ادبی اقدار بھی سماجی اور معاشرتی قدروں کی طرح ارتقاء پذیر ہوتی ہیں اور یہ بنیادی قدریں کسی بھی دور میں نہیں مٹتیں، البتہ ان میں سے کچھ پس منظر میں چلی جاتی ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں غالب اقدار غلبہ پا لیتی ہیں۔

جناب اشرف بخاری اپنے ایک تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں کہ" زمانے نے ہزاروں کروٹیں بدلیں سیاسی و سماجی تغیرات نے ایک عالم کو زیر وزبر کر دیا لیکن اس کے باوجود کئی چیزیں ایسی ہیں جنہیں حوادث ایام کا سیل تند و تیز اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکا، وہ اس طرح قائم و دائم ہیں۔ واردات حسن و عشق ہوں کہ ہجر و وصال کے قصے، یاس و امید کی الم انگیزیاں ہوں کہ نیاز و ناز کی داستان طرازیاں غرض یہ کہ حسن و عشق کا پورا کارخانہ اب بھی وہیں ہے جہاں آج سے ہزاروں سال پہلے تھا۔

نہ وہ بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیوں کر اعتبار انقلاب آسماں کر لوں

علاوہ ازیں حریت و آزادی، انسان دوستی اور حب الوطنی کی قدریں ہر دور میں معظم و محترم رہی ہیں۔ صداقت و اخلاص نیکی اور عفو و درگزر کی قدریں ہر دور کے انسان کا طرہ امتیاز رہی ہیں۔ ادیب چاہے مشرق کے ہوں یا مغرب کے، ان کا موضوع یہی اقدار رہی ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ادب کی تاریخ پر نظر دوڑائیے یہی قدریں جملہ مذاہب اقوام میں قدر مشترک اور ذریعہ شناخت و پہچان ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی اقدار دراصل ادب کی دائمی، مستقل اور بنیادی اقدار ہیں جو ہماری زندگی اور ہماری معاشی، معاشرتی اور سماجی اقدار کی آئینہ دار ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے کہ دائمی اقدار ہی عالم انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہیں اور ہر اچھے ادب کی بنیاد ان عالمگیر صداقتوں پر استوار ہے۔

عصری تقاضوں کا تعین کچھ آسان نہیں تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگ ان سے ایک خاص دور کے سیاسی و سماجی اور معاشرتی تقاضے مراد لیتے ہیں جبکہ بعض انہیں ادبی فنی اور تہذیبی صورت حال کے مترادف سمجھتے ہیں۔ بہرحال عصری تقاضے

صرف سیاسی صورت حال کا نام نہیں بلکہ وہ موجودہ دور کے جملہ احوال وکوائف سے عبارت ہیں، جن سے ہماری زندگی بالواسطہ متاثر ہوتی رہتی ہے۔ ادیب چونکہ معاشرے کا سب سے روشن ضمیر، حساس اور زندہ فرد ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے گردو پیش کی دنیا اور اپنے عہد کے تقاضوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر نہ ہو، چنانچہ ہمارے ادیب کو آج جس صورت حال کا سامنا ہے اور ہمارے قریب و جوار میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ آج کا ادیب جو لکھے، اس میں اقدار کی رہنمائی اور سر بلندی شامل ہو۔

ایسے میں بدلتی دنیا میں ادیب نے جہاں انسان کی سماجی شعور کی بیداری اور اس کی مادی ترقی میں معاونت کرتا ہے وہاں اس پر یہ بھاری ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ اس نے دنیا کو امن کا گہوارہ بنانا ہے۔ جہاں کسی ایک قوت کو منہ زور گھوڑے کی طرح بے لگام نہیں چھوڑنا ہے وہاں معصوم اور مظلوم انسانوں کو بھی یہ باور کرانا ہے کہ اس میں انہیں بھی جینے کا اتنا حق ہے جتنا ایک طاقت ور کو۔ معاشرہ آج بھی اپنے ادیب سے ناامید نہیں بلکہ یہی وہ طبقہ فکر ہے جس سے امیدیں وابستہ ہیں کہ اس نے دنیا کو ایک بار پھر امن کا گہوارہ بنانا ہے اور سماجی اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف اپنے قلم کو استعمال کرنا ہے۔ جہاں معاشرہ ادیب سے ناامید نہیں وہاں ادیب بھی معاشرے سے ناامید نہیں ہے کیونکہ ادیب خود بھی معاشرے کی پیداوار ہے اور معاشرے ہی کی بہتری کے لئے ادب تخلیق کرتا ہے۔ ایسے میں جہاں ادیب پر معاشرہ کے اثرات سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا۔ وہاں ادیب معاشرت کو متاثر بھی کرتا ہے اور معاشرے کے لئے نئی راہیں متعین کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شائد انسانی تاریخ میں ادیب پر اس قدر بھاری ذمہ داری عائد نہیں ہوئی ہوگی جس قدر اس وقت عائد ہوتی ہے۔ پوری دنیا میں لوگوں کی نظریں اپنے اہل قلم اور دانشوروں پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ اس تیز رفتار ترقی کے عہد میں انسان کو انسان سے بچانے کے لئے لفظ کو کس طرح کام میں لاتے ہیں اور ان کا یہ عمل کیا واقعی دنیا میں امن و سلامتی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں اور قاری کی توقعات بھی۔ اب ادیب کو نہایت جرأت اور بیباکی سے حق اور سچ کو سچ کہنا پڑے گا ورنہ اس عہد کے ادیب کو آنے والا عہد کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔

ڈاکٹر سلمیٰ شاہین

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار، اگر موضوع کے سماجی اور تاریخی پس منظر کو دیکھا جائے تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کیونکہ ادب کا تعلق انسانی جذبات اور احساسات سے ہے۔ جب سے دنیا وجود میں آئی اور جب سے انسان نے جنم لیا، جب سے وہ رویا، جب سے وہ چیخا، جب اسے تکلیف ہوئی، جب اس نے پکارا، جب اس نے بولنا سیکھا اور اپنے درد اور خوشی کو شیئر کرنے لگا، تب سے ادب کی تخلیق ہوئی۔ صدیوں سے ادب معاشروں میں، قوموں میں، ملکوں اور دنیا میں ایسا ہی کردار ادا کرتا چلا آ رہا ہے جیسا ایک ماں بچے کی زندگی بنانے اور سدھارنے میں ادا کرتی ہے، اس کی نگرانی کرتی ہے اس کو خطروں سے آگاہ کرتی ہے، اس کو برائیوں سے روکتی ہے، اس کی رہنمائی کرتی ہے اور اس کو زندگی کی حقیقتوں سے خبردار کرتی ہے اور چیلنجوں کا سامنا کرنے کی جرات سکھاتی ہے۔

ادب نے انسانوں کا مشکل ترین وقتوں میں ساتھ دیا، رہنمائی کی، تمام انسانیت کو زوال سے بچانے کی کوشش کی، اس کی روحانی تربیت کی اور سکون بخشا دلوں میں محبت، ایثار، وفا، حب الوطنی جدوجہد کے جذبوں کو زندہ رکھا، عوام کو شعوری بیداری دی، فکری آگہی سے روشناس کیا۔ وہ مسائل سے نجات کے لیے، انصاف کے حصول کی خاطر، معاشی برابری کے لیے، ظلم واستبداد کے خلاف، غربت، جہالت پسماندگی، قدامت پرستی، روایت پرستی کے خلاف لڑتا ہوا اس نتیجے تک پہنچا کہ عالمی امن اور خوشحالی کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ، استحصالی قوتوں سے نجات، مضبوط معیشت کا یقینی ہونا، انسانی حقوق کی پاسداری اور بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا ضروری ہے۔

ادب بھی انسانوں کی طرح حوادث کا شکار ہوتا رہا ہے۔ بڑی بڑی سیاسی، معاشی، معاشرتی، اصلاحی، صنعتی، ادبی، مذہبی، تاریخی، تحریکوں اور انقلابات کی بنیاد intellectual سوچ سے پیدا ہونے والا ادب ہوتا ہے جو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل اور انفرادی اور قومی بحرانوں کا نتیجہ ہوتا ہے، انسان، قدرت اور زمانے میں بدلنے کی زبردست لچک موجود ہے۔ ہر تبدیلی کو قبول کرنا ضروری بھی ہوتا ہے، مجبوری بھی اور فطری بھی۔ اس لئے کہ ہر تبدیلی انسانی ارتقاء، بقا، تکمیل اور بھلائی کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ زندگی کبھی بھی غیر متحرک نہیں رہی۔ نئے تجربے، نئی حقیقتوں کی تلاش میں انسانی عقل، فکر، ذہن نئے راستوں کو تلاش کرنے لگتے ہیں اور اسی تلاش میں نئے خیالات کی شمع روشن کرتے ہیں اور

آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔اس طرح ادب میں سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بدلتا ہے۔موضوع بدلتے ہیں اظہار کے طریقے اور ذریعے بدل جاتے ہیں اوراس سارے عمل میں ایک ادیب، شاعر، دانشور جو اپنے ماحول سے کبھی غافل نہیں ہوسکتا مصلحت کئے بغیر اپنے جذبات واحساسات کا جرات اور بے باکی سے اظہار کرتا ہے۔وہ جہاں رہے گا اس ماحول کا تابع ہوگا جس طرح اس کا ماحول ہوگا۔جیسا معاشرہ ہوگا وہ ویسا ہی ادب تخلیق کرے گا اوراس معاشرے کی ترجمانی وعکاسی کرے گا۔وہ جس دنیا میں رہ رہا ہے اگر اس کے اردگرد چیخ پکار، بھوک، افلاس، تڑپنا اور سسکنا ہوگا، اس نے وہی لکھنا ہے۔اگر وہ کسی خوشحال دنیا کا فرد ہوگا تو پھولوں، خوابوں، خیالوں، محبتوں اور روشنیوں کے نغمے گائے گا۔بس دونوں حالتوں میں وہ اپنے خیالات ومحسوسات جب دوسروں تک پہنچائے گا وہی اس معاشرے کی صحیح تصویر ہوگی، اور یوں ادیب، شاعر اور دانشور لوگوں کے درمیان مسائل کی وضاحت، ان کو علم دینے، ان کو سمجھنے اور سمجھانے اور Educate کرنے کا سبب ہوگا ۔ادیب عوام کو سمجھاتا ہے۔اپنی سوچ سے لوگوں کی سمجھنے کی قوت کو تیز کرتا ہے۔مسائل سے نمٹنے اور نکلنے کی راہ سجھاتا ہے۔ اسطرح ایک تخلیق کار ادیب شاعر اور دانشور عوام کی سوچ، رویوں اور ذہنوں کو لمحوں میں تبدیل کرکے ان کو عمل کرنے کے لیے آسانی سے تیار کرلیتا ہے۔

ان لوگوں کا تعلق معاشرے کے اس حساس طبقے سے ہوتا ہے جو ظلم جبر مصیبتوں کو برداشت نہ کرتے اور نہ مانتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو برائی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔وہ برے معاشرے میں رہتے ہوئے ان کے بھلائی کی فکر کو مقصد بنائے ہوئے کوئی Compromise نہیں کرتے اور یوں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بھی وہ مطمئن ہوتے ہیں۔زمانوں سے حکمرانوں سے ٹکراتے ہیں اور زندگیاں، جوانیاں گنوا دیتے ہیں۔فیض احمد فیض، حبیب جالب، قلندر مومند، اجمل خٹک، رحمت شاہ سائل، غنی خان اس قافلے کے چند لوگ ہیں کیونکہ ان کا مقصد عوامی ہوتا ہے۔انہوں نے دنیا کو بدلنا ہوتا ہے۔

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا
آؤ دنیا ہمارے ساتھ چلو

ادب تخلیق کرتے ہوئے ادیب مشرق ومغرب، کالے، گورے، مذہب، نسل، زبان کی تفریق سے بالاتر ہوتا ہے۔اس لئے کہ وہ انسان ہے۔اس کا مقصد انسان کی خوشحالی اور آسودگی ہوتی ہے کیونکہ خدا نے سارے انسانوں کو ایک جیسا پیدا کیا ہے ۔آج تک کسی مذہب اور کسی ادب میں انسان کی تذلیل، دل آزاری اور تکلیف کو جائز نہیں سمجھا گیا۔

ادب میں مزاحمتی ادب، ادب میں بغاوت، ادب میں مارکسزم، ادب میں ترقی پسندی، ادب میں کلاسیکزم، ادب میں Romanticism وغیرہ بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔

اگر معاشرے میں ہیروئن کی وباء پھیل گئی تو اصغر ندیم سید "رگوں میں اندھیرا" ڈرامہ لکھے گا، اگر پاکستان کے لوگوں کو آزادی نصیب ہوتی ہے تو قدرت اللہ شہاب "یا خدا" لکھ کر کچھ چہروں کو بے نقاب کرے گا۔

اگر جاگیرداری نظام غریبوں کے کمر توڑ ڈالے گا تو "وارث" تخلیق ہوگا، اگر کوئی عورت مظلوم ہوگی تو "امراؤ جان ادا" قصہ لکھا جائے گا۔ملک میں ہارس ٹریڈنگ ہوگی تو رحمت شاہ سائل کو حق ہے، جو کہتا ہے۔

پرون په ښو مره لويه بيمه خو ښدل سرونه
مونږ لوی پو چې ښايه مو شپندل سرونه

پشتو کا شاعر اپنی دنیا کی بات کرے گا:

ستا سپورے زلفے زماو چې شوندے
ددې وطن دغريبي لمخمې دی

اور فیض احمد فیض کے نظم کے کچھ مصرعے امر بن کر تاریخ کا دلوں کا محبتوں کا اور سوچ کا رخ تبدیل کر دیتے ہیں۔

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس گلوبلائزیشن میں اکیسویں صدی میں ہمارے ادیب کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے، وہ مشرقی دنیا کے معاشی اور سیاسی مسائل جو کہ غربت و جہالت ہیں۔ان کو ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے جس میں ایروچ جذبات کی بجائے سائنسی ہو اور اپنے وسائل یا بین الاقوامی ذرائع سے ان مسائل سے چھٹکارا حاصل ہو سکے۔ دنیا کی تہذیبوں کے درمیان Clashes ہیں اور جو دوریاں ہیں ان کو کم کیا جا سکے اور دنیا کے لوگوں میں انڈرسٹینڈنگ اور نزدیکیت کی فضاء قائم ہو سکے۔ کیونکہ دانشور یا intellectual اگر مغرب کا ہے یا مشرق کا سب کا مقصد دنیا میں امن اور خوشحالی، بھائی چارہ دیکھنا ہے اگر مشرقی افریقہ میں کوئی مرتا ہے۔ کہیں نسل کشی ہو رہی ہے۔ یورپ یا نارتھ امریکہ میں دھماکے ہو رہے ہیں۔ عراق میں خون ریزی ہے یا افغانستان میں سیاسی عدم استحکام ہے۔ سارے بین الاقوامی گلوبل ولیج کے مسئلے ہیں۔ان کو ہمدردی سے حل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

ان سب مسائل میں شاعر اور ادیب کا کردار اتنا اہم اور اتنا ضروری ہے جیسا کہ ایک سیاسی اور معاشی Expert کا ہے۔

میں اپنے مقالے کا اختتام ایک ہزار سال قدیم ایک پشتو ٹپے سے کروں گی جس میں ایک دوست دوسرے دوست کے لئے صرف محبت کا جذبہ رکھتا ہے، جو زبان نسل اور مذہب سے بالاتر صرف محبت کی زبان سے مخاطب ہے۔

يار مې هندو زه مسلمان يم
ديار دپاره درمسال جارو کومه

ڈاکٹر حیدر سندھی

اگرچہ پاکستان کی اپنی عمر ابھی ایک صدی کو نہیں پہنچی لیکن پاکستان کے لوگ جنہوں نے پاکستان بنایا وہ ہزاروں سال قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں کا تسلسل ہیں۔ کوئی بھی تہذیب مجموعہ ہوتی ہے ثقافتوں کا جبکہ ثقافتیں پیداوار ہیں معاشروں کی۔ تہذیب اور ثقافتیں زمین پر پروان چڑھتی ہیں اور دھرتی پر پروان چڑھنے والی تہذیب و ثقافت کی تشکیل وہاں پر آباد معاشرے کرتے ہیں۔ تخلیق و تشکیل کا یہ عمل مادری زبان کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ انگریزی دنیا کے اکثر ممالک کی ضرورت بن چکی ہے، فرنچ مدتوں سے کئی مسلم ممالک سمیت سب کی ضرورت بنی رہی، ترکی برصغیر میں مدتوں تک حکمرانی کرتی رہی، فارسی صدیوں تک وسطی ریاستوں اور برصغیر میں علمی اور ادبی ماحول پر چھائی رہی لیکن اصل ادب کا تخلیقی عمل یہاں کی مادری زبانوں کے بغیر تشنہ رہا۔

چنانچہ کہنا یہ چاہیے کہ معاشروں کا ادب وہی بقادار اور پائیدار ہوتا ہے جو کہ مادری زبانوں کے باطن سے جنم لیتا ہے اور مادری زبانیں زمین کے بغیر اپنی خوشبو برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ جس معاشرے کی جڑیں اپنی زمین میں اور جس ادب کی آبیاری معاشرے کے خون سے کی گئی ہو وہ اپنے تخلیق کرنے والے معاشرے کی مہک لیے ہوتا ہے۔ ایسا ادب اپنے تخلیق کرنے والے معاشرے کے احساسات، تخیل، تصور، اعتقادات، عبادات، جذبات، کیفیات اور غم و خوشی کا حاصل اظہار موثر و مناسب الفاظ میں ڈھال پاتا ہے۔ ادبی صنف کوئی بھی ہو اور ادب تحریری خواہ غیر تحریری ہو لیکن اس میں مہک اپنی زمین اور ثقافت کی رچی بسی ہوتی ہے۔

ماہرین علم الانسان کا دعویٰ ہے کہ "جو قومیں اپنی زمین کی مالک، پختہ تہذیبی ورثے کی وارث اور بقا دار ادب کی خالق ہیں ان کی زبانیں ہی ان کے وجود اور ہستی کی ضامن ہوتی ہیں۔"

سرزمین پاک پر آباد لوگوں کی بھی اپنی تہذیب، زبانیں اور ادب ہے جو کہ اس دھرتی پر رہنے والے باشندوں کی شناخت ہے۔ مذکورہ تہذیب کی پرورش کرنا ان مکینوں کی ذمہ داری رہی ہے کیونکہ ان کا وجود ان کی تہذیب کا تسلسل ہے اگر تسلسل باقی نہ رہ سکتا تو وجود بھی خود بخود دفن ہو جاتا لہذا تسلسل کو برقرار رکھنے والی یہ زبانیں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں کیونکہ یہ زبانیں ہی اپنے بولنے والوں کی شناخت اور ضمانت ہیں۔

پاکستانی ادب کی تخلیق بھی اس تہذیبی تسلسل کی پیداوار زبانیں ہیں۔ جن میں اس کے تخلیق کاروں کا دکھ درد، مسائل اور حل

، جرات اور خوف، غم و خوشی، احساس و جذبہ، عقیدہ اور بھروسہ معاشرے کے وجود کی طرح نمایاں نظر آتا ہے۔ صدیوں کے تجربات اور عمل نے ہمارے اس جاندار ادب کو پختگی اور استحکام بخشا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارا یہ ادب کبھی آزمائش اور امتحان سے ہمکنار نہیں ہوا۔ دراصل جتنے مسائل و مشکلات سے اس کی تشکیل کرنے والے معاشرے اور اسے برقرار رکھنے والی زبان گزری ہے وہی نشیب و فراز اس ادب نے بھی عبور کئے ہیں۔ اس کا وجود خود اس میں اور اس کی خالق زبان میں اعلیٰ قوت مدافعت کی گواہی ہے۔

ایسی گواہی اس کے تاریخی تناظر سے بھی ملتی ہے لیکن یہ تاریخ ادوار کی مصلحت کوشی اور ملمع سازی کا شکار اور ہمیشہ نزاعی کیفیات سے ہمکنار رہتی ہے۔ اس کے برعکس ادب کھرے موتیوں اور جواہر پاروں کی مانند ہے جس میں کسی قسم کا کھوٹ شامل کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

وجہ یہ ہے کہ تاریخ کی آبیاری سیاسی سرچشموں سے ہوتی ہے جبکہ ادب کو توانائی اور تازگی اسے تخلیق کرنے والے معاشرے کے خون سے ملتی ہے۔ اس دلیل کا ثبوت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کا کلام، خوشحال خان خٹک کی شاعری، بلھے شاہ کے ابیات، مست توکلی اور خواجہ غلام فرید کا پیغام اور علامہ اقبال کے تخیل سے ملتا ہے۔ ان تمام تخلیقات کے پس منظر میں تاریخی تحریکیں، سیاسی تجربات اور مشاہدات و مطالعہ موجود ہیں جنہیں کسی بھی دور کی گرد چھپا نہیں سکی۔

ایسے لازوال و آفاقی ادب کے خالق اگرچہ افراد ہی ہیں لیکن اس کا محافظ پورا معاشرہ ہوتا ہے جو ایسے ادب کی حفاظت اپنے وجود کی طرح کرتا ہے کیونکہ اس ادب میں عوام کی اپنی آہ و بکا، منشاء و مرضی، امنگ اور دل کی دھڑکنیں شامل ہوتی ہیں، اس طرح کے اجتماعی غرض و غائیت کے حامل ہمارے ادب کی ہر بار تخلیق نہیں ہوتی البتہ کبھی قلم کی تکمیل میں ادب کا نام لیکر کوئی تحریر اپنی مکروہ شکل سامنے لیکر آئے تو ایسے مکروہ چہرے کے حامل اوراق پنساری اور پان کی پڑیاں بنانے میں کام آتے ہیں، جو اس کی موت ہوتی ہے۔ ایسی موت اسے وجود میں آتے ہی مل جاتی ہے اس لیے نہ اس کا حوالہ ہوتا ہے اور نہ جدید ادب پر اس کا سایہ پڑتا ہے۔

پاکستان میں تشکیل پانے والے جدید ادب کی عمارت میں اپنے کلاسیکل ادب کا رنگ و روغن استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اسلوب اگرچہ بدلتی ہوئی رتوں کے مطابق ہوتا ہے مگر اس کے آہنگ میں اپنی اساس شامل ہے۔ وقت سے مطابقت والے جدید رنگوں سے آراستہ مگر قومی امنگوں کا حامل ہونے کا باعث ہمارا یہ جدید ادب نہ صرف نئی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے بلکہ آنے والوں کی رہنمائی کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کی روح کو مجروح ہونے سے بچانا معاشرے کا کام ہے۔ ہمارا کلاسیکل اور جدید دونوں طرح کا ادب ہمارے ملکی حالات کی طرح پل صراط پار کرنا چاہتا ہے تو ازن میں معمولی بگاڑ آ جانے سے یہ اتھاہ گہرائی میں اپنا وجود ہی گم کر بیٹھے گا۔ دور حاضر میں تخلیق پانے والا ادب اگر معاشرے کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا، جدیدیت کے نام پر وطنی تقاضوں اور ثقافتی ماحول سے عاری ہوگا تو اسے معاشرے میں کسی قسم کی قبولیت نہیں ملے گی۔ نتیجے میں ملکی مفاد کے بغیر عوامی عدم دلچسپی کی حامل تخلیق بے مقصد بن جائے گی۔ اس ادب کا توازن برقرار رکھنا اس کے معاشروں کی اولین ذمہ داری ہونی چاہیے تاکہ جہاں زبانوں کی اعلیٰ صلاحیتیں برقرار ہیں وہاں ان زبانوں کے بولنے والوں کے صفحہ ہستی پر زندگی کی ضمانت بھی ملی رہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ایم اقبال نسیم خٹک

ادب کیا ہے؟ ادب کا بنیادی مقصد کیا ہونا چاہیے، ادب کا زندگی کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ اس قسم کے سوالات کے جوابات پہلے بھی حل طلب تھے اور اب بھی ان سوالات کا قطعی واضح جواب دینا ممکن نہیں کیونکہ حالات کو موسموں کی طرح بدلتے دیر نہیں لگتی پھر یہ کہ ہر گزرے ہوئے دور کے لیے آنے والا دور نیا ہوتا ہے۔ نیا دور لوگوں کی امیدوں کا محور بنتا ہے اور ادب بھی ان تبدیلیوں سے مبرا اور محفوظ نہیں رہ سکتا۔

دراصل ادب کا لفظ بڑا جامع ہے یہ ہماری تہذیبی، علمی، روحانی معاشرتی جمالیاتی اور انسانی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے ادب کی مثال ایک آئینے کی ہے جو ایک ادیب اپنے دور کے لوگوں کو دکھاتا ہے۔ ادب معاشرے کا ضمیر ہوتا ہے اور ادب ہماری تمدنی اقدار کو زندہ رکھنے کے لیے آکسیجن کا کام کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تخلیق کار، فنکار یا ادیب بھی ایک فرد ہوتا ہے جو کسی نہ کسی جغرافیائی خطہ میں زندگی گزارتا ہے اور اس خطہ میں بسنے والے لوگوں کی تہذیب اور تمدن کے اثرات قبول کرتا ہے۔ اب اگر ایک ادیب آزادی کی فضاؤں میں سانس لیتا ہے، اس کا قلم آزاد ہے، اس کی تحریر و تقریر پر کوئی پابندی نہیں تو وہ صحیح سوچ کے ساتھ معاشرے کی رہنمائی میں اپنے حصے کا کردار ادا کر سکے گا۔ ایسے ادیب کے قلم سے نکلا ہوا ادب یقیناً صحت مند بھی ہوگا اور افادیت سے بھرپور بھی ہوگا اور روشن مستقبل کا ضامن بھی ہوگا۔ اس کے مقابلے میں وہ ادیب جو درباروں کے طواف کا عادی ہو تو اس کی مثال چڑیا گھر کے شیر کی ہوگی یا لوگ اسے دو نمبر کا ادیب پکاریں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ادب حکمرانوں کے قصائد کہنے کا فریضہ ادا کرتا ہے یا اسے معاش کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ وہ ادب نہیں بلکہ احرار کے حق میں زہر قاتل ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ غلام ذہنیت رکھنے والے ادیب بھی صحیح اور صحت مند سوچ سے عاری ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں جو کبھی ناخوب ہوتا ہے وہی بتدریج خوب ہو جاتا ہے۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں:

جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

یہاں تک کہ غلامی کی زندگی بسر کرنے والے حافظ قرآن کا دل بھی لذت ایمانی سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ وہ ادیب جو اپنے ضمیر کا سودا کر کے ادب کو چند کوڑیوں کے عوض بیچتا ہے یا ادب کو مالی فوائد کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے، خوشحال خان خٹک نے

ایسے ادیبوں اور شاعروں کی خوب خبر لی ہے کہتے ہیں کہ "ایسے شاعروں کے چہرے سیاہ ہوں جو معمولی فائدے کی خاطر درباروں میں کشکول لیے پھرتے ہیں" اور بقول صاحبزادہ فیضی مرحوم "جن لوگوں کے سینوں پر حسن کارکردگی کے تمغے سجے ہیں یہ تمغے درباروں میں ان کی جاروب کشی کی غمازی کرتے ہیں۔"

ادب نے ہر دور میں اپنا کردار ادا کیا ہے، کردار ادا کرتا رہا ہے اور کردار ادا کرتا رہے گا مگر سوال یہ ہے کہ کیا کبھی ادیب کو کسی نے معاشرے کا دیدہ و بینا تسلیم بھی کیا ہے۔ کیا ہم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ادب معاشرے کے تہذیبی ارتقاء کی کسوٹی ہے مگر اس کسوٹی کا تعین کون کرے گا؟ یہ پیمانہ کس کے اختیار میں ہوگا کہ اچھا اور معیاری ادب کونسا ہے اور غیر معیاری، فسادی اور بے مقصد ادب کونسا ہے؟

مانتا ہوں کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں تخلیق ہونے والا ادب صرف علاقائی ادب نہیں بلکہ اسی ملک کا ادب ہوتا ہے اور "اب چونکہ دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ویلج بن گئی ہے، لہذا ایسا ادب آفاقی ادب کا جز تصور کیا جائے گا، اس لیے ہمارے ادیب کو اپنے چھوٹے خول سے لازماً نکلنا پڑے گا اور اپنے افکار میں آفاقیت پیدا کرنا ہوگی۔ اگر ایک ادیب کے تخلیق کردہ ادب میں بھوک، غربت، جہالت، دہشت گردی، غلامی، نسلی امتیاز، حسد، بغض، استحصال، توسیع پسندی، آمریت سے نجات اور انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف جہاد کرنے کا رجحان نہ ملتا ہو تو ایسے ادب کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسی طرح اگر ایک ادیب کے تخلیق کردہ ادب میں معاشی مساوات، انسان دوستی، امن و آشتی، رواداری، بھائی چارے، عالمگیر محبت کا پیغام، زندگی کو خوبصورت بنانے کا عزم، دنیا کے تمام ممالک کے درمیان برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار کرنے، انسان کے بنیادی حقوق کے تحفظ اور ساتھ ساتھ انسان کے جمالیاتی ذوق کو اجاگر کرنے کا رجحان ملتا ہو تو ایسا ادب با مقصد، معیاری، ہر دلعزیز، دلپذیر اور افادیت سے بھرپور تصور کیا جائے گا، اور اگر بدلتی دنیا میں ادب ان اصولوں کو سینے سے لگا کر آگے بڑھے تو گویا ادب نے اپنا فرض ادا کیا۔ مگر یہی فرض تو ہمارے ادیب ماضی میں ادا کرتے رہے ہیں اور خاص کر جب ہم ادب کے قرآنی اور اسلامی تصور کا ذکر کرتے ہیں تو بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں حضورؐ سے ارشاد فرماتا ہے "اور لوگوں کے ساتھ اچھی بات کیا کرو۔"

اس آیت کریمہ میں "اچھی بات" زندگی کے تمام معمولات کا احاطہ کرتی ہے، اچھی بات کیا ہے؟ جس میں نفرت اور حقارت کا کوئی لفظ نہ ہو، لہجہ میں نرمی ہو، مختصر مگر جامع ہو، مخاطب کی عمر اور حیثیت کے مطابق ہو، بات بالکل صاف اور واضح ہو، بات میں کسی قسم کا طنز نہ ہو، بات میں خیر کا پہلو موجود ہو، بات سے شر پھیلنے کا اندیشہ نہ ہو، بات میں تکبر اور غرور کا شائبہ نہ ہو، بات سچی اور کھری ہو، بات میں جھوٹ، فریب اور بے بنیاد دعویٰ نہ ہو، بات کے سننے سے کسی کی دل آزاری نہ ہو، بات کے سننے سے مخاطب مطمئن ہوتا ہو۔ اگر پیغمبر کے علاوہ بھی کسی کے انداز گفتگو میں یہی خوبیاں ہوں تو اس کی بات اثر سے خالی نہیں ہوگی۔

اس ضمن میں ہم سورہ آل عمران کی آیت نمبر 104 کا حوالہ بھی دے سکتے ہیں "تم میں سے کچھ لوگ ایسے ضرور ہی رہنے چاہیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں اور جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

اب اگر اکیسویں صدی کا ادیب یہ ذمہ داری قبول کرے اور ایسا ادب تخلیق کرے جو نیکی اور خیر کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرے اور برائی اور شر و فساد سے لوگوں کو روکے رکھے تو ہماری دنیا بلاشبہ جنت سے کم نہیں ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے

ادب کا ایک وافر حصہ اس نظریے پر قائم ہے کہ دنیا میں معاشی مساوات کے بغیر امن اور خوشحالی کا تصور ممکن نہیں۔ معاشی عدم مساوات یقیناً بہت سے پریشان کن اور گھمبیر مسائل کو جنم دیتی ہے۔ ادیبوں نے اس مسئلے کی بہت پہلے نشاندہی کی ہے، مگر یہ مسئلہ صرف دیانتدار عالمی قیادت حل کر سکتی ہے۔ کیا ہم حضرت عمر فاروق اعظم کا یہ قول بھول سکتے ہیں کہ "خدا کی قسم اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے تو اس کی ذمہ داری عمر پر ہوگی۔" مگر اکیسویں صدی کے غافل حکمران وسائل کی فراوانی کے باوجود افلاس اور بھوک کا مسئلہ حل کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ کیا بدلتی دنیا کے حکمران اس مسئلے سے بری الذمہ ہیں؟

صاحب سیف و قلم خوشحال خان خٹک نے ساڑھے تین سو سال قبل اپنی تصنیف "دستار نامہ" میں لکھا کہ جو حکمران اپنی رعایا کے لیے ماکولات، ملبوسات اور مسکنات یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کا بندوبست نہیں کر سکتا اسے لوگوں پر حکمرانی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور اگر یہ مسئلہ صدیوں پہلے موجود تھا تو بدلتی دنیا میں یہ مزید شدت اختیار کر گیا ہے۔

ادیب کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے بلکہ وہ اسے اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے حضرت انسان کی کھوئی ہوئی عظمت بحال ہو سکے اور انسان کو ہر ایک چیز پر ترجیح دے۔ وہ ایسا ادب تخلیق کرے جو انسان کو انسانیت کی معراج پر پہنچا دے مگر ادیب کی خواہش کا احترام کون کرتا ہے؟ ابھی تک جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر اتحادی طیاروں کی بمباری سے لاکھوں ہلاک شدگان کا سوگ مناتے ہوئے ہمارے آنسو خشک نہیں ہوئے کہ افغانستان میں پہلے سوویت یونین اور پھر امریکہ کے ہاتھوں لاکھوں انسان زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہزاروں مستقل طور پر معذور اور اپاہج ہوئے۔ کیا دہشت گردی کے نام پر نسل کشی کا تصور ادب میں موجود ہے؟

فلسطین، کشمیر اور بوسنیا میں نہتے لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا کہاں کا انصاف ہے؟ کیا کسی زبان کے ادب میں بے گناہ لوگوں کا اجتماعی قتل جائز ہے؟ انسانی حقوق کے علمبردار کہاں سو گئے ہیں؟ کیا ان ممالک کے ادیبوں کا یہ فرض نہیں بنتا کہ اپنے حکمرانوں کو خون ناحق بہانے سے روکیں یا کم از کم ان ظالموں کو بے نقاب کریں۔

ہمارا مسئلہ یہ نہیں کہ سرد جنگ کے ختم ہونے کے بعد کون تھانیدار بن بیٹھا بلکہ مسئلہ دہشت گردی کے تعین کا ہے۔ ہم دہشت گرد کس کو کہیں گے؟ خون بہانے والے کو یا جس کو خون بہایا جا رہا ہو؟ ہمیں بدلتی دنیا میں ادب کے حوالے سے عالمی سطح پر دہشت گردی کا مفہوم واضح کرنا ہوگا۔

ادیب بیچارے کے پاس ایک قلم ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے افضل ہوتی ہے۔ ادیب ہمہ تن ادب تخلیق کرتا رہتا ہے، وہ ظلم کے خلاف اپنے قلم سے تلوار کا کام لیتا ہے، یہ فریضہ ادیب پہلے ہی سے انجام دیتا رہا ہے اور آئندہ بھی پورا کرتا رہے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ادیب بھی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، اس کی بھی مجبوریاں ہوتی ہیں مگر بقول فریڈرک شیلر "لعنت ہو اس ادیب پر جو وقت کا غلام بن کر رہے۔" لہٰذا بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کو احترام آدمیت کے مشعل بردار اور امن کے سفیر کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ میرا یقین ہے کہ جو ادیب نہ جھکتا ہو اور نہ بکتا ہو وہی جاندار، پائیدار اور حیات آفرین ادب کی تخلیق کر سکتا ہے اور اس قسم کا ادب الہامی ادب بن جاتا ہے۔

ہم ایک نظریاتی مملکت کے باشندے ہیں ہمارے ادیبوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کریں جس سے قومی یکجہتی، اسلامی بھائی چارے اور پاکستانی تشخص کو اجاگر کیا جا سکے۔ چونکہ وطن عزیز اس گلوبل ویلج کا ایک حصہ ہے اس لیے پاکستانی ادب کو عالمی سطح پر وہ کردار ادا کرنا ہوگا جو ایک امن پسند، نیک کردار اور انسان دوست اہل قلم کا ہو سکتا ہے۔ ہمارے ادیبوں کو چاہیے کہ وہ دنیا کے کونے کونے میں رہنے والوں ادیبوں کو نیک نیتی، بھائی چارے، اخوت، انسانی ہمدردی اور باہمی پرمبنی اسلام کے زریں اصولوں کے بارے میں معلومات پہنچائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی ادب ہی وہ کارآمد وسیلہ ہے جو دنیا کو ہر قسم کے مصائب، آزمائشوں اور بکھیڑوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ ہماری دنیا بارود کے انبار پر کھڑی ہے: ہمارا ادیب اس خوف میں مبتلا ہے کہ کوئی دہشت گرد بارود کے انبار میں آگ نہ لگا دے ورنہ آنکھوں کی جھپک میں سب کچھ تہس نہس ہو جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے ادب میں باہمی اعتماد، بشر دوستی اور محبت کا پیغام عام ہو تاکہ دنیا کے باسیوں کو اس حقیقت کی جانب راغب کیا جا سکے:

بنی آدم اعضائے یک دیگرند
کہ در آفرینش زیک جوہرند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

ہمارے ادب میں عالمگیر انسانی ہمدردی کا پیغام ہونا چاہیے تاکہ اہل عالم کو یہ باور کرایا جا سکے:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

میں پشتو زبان کے مشہور صحافی، شاعر اور لسان الغیب عبدالرحمن بابا کے ایک شعر پر اپنی گفتگو سمیٹنا چاہتا ہوں۔
"اے عبدالرحمن! اگر تو دانا ہے تو دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا کر کیونکہ یہ سب خالق کائنات (رحمان) کے بندے ہیں۔

محمد اشفاق سلیم مرزا

دنیا بھر کا مستند ادب خصوصاً ادب عالیہ اپنے دور کی تاریخی حقیقتوں کے دائرہ کار میں ہی رہ کر پروان چڑھتا ہے اور اس دور کا نبض شناس ہونے کے علاوہ سماجی اتار چڑھاؤ اور تضادات کی غمازی کرتا ہے۔ جن ثقافتی علاقوں میں سماج ٹھہر جاتا ہے، ادب بھی جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور لمبے عرصے کے لئے کوئی بلند پایہ فن پارہ تخلیق نہیں ہوتا۔ وہ گلگامش اور ملک بتاہ کی نظم ہو یا فرعون اخناتون کی مناجات، تاریخ کے اس دور کی نمائندہ نظمیں ہیں جو عام معنی میں ادب کا اسطوری دور کہلاتا ہے۔ جب میں اسطوری دور کی بات کر رہا ہوں اس سے میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ ادب کسی آسمانی جھونکے کے ساتھ آسمان سے اترا تھا۔ بلکہ اس سے میری مراد یہ ہے کہ انسان نے ناقابل فہم قدرتی طاقتوں اور وقوعات کی اپنے ذہن سے دیومالائی شکل پذیری کے بعد خود کو بیگانہ کر لیا اور انہیں مسند تقدیس پر بٹھا دیا کیونکہ اس دھرتی پر معرض میں پہلے سے موجود مادی اشیاء کے علاوہ جو کچھ بھی تخلیق ہوا اس نے انسانی ہاتھوں اور ذہن سے جنم لیا لیکن یہ سب کچھ اس سماج کی دین کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ جب ہم بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار کی بات کر رہے ہوتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کونسی دنیا بدل رہی ہے کیونکہ ہم یہ بات تمام کرہ ارض کے حوالے سے تجریدی انداز میں نہیں کر سکتے۔ ہر علاقائی ثقافتی اکائی کے سماجی اور معاشی حالات کو سامنے رکھ کر ہمیں اس بات کو دیکھنا ہوگا کہ دنیا میں کس علاقے کی ثقافتی اکائی بدل رہی ہے اور اس کا ادب پر کیا اثر ہو رہا ہے۔

اگر ہم تاریخ کی مختلف پرتوں کو کھولیں تو ہم یہ جان پائیں گے کہ آج ہم جسے یورپی ادب کی میراث کہتے ہیں یہ اپنی تخلیق کے وقت پورے یورپ کا نمائندہ ادب نہیں کہلاتا تھا۔ جب ترکی کے مغربی ساحل پر ہومر نغمہ زن تھا تو ایلیڈ کی جو شکل ہیئت اور مواد کے حوالے سے بن رہی تھی وہ یورپ کے اس علاقے کا نمائندہ ادب نہیں تھا جسے آج کل ہم جرمنی، فرانس اور برطانیہ کہتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہوا کہ تاریخی ترجیحات کی بنا پر بعد ازاں اسے یورپ کی میراث کی مسند پر ضرور بیٹھا دیا گیا۔ اسی طرح جو روشن خیالات و نظریات سترہویں صدی میں انگلینڈ میں جنم لے رہے تھے، ان کے رنگ ڈھنگ ایک صدی بعد یعنی اٹھارویں صدی میں فرانس میں دیکھنے میں آئے اور اس کے بعد اگلی صدی میں جرمنی کے گلی کوچوں میں انہی تخلیقات کی صدا سنائی دی یہ سب واقعات اپنے تاریخی حالات کے مرہون منت تھے۔

اگر ہم تخصیص کے ساتھ بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار کے بارے میں بات کرینگے تو میرا چناؤ تو وہ دنیا ہوگی جسے ہم پاکستان کہتے ہیں اور ادب کی حدود بھی وہی ہوگی جو پاکستان میں تخلیق ہو رہا ہے۔

دراصل پاکستانی ادیب بیک وقت بہت سے مسائل سے دوچار ہے پچھلے ایک سو سال میں ذرائع ابلاغ کی ترقی میں جو زقند لگی اس سے یہ ہوا کہ ہمارے ہاں کے ادیب بھی مغربی ہیتی تجربات سے بہت متاثر ہو گئے اور ان کے ہاں ہیتوں اور نظریات کے بہت سے نئے در وا ہونے لگے۔ انکی تمہید پہلے تو نظریہ سازوں اور نقادوں نے باندھی کیونکہ وہ اپنی پسماندگی اور ناپختگی کو چھپانے کے لیے اپنی شناخت مغربی رویوں اور نقادوں اور نظریہ سازوں میں ڈھونڈنے لگے اور جب کسی طور پر نظریئے اور تنقیدی رویے اردو کے قالب میں ڈھل گئے تو تخلیق کاروں اور فنکاروں نے بھی ان کی تقلید میں ان ہیتی تجربوں کو اپنے بوسیدہ سماجی مواد کو سامنے رکھتے ہوئے نثر اور نظم کے فن پاروں میں سمونا شروع کر دیا۔

خصوصاً 1947ء کے بعد پاکستانی ادیبوں میں ہیت کے تجربوں کا یہ سرطان بری طرح پھیلنا شروع ہو گیا۔ ہم نے تحلیل نفسی، وجودیت، ساختیات، پس ساختیات اور ردتشکیل سے ملتے جلتے رویے کو اپنی شناخت کا ذریعہ بنالیا اور سمجھنے یہ لگے کہ ہم بھی مغربی نقادوں اور تخلیق کاروں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

لیکن ہیتی تجربات کی یہ چکا چوند مروجہ سماجی رویوں کے اندر گندھی ہوئی نہیں تھی اس لئے ہمیشہ سطح کو چھوتی ہوئی نکلتی گئی۔ مغربی سماج ترقی کی جس منزل پر پہنچ چکا ہے ہم اس کی مادی ترقی کے قریب بھی نہ پہنچ سکے لیکن اس کے اسلوب اور ہیت کو اپنانے کے لیے مصنوعی تجربہ گاہیں بناتے رہے جو جلد ہی مواد کے نہ ہونے کی وجہ سے معدوم ہو جاتی تھیں۔ ہمارے دانشوروں کا علمی دبدبہ ان اصطلاحات پر مبنی تھا جو مغربی معاشرے کی گود میں پل کر جوان ہوئیں۔ ہمارے معاشرے میں تو ابھی تک وہ زمین ہی تیار نہیں ہوئی جس میں وہ بیج بویا جاتا ہے۔ ہم مارکسیت، تحلیل نفسی، مظہریات، وجودیت، منطقی اثباتیت ساختیات، پس ساختیات اور ردتشکیل کی بسائی ہوئی لفظوں کی بستیوں میں اپنے اپنے مکان اور قیام گاہیں ڈھونڈنے لگے۔ عام قاری کی وضاحت کے لئے میں دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔ ہم ہیتوں کی چکا چوند میں آئس برگ کے اوپر والے حصے کو فوری طور پر اپنانے کے لیے تیار تھے کیونکہ وہی ہمیں راس آتا تھا اور نو حصے جو پانی میں ڈوبے ہوئے تھے جو آئس برگ کا حقیقی مادہ تھا وہ ہمارے لئے بے معنی تھا کیونکہ یورپی سماج کے وہ نو حصے ہمارے پسماندہ اور فرسودہ سماجی رشتوں سے صدیوں دور کھڑے تھے۔ ایک اور حوالے سے ہم ایک کمزور انجن کی گاڑی کو (Accessories) سجاوٹی اضافی اشیاء سے بنا سنوار کر بازار میں لے آئے تھے۔ تو ہوا یوں کہ ہم نئی ہیتوں کے اوزاروں سے اپنے ادب سے وہ نقش ابھارنے لگے جو وہاں نہیں تھے۔ یورپ کا وجود جس حزن، افسردگی، مایوسی، اکتاہٹ، گھٹن اور لغویت کا شکار تھا وہ اس کے سماج کی دین تھے۔ ہم میں سے چند ترقی یافتہ شہروں کے ادیبوں نے ایک ذہنی مماثلت کو اپنے اندر سموتے ہوئے یہ سمجھا کہ یہ من حیث المجموع پوری قوم کا مسئلہ ہے اور بیگانگی کا شکار ہو کر اپنے کردار میں وہ خصوصیت تلاش کرنا شروع کر دی جو سارتر کے اجنبی میں پائی جاتی تھی۔

گوپی چند نارنگ جنہوں نے بہت سے نئے یورپی تنقیدی رویوں کو متعارف کروانے کی کوشش کی خود بھی یہ کہتے ہیں "ہر اصطلاح کے پیچھے تصور کی ایک نئی دنیا ہوتی ہے، جو محض حروف کے جوڑ دینے سے نہیں بلکہ اس تصور کی تفہیم اور اس کے چلن میں قائم ہونے سے روشن ہوتی ہے۔" یہاں میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اصطلاح کے پیچھے جو سماج کھڑا ہوتا اصل میں وہی اس کی بنیاد اور طاقت ہوتا ہے۔ ہر اصطلاح کے پیچھے تصور کی ایک نئی دنیا نہیں ہوتی بلکہ ایک مکمل اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے۔

ہم اپنے ہاں اس المیے کو سمجھ نہیں پائے۔ ہمارے ہاں نئے تصورات، نظریات اور اصطلاحات بغیر (structure) کے

متعارف ہوتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف خالی الفاظ یا اصطلاحات ہوتی ہیں اس لیے عمل پذیری کے وقت بے معنویت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی ایک لفظ جمہوریت ہے جو دو نسلوں ادیبوں کے لیے ولولہ انگیزی کا باعث رہا لیکن سماج میں جمہوری اداروں کو فروغ نہ دے سکا۔ ہمارے ترقی پسند اور مارکسی ادیبوں کے رویے بھی کسی حد تک غیر حقیقی رہے۔ گو سماج کے اندر موجود تضادات کو سمجھنے کے لیے اور قاری تک پہنچانے کے لیے انہوں نے موثر کام کیا لیکن اکثر اوقات وہ رجائیت کی سرشاری میں گم رہتے اور اس صبح کی نوید سناتے رہے جس کے لیے ساحر نے بھی کہا تھا: "وہ صبح کبھی تو آئے گی جب امبر جھوم کے ناچے گا اور دھرتی نغمے گائے گی۔" اور جس کے لیے فیض یہ بھی کہنے پر مجبور ہوئے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل

دراصل اس رجائیت نے ولولہ انگیزی کی نفی کی اور یہ کہ، وہ سحر آنے والی ہے، کے تصور نے ہی بے عملی کی طرف راغب کر دیا اور ہم اس انتظار میں رہے کہ ایک دن صبح منہ سے چادر اتاریں گے تو امبر جھوم کر ناچ رہا ہوگا اور دھرتی نغمے گا رہی ہوگی اور ہم سکھ کا سانس لیں گے کہ چلو جان چھوٹی سب کچھ آسانی سے ہو گیا اور ہم سب کتنے سکھی ہو گئے۔

منشی پریم چند نے ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس میں اپنے خطبے میں کہا تھا:

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگا۔"

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اتنے خوبصورت الفاظ ہیں جو فوری طور پر باعمل ہونے اور کچھ کر گزرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ آزادی کی تحریک کے دوران ایسے پیغام کی از حد ضرورت تھی لیکن آج کل ایسی یک طرفہ صرف تعمیری سوچ دراصل ایک میکانکی رجحان کی غماز ہے۔ جہاں ایک سڑاندھ مارتا ہوا اور ٹھہرا ہوا فرسودہ سماج ادیب کے سامنے اپنی پوری ہیبت ناک سچائی کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس سماج کی غلاظت اور فرسودگی سے قارئین کو پوری طرح آگاہ کرنا آج کے ادیب کا سب سے بڑا ایجنڈا ہونا چاہیے۔ جب تک اس سماج سے شدید نفرت کا جذبہ نہیں ابھرے گا اس وقت تک اس کی اکھاڑ پچھاڑ کا سوال سامنے نہیں آئے۔ تعمیر اور اس کو بدلنے کی رجائیت تو بعد کا مسئلہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ کیا پاکستان میں سماج یا دنیا بدل رہی ہے کہ ہم اس کے حوالے سے ادب کے کردار کو متعین کریں۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور گلوبلائزیشن نے جو چیلنج پاکستانی اقتصادیات کے سامنے رکھے ہیں ان کو دیکھ کر اقتدار یہ

(ESTABLISHMENT) کے ذہن میں کہیں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ عالمی اقتصادی دباؤ کے نتیجے کے طور پر اپنے وجود کا قائم رکھنا محال ہو رہا ہے۔ دنیا بھر میں کثیر القومی اداروں کی یہ یلغار ہمارے اقتصادی نظام اور سماج پر بھی اثر انداز ہوئی اور ہم جو اپنے طور پر کوئی تبدیلی لانے کے خواہاں نہیں تھے، وہ بھی ان بیرونی اثرات کے تحت یا تو اس تبدیلی کو خوش آمدید کہتے ہوئے پرانے سماجی اقتدار کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو جائیں یا پھر تبدیلی کی اس دوڑ کے آخری کھلاڑی کی حیثیت ماننے کے لیے پسماندگی کے جال میں پھنسے رہیں گے۔

اس بدلتی دنیا میں پاکستان میں ادیب کا پہلا کام اس ٹھہرے ہوئے پسماندہ سماج کی توڑ پھوڑ کے لیے عوام کو تیار کرنا ہوگا۔ ہمارے عوام کو جن غیر حقیقی نعروں کی میٹھی گولیاں دی جا رہی ہیں۔ ان کی جگہ اصل اور گھناونی صورت حال کی کڑوی گولیاں دینی ہیں تا کہ اس سماج کے خلاف نفرت کا وہ لاوا پک سکے جس کے ابلنے کے بعد اس سرزمین پر اقتصادی اور سماجی ماحول کی ایک نئی تہ بچھ سکے اور اس قسم کے نعروں اور ترانوں کی اصل شکل واضح ہو سکے جس نے پاکستانی معاشرے کو ایک مصنوعی صورتحال سے دوچار کر رکھا۔ جیسا کہ دھرایا جاتا ہے کہ ہم زندہ قوم ہیں پائندہ قوم ہیں یہ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ دنیا بھر کے بین الاقوامی ادارے جب اقتصادی انسانی حقوق یا شہروں کی صورتحال کے بارے میں اعداد و شمار شائع کرتے ہیں تو ادیب اس صورتحال سے دامن بچا کر کسی خود ساختہ جنت کی تصویر کشی نہیں کر سکتا، یا پھر رجائیت کی سرشاری میں ڈوب کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہمارا پہلا مرحلہ اس بھیانک صورتحال کی تصویر کشی ہے جس سے ہم دوچار ہیں۔

بعض ادیبوں نے اس سے پہلے بھی کہیں کہیں اس قسم کے خیالات اپنی نثر یا نظم میں پیش کئے ہیں۔ اس سلسلے میں منیر نیازی اور فیض کے اشعار سے دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا:

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیے
پھر اس کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیے
ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اس زمیں پہ اٹھا دینا چاہیے

گھر رہیے تو ویرانی دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

احمد جاوید

یہ کچھ آج پر ہی منحصر نہیں دنیا ہمیشہ سے بدلتی آئی ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ادب کو اپنے کردار کا تعین خود کرنا ہوتا ہے۔ اسے محض خارجی ذرائع سے متعین کرنے میں کئی طرح کے مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ادب پر گفتگو کا ایسا طریقہ درست نہیں ہوگا جو ہم علوم مقیدہ پر گفتگو کے وقت اپناتے ہیں۔ ادب آزاد ذہن کی پیداوار ہے اور اس کی اثر پذیری کے اپنے وسائل ہیں۔

یہ امر طے شدہ ہے کہ ادب کی بنیادی قدر صداقت ہی ہے شاید اس لیے انیسویں صدی کے انگریز نقاد میتھیو آرنلڈ کو یہ گمان گزرا تھا کہ جہاں مذہب کارگر نہیں وہاں شاعری یہ کردار ادا کر سکتی ہے۔ آرنلڈ کو اپنے عہد کے نو دولتی ذہن کے سطحی تصورات کا سامنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طبقے کی "سخت گیر اخلاقیات" اور "متعصب مذہبی ذہن" جمالیاتی اقدار کو برداشت نہیں کر سکتا۔ گویا جمالیاتی قدروں کا فروغ اس کے نزدیک زندگی کی انتشاری و تخریبی قوتوں کے خلاف جنگ کا وسیلہ ہے۔

آرنلڈ سے بحث نہیں اور نہ ہی اس کے عہد سے عہد کا تقابل مقصود ہے۔ یہ بات یوں درمیان میں آئی کہ جب ہم جمالیاتی قدروں کا ذکر کرتے ہیں تو درحقیقت اس سے ہماری مراد شرف انسانی کی ترجمان اقدار ہی ہوتی ہیں۔ انسان کو ہمیشہ سے نہ صرف فطرت کی قوتوں کا سامنا رہا ہے بلکہ ظلم، جبر اور استحصال زندگی کی ایسی انتشاری و تخریبی قوتیں ہیں جو شرف انسانی کی پامالی کا باعث بنتی رہی ہیں۔ اس طرح شرف انسانی کی شناخت اور پھر اس کا حصول ادبی تاریخ کا ایک مسلسل عمل ہے۔

شرف انسانی کو مادی، اخلاقی یا معاشرتی برتاؤ تک محدود رکھنا مناسب نہیں۔ یہ الفاظ اپنے پھیلاؤ میں لامحدود معانی کے حامل ہیں۔ اس سے ہم انسان کے ہر عمل ہی کو نہیں کائنات میں اس کے مقام کو بھی متعین کر سکتے ہیں۔ اس طرح ادیب کا کام ہمہ جہتی ہے وہ انسان اور مادیت کے تشکیلی عناصر سے کائنات کے مابعد الطبعیاتی عناصر تک سفر کر سکتا ہے لیکن اس سارے سفر میں بنیادی طور پر انسان ہی اس کا پہلا موضوع ہوتا ہے کہ اس سے ہر قدر متعین ہوتی ہے۔

ادب کو جب آزاد ذہن کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے تو اسے کوئی آئیڈلسٹ معانی مراد نہیں ہوتے۔ ہر آزادی کہیں نہ کہیں مشروط ہوتی ہے۔ ادب تخیلاتی تو ہو سکتا ہے، محض تصوراتی ہرگز نہیں ہوتا، فنکار کا تخلیقی اظہار انسان اور انسانیت کی بقاء کے لیے ہوتا ہے۔ یہی صداقت ہے اور یہ صداقت اپنا نظریاتی فریم بھی بناتی ہے جو خارج میں موجود مثبت نظریوں سے ہم آہنگ بھی ہو سکتا ہے۔

ادب پر مختلف ادوار گزرے ہیں۔ ایک زمانہ داستان گوئی کا بھی تھا مگر داستان کے عہد سے لے کر آج تک ادب کی یہی نظریاتی شناخت ہے کہ وہ اپنے اندر ایک مثالی دنیا کا تصور رکھتا ہے اور اعلیٰ آفاقی اقدار کی تلاش کرتا ہے۔ مثالی دنیا کا تصور ادیب کے ذہن میں الہامی نہیں ہوتا۔ یہ گرد و پیش میں موجود بدصورتیوں کے ردعمل میں پیدا ہوتا ہے، اسی لئے بدصورتی کا بیان بھی درحقیقت حسن اور صداقت کی تلاش کا مظہر ہے۔

صداقت کی تلاش کو جس ادراک کی ضرورت ہوتی ہے اسے ادیب کا تخلیقی ذہن اپنے مشاہدے اور احساس سے ہی تشکیل دیتا ہے ہر عہد کی حسیت مختلف ہوتی ہے اس لیے ہر عہد کے حقائق کے مناظر مختلف ہوتے ہیں۔

آج دنیا جس تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ بکھر رہی ہے۔ سونامی کی جو بو انڈونیشیا کے ساحلوں سے اٹھتی ہے اس کے چھینٹے افریقہ کے دور دراز جنگلوں پر بھی پڑتے ہیں اور جو لاشیں عراق کی گلیوں میں گرائی جاتی ہیں ان کی خون آلود تصویریں اسلام آباد کے آسودہ گھروں میں دیکھی جاتی ہیں۔ آدمی اپنے اپنے معاشروں کے جغرافی یا مادی ماحول تک محدود نہیں رہا۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے سب کو ایک ہی حمام میں کھڑا کر رکھا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سائنس کی ترقی نے کچھ پر سہولت اور طاقت کا دروازہ کھولا ہے تو کچھ اپنی ناطاقتی اور بے بضاعتی سے اور بھی نڈھال ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف استحصالی قوتیں ہیں کہ اپنے اپنے دائروں تک محدود نہیں رہیں بلکہ یکجا ہو کر ایک قوت بن چکی ہیں اور ساری دنیا پر غالب ہیں۔ یہ غلبہ سیاسی بھی ہے اور اقتصادی بھی۔ اس طرح ادیب کے مشاہدے کے لیے جو مناظر اب موجود ہیں، وہ اس کی آنکھ نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔

ادب کی غایت اس بات میں مضمر رہی ہے کہ دنیا کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ادب کی ماہیت میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلی موضوعات ہی میں نہیں تکنیک اور اسلوب کی سطح پر بھی ہوتی ہے اور اس بنیادی رویے میں بھی جس سے کوئی عصر شناخت ہوتا ہے۔

قدیم یونانیوں کے ہاں ادب فرد اور معاشرے کے درمیان ہم آہنگی کا وسیلہ تھا۔ اس کے بعد دنیا میں ادب نے تہذیبی برتری کو پیدا کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا جبکہ اٹھارویں صدی میں جب صنعتی ترقی نے سر اٹھایا تو ادب میں فرد کی سائیکی اور سماجی حقائق کی اہمیت بڑھ گئی لیکن اب ہمارے عہد تک آتے آتے سائنس اور ٹیکنالوجی نے کئی نظریے بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ جدید معاشرے میں کوئی چیز سادہ نہیں رہی نہ انسان سادہ رہا، نہ معاشرہ، نہ کائنات۔ ایک زمانے سے روشن خیالی کو جدید رویہ کہا جا رہا ہے لیکن روشن خیالی اب انتخاب کا مسئلہ نہیں جدید عہد کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ روشن خیالی محض کوئی اخلاقی یا سیاسی کلیہ نہیں رہا۔ سائنسی طرز فکر کو منطق اور استدلال تک محدود کرنے کا زمانہ بھی گزر چکا یوں روشن خیالی سائنسی انکشافات کے تابع ہو چکی ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ آج کا ادب سائنسی انکشافات، جدید معاشی نظریات، ان کے اثرات، دباؤ اور نتائج کو قبول کئے بغیر کسی نئے ادبی شعور کو وجود میں نہیں لا سکتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نیا ادبی شعور آج دیکھنے تک محدود نہیں رہ سکتا۔ حقائق کا بیان بھی کافی نہیں رہا۔ حالات کی بنت میں پیچیدگیاں نہ صرف پیدا ہوتی رہتی ہیں بلکہ تیزی سے بدلتی بھی رہتی ہیں۔ فرد اور معاشرے پر پڑنے والے اثرات آج کے ادب کے موضوعات کا تعین کرتے ہیں لیکن یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ شعر و ادب کا بنیادی مسئلہ آج بھی تبدیل نہیں

ہوا۔ انسان اور انسانیت کی بقا اب بھی محوری ضرورت ہے ہاں البتہ اس کی نوعیت ضرور بدل گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج بھی ہم تخلیقی فنکار سے مسائل کے دوٹوک حل کا تقاضہ نہیں کر سکتے۔ اپنی مرضی کا کچھ کشید کرنے کے لیے اسے تخلیقی اظہار ہی سے تعلق قائم کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ بات درست ہے کہ ادیب کا آزاد تخلیقی اظہار ہمیشہ صداقت پر ہوتا ہے اور اپنے عصر کی گواہی دیتا ہے۔

ادب اپنے عصر کی آگہی بخشتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ تیسری دنیا کے بعض ممالک میں نئے شعور کے پھیلنے کی راہیں مسدود کی جاتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود کہ جدید عہد کے تقاضے بدل چکے ہیں۔ سائنس بھی زندگیوں میں داخل ہو چکی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے ہر کسی کو علوم وفنون کا حصہ بنا دیا ہے مگر بعض معاشروں میں اب بھی زندگی پرانے منطقوں میں جکڑی ہے۔ صرف یہ نہیں کہ قدامت پرستانہ نظریات ہی ایک رکاوٹ ہیں۔ بلکہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی ناہمواری نے بھی ایسی مشکلات کھڑی کر رکھی ہیں کہ نئی فکر کو اپنی جگہ بنانے کی سہولت نہیں ملتی۔ ادب میں اگر نئی فکر موجود ہو تو اس تک رسائی کی بھی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ ادب کی آزادی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ممنوعہ چیز نہ سمجھا جائے اور اسے اپنے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا موقع فراہم ہو مگر یہ سہولت ہر جگہ حاصل نہیں ہوتی۔

پاکستان میں بھی ادب کی آزادانہ نشوونما کو کئی طرح کی مشکلات کا سامنا رہا ہے۔ ادیب سے یہ توقع رکھی جاتی رہی ہے کہ وہ ایسی ریاستی فکر کو فروغ دے جس میں عوامی امنگوں کا عمل دخل نام نہاد ہوتا ہے۔ ایسے نظریات جو روشن خیالی کو رد کرتے ہیں، سائنسی طرز فکر کو پنپنے نہ دیں اور جو صرف مراعات یافتہ مذہبی انتہا پسندی یا بالائی طبقوں کے تحفظ کا باعث بنتے ہیں۔ قومی رویے نہیں ہو سکتے مگر ہمارے آلودہ سیاسی اور سماجی ماحول نے انہیں ہمیشہ احترام بخشا ہے اور ان کا دباؤ ادب پر برقرار رکھا ہے۔ اس پر مستزاد آمریتیں رہی ہیں جنہیں ایسے شعور سے کدتھی جو جمہوری آزادیوں کے فروغ کا باعث بن سکتا ہے۔ جب ہم اپنی ادبی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور آج کی بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار کا تعین چاہتے ہیں تو خود کو ایک ایسے عہد میں بھی محسوس کرتے ہیں جب ہمارا ناقص نظام تعلیم ادبی ذوق کے فروغ میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہا۔ ہر طرح کی مصلحتوں نے ہمارے نصاب کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ تعلیمی اداروں میں کم از کم انٹر تک زبان و ادب کا مطالعہ لازمی ہے مگر مجوزہ کتابوں کے موضوعات اکثر و بیشتر ناصحانہ، غیر دلچسپ اور موجودہ عہد کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتے جو کسی بھی طرح ادب سے تعلق قائم کرنے پر آمادہ نہیں کرتے۔

ایسے عالم میں جب قوم سے اچھا ادبی مذاق اٹھ گیا ہو۔ جب کتاب مہنگی ہو اور سنجیدہ ادب مالی اسباب سے اشاعت سے باہر ہو، کتنا ہی عمدہ معیاری اور عصری تقاضوں کے مطابق ادب کیوں نہ تخلیق کیا جائے، اس کی رسائی اپنے عہد کی آدمی اور معاشرے تک آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ادب کی تخلیق نے کبھی کسی رکاوٹ کو در خور اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ سچ کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کا سفر ہر طرح کے حالات میں جاری رہتا ہے۔ اس وقت بھی جب قدیم یونان کو معاشرتی انحطاط کا سامنا تھا اور افلاطون شعر و ادب کی افادیت سے منکر ہو گیا تھا اور اس وقت بھی جب سائنس کی ترقی نے آئی ایس رچرڈز اور پی کاک جیسے انگریز دانشور ادیبوں کو ادب کے وجود کے بارے میں خدشات میں مبتلا کر دیا تھا۔ سرکار، دربار، سامراجی قوتیں اور ہمارے ہاں کی غیر جمہوری قوتیں کبھی بھی ادب کو اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے نہیں روک سکیں اور اس

میں بھی شبہ نہیں کہ ادب اپنی ماہیت میں کسی ایک عصر تک محدود نہیں ہوتا، اس کی رسائی زمانوں تک ہوتی ہے۔ مگر جدید انسانی تاریخ کا یہ بھی المیہ ہے کہ ادب کی اثر پذیری کا پہلا حق اپنے عصر کا ہی ہوتا ہے مگر یہ تبھی ممکن ہے کہ ادب اپنے معاشرے سے ہم آہنگ ہو اور تہذیبی زندگی کا حصہ بنے۔

ہم جس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں وہ کئی طرح کے مسائل کا شکار ہے۔ یہ مسائل اقتصادی بھی ہیں، سیاسی بھی، نفسیاتی بھی اور اخلاقی بھی۔ غیر جمہوری قوتیں، ناقص نظامِ تعلیم، مذہبی تنگ نظری، بدخود غلط فکری نظریے اور بہ لحہ بڑھتا ہوا سماجی تضاد اور تفاوت۔ ایسے معاشرے کو کسی بڑی تبدیلی سے ہمکنار کرنے کے لیے جس نئے شعور کی ضرورت ہے اس کی ہمیں بہت دیر سے تلاش ہے۔ ادب کے ایک حصے میں تو وہ ہمیشہ موجود رہا ہے اور اب بھی ہے۔

مجھے اس کا بھی شبہ نہیں رہا کہ ہمارا سنجیدہ ادیب نہ صرف اپنے سماج سے وابستہ رہتا ہے بلکہ اس کی نظر بدلتے ہوئے عالمی منظرنامے پر بھی ہوتی ہے لیکن اس کے شعور سے فیض حاصل کرنے کے لیے سوال تو پھر بھی اپنی جگہ پر برقرار رہے گا کہ ہم اپنے سنجیدہ اور صحت مند ادب کو اپنے معاشرے سے کیسے ہم آہنگ کریں تاکہ وہ ہمارے اجتماعی شعور کا حصہ بن سکے۔ آج کی اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہمارے ادب میں اس کا کردار موجود ہے مگر اس تک رسائی کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے کی کیا سبیل ہوگی۔ یہ کردار کس کا ہے اور کون ادا کرے گا۔

ڈاکٹر ضیاء الحسن

انسانی زندگی میں ادب کے کردار کا سوال مختلف ادوار میں اٹھایا جاتا رہا ہے۔ کبھی اس سے انسان کی باطنی تربیت کا کام لیا گیا، کبھی اسے معاشرتی انقلاب برپا کرنے والا آلہ تصور کیا گیا، کبھی معاشرت، کبھی مذہب اور کبھی سیاست نے ادب کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہا۔ بنیادی انسانی اداروں کا ادب سے یہ التفات اس کی بے پناہ قوت تاثیر کی وجہ سے ہے۔ ادب کو مختلف طبقات نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ادب اعلیٰ ترین تخلیقی دیانت داری سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے تیسرے چوتھے درجے کے ادب میں بھی تاثیر ہوتی ہے لیکن بالترتیب کم سے کم۔

ادب براہ راست انداز کو پسند نہیں کرتا کیونکہ اس سے ادب کی جمالیاتی اقدار مجروح ہوتی ہیں۔ ادب براہ راست اثر انداز بھی نہیں ہوتا۔ ادب کا مخاطب انسانی باطن ہے۔ وہ باطن سے ربط استوار کر کے ظاہر پر اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ طریقہ کار طویل ضرور ہے لیکن اس کے نتائج گہرے اور دیرپا ہیں۔ فوری نتائج کے خواہاں اذہان کے لیے ادب کچھ ایسا کارآمد نہیں ہے کیونکہ وہ تبلیغ کا ذریعہ نہیں ہے۔ تبلیغی طریقہ کار کا تعلق مذہب اور اخلاقی مصلحین سے ہے۔ ادب بالواسطہ طریقے سے تبدیلی کی طرف لے جاتا ہے، اگرچہ ادب اپنے عہد کے بنیادی مسئلے سے سروکار رکھتا ہے لیکن وہ اس مسئلے کا تجزیہ بھی خود کرتا ہے اور اس کا حل بھی خود تجویز کرتا ہے۔ ادب سے براہ راست معاشرتی اور قومی خدمات کا مطالبہ کرنے والے مایوس ہوتے ہیں کیونکہ اس صورت میں ادب اپنے بنیادی جوہر سے محروم ہو کر محض پراپیگنڈا یا نعرہ بازی بن جاتا ہے، اگرچہ یہ پراپیگنڈا یا نعرہ بازی بھی ادب کی تہذیب میں ڈھل کر اظہار پاتی ہے لیکن ادب کے تخلیقی جادو سے اس کا موازانہ نہیں کیا جا سکتا۔ ادب خود ایک زندہ اور محسوس کرنے والا وجود ہے۔ اس لیے اسے ہدایات جاری نہیں کی جا سکتیں جس طرح عام انسان ہدایات اور معاشرتی ضوابط کے مطابق بہترین زندگی گزارتے ہیں اور خاص ذہن اپنے ضابطے خود ترتیب دیتے ہیں اور ان کے مطابق اعلیٰ تخلیقی کارنامے انجام دیتے ہیں، اسی طرح ادب کو بھی معاشرے کا خاص وجود شمار کرنا چاہیے۔ عام معاشرتی فرد وقت کی پابندی پر عمل پیرا ہو کر بہترین نتائج پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے تمام افعال پابندی سے انجام دیتا ہے اور اس پابندی سے کارآمد معاشرتی فرد کا کردار ادا کرتا ہے۔ ایک تخلیقی طبع ہر پابندی سے ماورا ہو کر اعلیٰ تخلیقی کارنامے انجام دیتی ہے۔ ایک معاشرتی فرد جس وقت نیند سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ شاعر شعر کہتا ہے، شب زندہ دار عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول ہوتا ہے اور فلسفی، عالم یا سائنس دان جاگ کر غور و فکر کرتے

ہیں۔ شاعروں، سائنس دانوں، فلسفیوں، عالموں اور صوفیوں کے لیے اعلیٰ تخلیقی جوہر کی آزادی ہر معاشرتی پابندی پر فوقیت رکھتی ہے۔ ان کے آزادی اور پابندی کے معیارات عام معاشرتی معیارات سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر تخلیقی حوالے سے کامیاب انسان معاشرتی حوالے سے ناکام سمجھے جاتے ہیں۔

یونانیوں نے ہزاروں سال پہلے صداقت، خیر اور حسن کو زندگی کی بنیادی اقدار کے طور پر دریافت کیا تھا۔ دیگر تمام اخلاقی، روحانی اور تخلیقی اقدار انہی بنیادی اقدار سے پیدا ہوتی ہیں۔ ادب انہیں اقدار کو انسانی باطن میں بیدار کر کے تخلیقی معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے۔ یہی ادب کی آفاقی اقدار ہیں۔ ادب ہر عہد کو انہیں اقدار سے پرکھتا ہے اور جہاں کمی محسوس کرتا ہے، اس کو پورا کرنے کا طریقہ کار خود وضع کرتا ہے۔ ادب ایک سطح پر حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ عکاسی بھی محض عکاسی نہیں ہوتی بلکہ اس میں ادب کا نقطۂ نظر پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب میر صاحب کہتے ہیں:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

تو یہ محض عکاسی نہیں بلکہ جاہ طلبی پر طنز ہے اور معاشرتی انتشار کا تجزیہ بھی۔ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے ہندوستان کے ظاہر و باطن کو اپنی تلوار سے فگار کیا تو ادب نے اس منتشر معاشرے کی عکاسی شہر آشوب، طنز و ہجو، اور علاج غزل میں تجویز کیا۔ اگر اس زمانے میں مولانا حالی یا اختر حسین رائے پوری ہوتے تو وہ ادب سے براہ راست کردار کے متقاضی ہوتے۔ ادب اس تمام انسانی المیے سے بے خبر نہیں تھا۔ اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ یہی زخم اور درد تھا۔ ادب نے تصوف کے استعارے میں اس دور کے درد کو سمیٹا اور انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا۔ آج ہمارے لیے اس صوفیانہ شاعری کو معاشرے کے مسائل سے فرار کہنا آسان ہے کیونکہ ہم اس درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ دوسرے یہ کہ ادب نے اس دور کے سیاسی، معاشی اور سماجی انتشار کا حل انسانی باطن میں موجزن انتشار کو ختم کرنے اور ایک نئی تہذیب کی تشکیل کو سمجھا۔ اس نئی تہذیب نے جس معاشرے کی تعمیر کی، اس میں موجود انسان میں اس درد کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ سیاست کے حوالے سے اس دور کے بڑے مسائل انتظامی انتشار، کمزور فوج، معاشی بدحالی اور بے روزگاری، لیکن ادب کے لیے اس دور کا بڑا مسئلہ زخم خوردہ اور درد سے تڑپتی ہوئی دکھی انسانیت کی روحانی تسکین اور تربیت تھی۔ ادب کے تجزیے اور دوسرے علوم اور اداروں کے تجزیے میں یہی بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے یہ بات جان لینی چاہیے کہ ادب کسی بھی ادارے کا طفیلی نہیں ہے بلکہ معاشرے کے دیگر اداروں مثلاً سیاست، مذہب وغیرہ جتنا بڑا اور عظیم ادارہ ہے۔ اس کی عظمت پر کمتر درجے کے مفاد پرست ادیبوں کے کردار سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ہر دور میں سنجیدہ اور عظیم فکری و تخلیقی کمال کے حامل ادیب اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور انہیں کی وجہ سے ادب کو کسی بھی معاشرے کے بنیادی ادارے کا مقام حاصل ہے۔ اس کا یہ مقام نہ کوئی مطلق العنان بادشاہ، نہ کوئی افلاطون جیسا فلسفی، نہ کوئی آمر، نہ کوئی تحریکی جبر اور نہ کوئی لالچ یا خوف ختم کر سکا ہے۔ ادب نے ادیبوں اور دانشوروں کے غیر ادبی اور غیر دانشورانہ رویوں کو بھی مسترد کیا ہے۔ 1857ء کے بعد سرسید اور ان کے رفقا نے ادب کو معاشرتی اصلاح کا فریضہ تفویض کیا۔ اس دور میں تصنیف ہونے والے ادبی کام کی معاشرتی اور قومی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہم اس کام کو اعلیٰ تخلیقی کارناموں میں شمار نہیں کرتے۔ ادب کے ارتقا میں اس دور کو ایک مرحلے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ادب

کے رکے ہوئے قافلے میں تحرک پیدا کی اور نئے موضوعات اور اسلوب کی جستجو کی لہر پیدا کی۔ اس کے نتیجے میں اردو ادب کو اقبال جیسا عظیم شاعر نصیب ہوا۔ اسی طرح 1936ء میں بھی ترقی پسند تحریک کی صورت میں ادب میں یہ وہی تحرک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ ادب نے ترقی پسندوں کے تنظیمی ضابطوں کو مسترد کر دیا لیکن اس تحریک نے جو ماحول پیدا کیا، اس میں منٹو، بیدی اور ن۔ م۔ راشد جیسے تخلیقی فن کار پیدا ہوئے جنھوں نے ادبی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اگرچہ ترقی پسندوں نے اس وقت ان کی مخالفت کی لیکن آج ہم اس دور کے نمائندہ تخلیق کاروں میں انہیں کو شمار کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں میں ایک بھی راشد جیسا شاعر اور ایک بھی منٹو، بیدی جیسا افسانہ نگار نہیں ہے لیکن ان کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے راشد، منٹو اور بیدی جیسے فن کاروں کی موضوعات و اسالیب کی تلاش میں معاونت کی اور ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں یہ ادیب بدلتی ہوئی زندگی کے مسائل سے خود کو ہم آہنگ کر سکیں۔ ادب کو ایسا کردار ادا کرنے والے ادیبوں اور دانشوروں کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی اعلیٰ تخلیقی فن کاروں کی۔ کبھی سراج الدین علی خان آرزو ہندوستانی فارسی گو شاعروں کو ریختہ میں اپنا اظہار کرنے کی تحریک دیتے نظر آتے ہیں تو کبھی مرزا مظہر جان جاناں ایہام گو شاعروں کو تازگیِ فکر و اسلوب کی طرف متوجہ کرتے نظر آتے ہیں۔ نہ آرزو کا اردو شاعری میں کوئی بڑا مقام و مرتبہ ہے نہ جان جاناں کا، لیکن ان کی یہ اہمیت مسلم اور لازوال ہے کہ ان کی کاوشوں سے اردو کو میر و سودا جیسے شاعر میسر آئے۔ گویا بدلتی زندگی میں موثر کردار ادا کرنے والے ادب کی تخلیق میں جتنی اہمیت اعلیٰ درجے کے تخلیقی فن کاروں کو حاصل ہوتی ہے اتنی ہی اہمیت ان ادیبوں اور دانشوروں کو بھی حاصل ہوتی ہے جو اس خاص فضا اور ماحول کی تعمیر میں کردار ادا کرتے ہیں، جس میں اعلیٰ تخلیقی فن کار بدلتی زندگی کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کر کے اس کے مطابق نئے اسلوب دریافت کرتے ہیں۔ ادب کے اس تاریخی تجربے سے ہم انسانی زندگی میں موثر کردار ادا کرنے والے ادب کے تخلیقی عمل سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ بدلتی ہوئی زندگی میں ادب سب سے پہلے بنیادی انسانی سوال اٹھاتا ہے، پھر اس سوال کی روشنی میں چند دردمند ادیب وہ فضا تیار کرتے ہیں جس میں عظیم ادب کا استعمال کیا جا سکے۔

اس صورت حال میں کوئی سیاسی طاقت ایسی نظر نہیں آتی جو ان خوف ناک حالات میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ مذہب جس نے کئی ادوار میں انسانیت کی بقا کے لئے اپنا کردار کیا تھا اور اب بھی یہ کردار ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، اپنی دردمندانہ روح سے محروم، خود اپنی بقا سے تاسر اور باطنی انتشار کا شکار ہے۔ اشتراکی نظریہ جس نے ایک زمانے میں دنیا کے کئی ممالک میں انسان کو اس کا کھویا ہوا منصب لوٹانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، جمود کا شکار ہے۔ ایسے میں بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار کا سوال اٹھایا گیا ہے، کیا ادب موجودہ بدلتی ہوئی زندگی میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟ اصولی طور پر اس کا جواب اثبات میں اور عملی حوالے سے نفی میں ہے۔ سرمایہ داری نظام جس نے انسان کو جاگیرداری ظلم سے نجات دلائی تھی، اب اس سے بڑے جبر کے طور پر دنیا پہ مسلط ہے، اگرچہ اس کے سارے ہی انداز اس کے زوال کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن اس کے لئے پوری انسانیت کو منظم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہ جدوجہد دراصل چند مجنون اور اقتدار پرست اذہان کے خلاف ہوگی جنھوں نے اپنے پاگل پن سے ساری انسانیت کے مستقبل کو داؤ پر لگایا ہوا ہے۔ انسانیت کی بقا کا سوال آج سے پہلے کبھی اتنی شدت سے نہیں ابھرا۔ ساری دنیا سرمایہ داروں کے باطنی جرائم سے بخوبی واقف ہے لیکن ان کے پاس دنیا کو برباد کر دینے والے ہتھیار وافر تعداد میں موجود ہیں۔ انسان جانتا ہے کہ ان جنونی پاگلوں نے اگر ان کا استعمال کیا تو یہ سارا قصہ ہی مختصر ہو جائے گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جہاں

محسوس کے خوف سے انسانی آبادی میں اضافہ خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے، وہاں قدرت کے اصول توازن کے تحت انسان نے ڈائنوساروں کی طرح ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا ہے۔ شاید انسانیت کو آج سے زیادہ باطنی تربیت کی ضرورت کبھی نہیں رہی۔ اس وقت انسان کی بے پناہ خواہشات سے شکست خوردہ جذبۂ انسانیت کو ابھارنے کی شدید ضرورت ہے۔ اس وقت انسان وہ ذہنی، سماجی، جغرافیائی اور نظریاتی تضادات کو ختم کرنے والی آفاقی فکر کی ضرورت ہے۔ اس وقت ادب اور ادیبوں کے سامنے انسانی بقا کا سوال آ کھڑا ہوا ہے۔ اس دور میں تخلیق ہونے والے ادب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ شاید اس دور کے ادب نے ابھی اپنا بنیادی مسئلہ دریافت ہی نہیں کیا۔ اردو کے موجودہ تخلیقی ادب کو دیکھا جائے تو کہیں کہیں اس بنیادی سوال کی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں لیکن یہ سوال اپنی پوری آب و تاب سے ابھی طلوع نہیں ہوا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی بڑا تخلیق کار آ کر یہ سوال اٹھائے اور ایسی تخلیقی فضا قائم کرے جس میں انسان کی باطنی کایا کلپ ہو سکے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دور کے غور و فکر کرنے والے دانشور یہ سوال اٹھائیں اور وہ فضا قائم کریں جس میں بڑے تخلیقی جوہر کا ظہور ممکن ہو سکے۔ یہ دور رنگ، نسل، زبان، جغرافیہ اور قوم کے تفرقے کرنے والے شدید احساس سے معمور ہے۔ ادب کا نہ کوئی جغرافیہ ہے، نہ رنگ و نسل، نہ زبان، نہ مذہب اور نہ کوئی غیر انسانی تعصب۔ ہم روسی، عیسائی، ہسپانوی اور دوستوفسکی کو ہر تعصب سے بالاتر ہو کر پڑھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یورپی یہودی کافکا کے بھی پرستار ہیں اور بھارتی سکھ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے بھی ہمارے باطن میں رنگ بھرتے ہیں۔ ادب یہ مطالبہ بھی نہیں کرتا کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ اس کے پاس کوئی تلوار یا جبر کی مہم بھی نہیں ہے کہ وہ جس سے ڈرا سکے۔ اس کے پاس کوئی فوج، پولیس یا جیل خانہ بھی نہیں ہے۔ وہ صرف مخاطب کا تقاضا کرتا ہے اور وہ بھی سب سے نہیں بلکہ معاشرے کے حساس اور غور و فکر کرنے والے محدود طبقے سے۔ باقی تمام کام ادب نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا قاری ازخود اس کے جادو کا شکار ہو گا اور دوسروں کو بھی اس کا اسیر کرے گا۔ اس طرح قاری اور قاری سے اثرات سے پورا معاشرہ اس تخلیقی فضا میں سانس لے سکے گا جو انسان کی بے پناہ خواہشات پر قابو پا سکتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک

بدلتے رہنا ازل سے دنیا کا مقدر رہا ہے۔ تغیر و تبدل کا مسلسل عمل فطرت کا ایک جبر ہے۔ ارتقا بھی ایک اٹل حقیقت ہے تاہم تاریخ عالم بڑے انقلابات سے گاہ گاہ ہی ہمکنار ہوئی ہے۔

بہرحال انسان ارتقاء اور تغیر کے ذائقوں سے ہر دور میں آشنا رہا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جب بھی تبدیلی کی رفتار سست پڑتی ہے یا جمود کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے ادب اسے اپنی دھڑکنوں میں محسوس کرتا ہے۔ ہر چند کہ دنیا کی اکثر کلیدی تبدیلیوں کے پیچھے فعال اور متحرک ادب ہی کا ہاتھ رہا ہے لیکن تاریخ تبدیلی کا سہرا کسی اور علمی حوالے، ہنر یا غیر ادبی شخصیات کے سر باندھتی ہے۔ تاریخی دانشوروں نے ادب کو وہ مقام نہیں دیا ہے جو سائنس، سیاست، معاشیات یا دیگر علوم کو دیا ہے حالانکہ یہ تمام علوم ادب ہی کے ذریعے نشوونما پاتے رہتے ہیں۔ احسان فراموشی کی نفسیات نے زیادہ تر ادب اور ادیب کے احسانات کو فراموش کیا ہے بلکہ بعض معاشروں میں تو محسن کشی کا سلسلہ عروج پر رہا ہے۔ ادب کی تاریخ کو بھی وہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی ہے جتنی کہ زندگی کے دیگر شعبوں سے متعلق اشخاص یا واقعات کو دی گئی ہے۔ ادب کی تاریخ خود ادیبوں نے لکھی ہے اور اس طرح تاریخ میں ادیب کا اور اسکے ادب کا جو کردار لکھا گیا ہے وہ بھی خود ادیب ہی کا تحریر کردہ ہے۔ ادب کی افادیت کا براہ راست احساس ادیب کے سوا کم ہی لوگوں نے کیا ہے حالانکہ قوموں کی پہچان اور شناخت کا سب سے بنیادی ذریعہ زبان ہی ہوا کرتا ہے۔ زبان ہی قوموں اور قومیتوں کو وجود میں لاتی ہے اور زبان کی پرورش ادب کی مرہون منت رہی ہے لیکن، ادب کا منصب صرف زبان کی نشوونما نہیں ہے۔ زبان ابلاغ و تعلیم کا بنیادی وسیلہ ہے، ادب ہی کے ذریعے قوموں کو ترقی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یوں انسانی معاشرت کو سنوارنے اور اس کی اصلاح کا کام بھی ادب کا وظیفہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ترقی یافتہ اقوام وہ ہیں جنہوں نے اپنی مادری زبان کو اہمیت دی ہے۔ اپنی پہچان کے لیے قومیں اپنے امتیاز و افتخار کا سرمایہ زبان ہی کو سمجھتی ہیں لیکن، ایسی قومیں آزاد ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر فکری آزادی کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

غلام نسلوں کی زبان بھی حریت کے احساس سے مبرا ہوتی ہے۔ مغلوب زبانوں میں وہ صلاحیت کم ہوتی ہے جو غلامانہ ذہنیت کو غلامی سے نجات دلا سکے لیکن زبان کی غلامی اس کے بولنے والوں کی ذہنی و فکری بے مائیگی کے سبب سے ہی ہوتی ہے۔ پھر بھی زبان و ادب نے ہمیشہ یہ جدوجہد کی ہے کہ اپنے بولنے والوں کو اس فکری غلامی سے آزاد کر سکے۔ زبان کو پہلے

اس پر فخر تھا کہ جو کچھ بھی ہو، اس کے اپنے بولنے والے ہزار غلام سہی یا نقال سہی لیکن وہ خواب ہمیشہ مادری زبان میں ہی دیکھتے ہیں لیکن یہ تفاخر بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا ہے کیونکہ لوگ فخریہ انداز میں کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ وہ خواب بھی انگریزی میں ہی دیکھتے ہیں۔ جب بود و باش، رہن سہن سب کچھ نقلی ہوں تو خواب بھی نقلی بن جاتے ہیں اور نقالی کبھی بھی اصل کے برابر نہیں ہو سکتی۔

بہرحال دنیا میں پچھلی دو صدیوں میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ہر چند کہ ان صدیوں کی انقلابی تبدیلی کو انقلاب فرانس کے بعد کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور انقلاب فرانس کے سائے میں جو کردار ادب نے ادا کیا تھا، تاریخ نے اس کا ذکر نمایاں طور پر کیا ہے لیکن پھر بھی صنعتی انقلاب نے دنیا کو جس طرح ترقی دی اور اس ترقی کے نتیجے میں تیسری دنیا کے اکثر ممالک غلامی و استبداد کا شکار ہوئے، اس کی تفصیلی تاریخ بھی ادب میں ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ خصوصاً مزاحمتی ادب نے ہر دور میں جس طرح طریقے سے اپنا فریضہ سر انجام دیا ہے، مزاحمت کی جو تحریکیں چلی ہیں وہ بھی ایک فعال متحرک مزاحمتی ادب کا نتیجہ تھیں پھر ان کے نتیجے میں جن ممالک نے آزادی حاصل کی، وہ آزادی بھی ادب کی مرہون منت تصور کی جاتی ہے۔ گویا دنیا کی تبدیلیوں کا براہ راست اثر اگر ادب پر پڑتا ہے تو ادب بھی مذکورہ حوالوں کو تخلیقی سطح پر بار بار ابھارتا ہے۔ آج کے دور میں ادب نے اگر جدیدیت کی راہ ہموار کی تو جدیدیت نے ادب کے تخلیق کے تقاضے بھی بدلے ہیں۔ اس طرح ادب اور تبدیلی ایک دوسرے کے نتائج بن کر سامنے آئے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے دور میں ادب البتہ ایک سخت اذیت ناک صورت حال سے دوچار ہوا ہے۔ اس کے اپنے اسباب و وجوہات بھی ہیں۔

اگر بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار پر بات کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک تو ادب کی عمومی حالت ہے ادب تفریح کا ذریعہ بھی ہے اور سماجی تعلیم کا بھی لیکن وہاں پر جہاں ادب اور ادیب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہاں ادیب کو اظہار رائے کی اور اظہار ذات کی مکمل آزادی ہے۔ ادیب پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ اس لئے تو اکثر ادبی تحریکیں یورپ کی دنیا میں سانس لے کر جوان اور توانا ہوئی ہیں۔

اگر ادب کی تخلیق صداقت و سچائی کی تخلیق ہے تو ادیب یقیناً مخلص، صادق true to himself امانت دار، دیانت دار ہوگا، ادبی دیانت کا پاس رکھے گا، ادبی صداقتوں کا پرچار کرے گا، Intellectual Honesty اس کا ایمان ہوگا۔

ادب یا تو اپنی ذات کی سچائیوں اور اس کے اظہار کا امین ہوگا یا معروضی حقیقتوں کا ترجمان ہوگا۔ ادب اگر مقصدیت رکھتا ہو۔ تو بھی نوع انسان کی فلاح و بہبود، سماجی انصاف، معاشی ہمواری اور اخلاقی خوبیوں کی نشو و نما کے خاطر تخلیق ہوگا ظلم و بربریت کے خلاف لکھا جائے گا۔

لیکن گلوبلائزیشن اور عالمگیریت کے اس دور میں بھی مغرب کا ادب اور مشرق کا ادب پھر بھی مختلف ہے۔ مشرق کے ادب کے اپنے تقاضے ہیں ہر چند کہ ادب کو آفاقی قدروں کا حامل ہونا چاہیے لیکن یہ تو ادب برائے ادب کے تخلیق کی بات ہوگی اگر ادب برائے زندگی کی بات کریں گے تو مشرق میں مشرقی زبانوں میں ادب کی تخلیق کو ایک کرب سے بھی گزرنا پڑے گا اور وہ کرب ہے سچائی کی تخلیق۔ بدلتی دنیا میں ادب کا کردار وہی ہوگا جو ادیب کا کردار ہے۔

ادب کو اگر بدلتی ہوئی دنیا میں جرات مندی کے ساتھ نئے سوالات اٹھانے ہوں اور ان سوالوں کا جواب بھی تلاش کرنا ہو۔ تو ژان پال سارتر کا وہ مشہور سوال کہ ادب فاقہ زدہ کے لیے کیا کر سکتا ہے؟ اکیسویں صدی میں شاید یہ سوال اس طرح اٹھایا جائے کہ ادب دہشت زدہ یا خوف زدہ کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے اور اس سوال کا جواب بذات خود ادب کے کرداری راہوں کا شاید تعین کر سکے لیکن شرط وہی صداقت ہی ہے۔

اس نئے اکیسویں صدی میں ادب معاشیات سے نفسیات کی طرف رجعت میں کرداری سچائیوں تک شاید پہنچ سکے۔ اور پھر کسی احمد شمیم کا ضمیر اس طرح مجروح نہ ہو۔

سفر فریب ہے منزل بھی ایک دھوکہ ہے
ہر ایک موڑ کے آخر پہ ایک صحرا ہے
مجھے خریدا گیا ، جھوٹ بولنے کے لئے
وہی سزا بھی ہے میری جو میرا پیشہ ہے

تاجل بیوس

یہ موضوع وقت کے تقاضا کے عین مطابق ہے یہ موضوع کسی ایک ملک کی نہیں بلکہ سو فی صد عالمی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔اس موضوع کو بہت پہلے روشنی میں لانے کی ضرورت تھی جس نے بھی یہ موضوع روشنی میں لایا ہے اس شخص کی نہیں لیکن ایک ادارے کی کاوش قابل تعریف ہے۔

بیسویں صدی کی آخری چوتھائی اور اکیسویں صدی کی ابتدا میں دنیا کے ممالک بالکل بدل چکے ہیں۔معاشی طور پر ایک ملک نہ صرف غیر یقینی ترقی یافتہ سے ترقی پذیر اور ترقی پذیر سے ترقی یافتہ کی منزل تک پہنچ گیا ہے لیکن ضابطہ خیات Code of Ethics رزمیہ اور ملک گیری کی خواہشات بھی قابل افسوس حد تک پہنچ چکی ہیں۔ایک ایسا دور ERA بھی سامنے آیا تھا جب ادب برائے ادب اور ادب برائے تفریح سمجھا جاتا تھا کچھ عرصے کے بعد ،ادب کا وصف ادب برائے زندگی (Life for lifes sake) ہونے لگا تھا لیکن موجودہ حالات میں ادب کی تعریف ذرا اس طرح ہونی چاہیے۔

"ادب کا معاشی ،سماجی ،فلاحی ،فنی ،سیاسی اور معروضی تبدیلیوں یا انقلاب کے لئے ہوتا۔"

ادب کے مذکورہ وصف کی بنیاد پر ہم کسی بھی ملک یا معاشرے کو تین عالم آشکار مرحلوں Stages پر رکھتے ہیں جو بدلی ہوئی دنیا اور ادب کے کردار کی ایک حقیقی عکاسی ہے۔وہ تین مرحلے ہیں۔

1۔غیر ترقی یافتہ سماج یا ملک

2۔ترقی پذیر ملک

3۔ترقی یافتہ ملک

یہ حقیقت عالمی سطح پر ثابت ہو چکی ہے کہ ادیب خصوصاً شاعر ،سائنسدانوں ،سماجی رہنماؤں ،فلاحی کارکنوں اور سیاست دانوں یا حکمرانوں کی رہبری کرتے ہیں۔شاعر ،قانون اور اصول وضع کرتے ہیں جن پر سائنسدانوں ،سماجی رہنماؤں ،فلاحی کارکنوں اور سیاست دانوں کو عمل کرنا پڑتا ہے تاکہ معاشرے کو غیر ترقی یافتہ مرحلے سے ترقی پذیر اور ترقی پذیر مرحلے سے ترقی یافتہ منزل میں لایا جائے۔یہ تین معاشی تبدیلیاں اہم ترین تبدیلیاں ہیں جو کسی بھی ملک اور معاشرے کو غیر ترقی یافتہ دلدل Quagmire سے نکال کر ترقی پذیر اور ترقی یافتہ افق Horizon تک لے جاتی ہیں۔ان قدروں کو ادب کا کردار کہیں یا ادب کا عمل دخل کہیں ،بات ایک ہی ہے۔آیئے شاعری کے حوالے سے کچھ مثالیں پیش کریں کہ شاعروں کو کیوں اور کیسے سائنسدانوں ،سماجی رہنماؤں ،فلاحی اداروں اور سیاست دانوں یا حکمرانوں کا نقیب یا راہبر کہا جاتا ہے؟

ناصر عباس نیرّ

بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار کا مطالعہ دو زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کس نوعیت کا کردار ادا کر رہا ہے؟ کیا موجودہ اردو و عالمی ادب معاصر زندگی کی تبدیلیوں کی محض عکاسی کر رہا ہے یا تبدیلی کے عمل کو بھی سمت نمائی کا فریضہ بھی ادا کر رہا ہے؟ نیز کیا عکاسی کسی واضح اصول کے تحت ہے؟ معاصر ادب فقط وہی اور اتنا ہی پیش کر رہا ہے جو معمولی تجربے میں آ رہا ہے؟ یا جو غیر معمولی تجربات بھی ہیں وہ ادب پیش کر رہا ہے؟ اور یوں عکاسی کے عمل سے زیادہ پروڈکشن کے درجے کو پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ علاوہ ازیں ادب اگر سمت نمائی کر رہا ہے تو اس سمت کی وسیع عالمی انسانی تناظر میں معنویت و اہمیت کیا ہے؟

اس موضوع پر اظہار خیال کا دوسرا زاویہ یہ بنتا ہے کہ بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کیا کردار ہونا چاہیے؟ اور ظاہر ہے اس زاویے سے کیا گیا مطالعہ معروضی کی بجائے اقداری اور آئیڈیالوجیکل ہوگا۔ ہم کسی نہ کسی قدر اور آئیڈیالوجی کی رو سے ہی بدلتی دنیا کے تناظر میں ادب کے کردار کا جائزہ لیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہم پہلے ادب کے کردار کا تعین کریں گے؟ کوئی ایجنڈا یا لائحہ عمل طے کریں گے اور پھر اسے ادب میں تلاش کریں گے یا ادب کے سپرد کریں گے۔ اہم بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی سیاسی یا ثقافتی لائحہ عمل یا آئیڈیالوجی ادب کے لیے تجویز ہوئی ہے، ادب کی فطری نہاد ضرور مسخ ہوئی ہے۔ باہر کی عائد کی گئی آئیڈیالوجی اور ادب میں مغائرت موجود رہی ہے اس تاریخی حقیقت کے باوجود مقتدرہ ادب کے لیے ایجنڈے وضع کرتا رہا ہے۔

میری معروضات پہلے زاویے کی نسبت سے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ بدلتی ہوئی دنیا میں ہم کیا تصور رکھتے ہیں؟ تبدیلی تو ایک عمل مسلسل ہے جس میں ہم شریک ہیں، جسے بھگت رہے ہیں اور جس کے تماشائی بھی ہیں۔ تاہم تبدیلی کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی؛ کبھی سست، کبھی تیز اور کبھی تیز تر ہوتی ہے، خصوصاً جب کوئی غیر معمولی واقعہ ہو رہا ہے۔ ویسے تو معمول کے واقعات بھی دنیا کو اور ہمیں تبدیل کر رہے ہوتے ہیں، جس کی خبر نہیں ہوتی مگر غیر معمولی واقعہ دنیا کو تیزی سے بدل ڈالتا ہے، جس کی ہمیں فوراً خبر ہو جاتی ہے۔ غیر معمولی واقعہ سیاسی، جنگی، تجارتی، ثقافتی اور فطری ہو سکتا ہے۔ پیش رفت کی صورت بھی! مثلاً سوویت یونین کا انہدام ایک غیر معمولی سیاسی واقعہ تھا، جس نے عالمی سیاست کا رخ بدل کے رکھ دیا؛ سیاست عام بائی پولر سے یونی پولر ہوگئی، بیسویں صدی کی عالمی جنگیں اور اکیسویں صدی میں امریکہ، افغانستان اور امریکہ، عراق جنگ بھی غیر معمولی

واقعات ہیں جو نائن الیون کے غیر معمولی واقعے کا نتیجہ ہیں (یا نتیجہ قرار دیئے گئے ہیں)؛ بلیوفی اوا ور گلوبلائزیشن تجارتی نوعیت کے "واقعات ہیں"، جو معاصر دنیا کو بدل رہے ہیں دوسری طرف جینیات میں کلوننگ، طبعیات میں ایم تھیوری، ٹیکنالوجی میں سیل فون، کیبل اور انٹرنیٹ وغیرہ ولسانیات، ادب اور فلسفے میں ساختیات اور مابعد جدیدیت کی تھیوری؛ یہ سب غیر معمولی واقعات ہیں جنہوں نے معاصر زندگی کو اور اس زندگی کے شعور کو تبدیل کیا ہے۔ اب ہم سیاسی، معاشی، ثقافتی اور فکری سطحوں پر ایک مختلف دنیا میں جی رہے ہیں۔ یہ دنیا آج سے تین چار دہائیوں پہلے کی دنیا سے بے حد مختلف ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہاں عالمی فکری پیش رفت سے آگاہی کم کم ہے اور ہم بدلتی ہوئی دنیا کا تصور زیادہ تر سیاسی، تجارتی اور جنگی حوالے سے رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا "واقعہ" بھی ہے اور بیان واقعہ بھی! ایک عملی حقیقت وصورتحال بھی ہے اور اس کی تعبیر و توجیہہ بھی دنیا دراصل زبان کی طرح ہے جس میں سطح پر اظہار کے صد ہا پیرائے ہوتے ہیں اور زیر سطح وہ نظام یا گرامر ہوتی جو اظہار کو ممکن بھی بناتی ہے اور اظہار کے تنوع کو کنٹرول بھی کئے ہوتی ہے۔ اگر ہم زبان کی گرامر سے لاعلم ہوں تو ہمارے اظہار میں لکنت اور بسا اوقات لغویت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم دنیا کی صورت حال اور اس کے عقب میں مضمر وکار فرما عوامل وعناصر (جو دراصل دنیا کی صورتحال کی گرامر ہیں) سے بے خبر ہوں، یعنی دنیا کا کلی تصور نہ رکھتے ہوں تو دنیا سے متعلق ہمارا تجربہ ناقص اور بدلتی دنیا کا ہمارا شعور بدنظمی کا شکار ہوتا ہے۔ یہ بنیادی سوال ہے کہ دنیا کے واقعات وحوادث اور ان کی گرامر میں رشتہ کیا ہے؟ کیا واقعہ گرامر کو پیدا کرتا ہے یا گرامر واقعے کو؟ جب ہم کسی کل کا شعوری تصور کرتے ہیں، اسے واقعے اور گرامر یا عیاں اور نہاں میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں تو ہمیں دونوں میں ایک درجہ بندی ضرور قائم کرنا ہوتی ہے۔ ایک کو سبب اور دوسرے کو نتیجہ قرار دینا پڑتا ہے۔ تاہم یہ درجہ بندی حتمی نہیں ہوتی جسے نتیجہ قرار دیا گیا تھا وہ بعد ازاں سبب بھی ٹھہر سکتا ہے۔ یہ بات ہمیں معاصر دنیا کے تجزیئے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً نائن الیون کا واقعہ سبب بنا اور اس نے سیاست عالم کے ساتھ ساتھ دنیا کی فکری اور دانش مندانہ جہت کو بھی تبدیل اور متعین کیا۔ نائن الیون کے بعد جہاں عالمی سیاسی بساط پر نیا کھیل شروع ہوا، دوست اور دشمن ممالک کی نئی فہرست بنی، وہاں نئے کلامیے (ڈسکورسز) بھی شروع ہوئے اور واضح رہے کہ ہر کلامیہ دنیا سے تو متعلق ہو رہا ہے مگر دنیا کی تفہیم وتوجیہہ کے اپنے اصول، معیارات اور ترجیحات رکھتا ہے اور ان تینوں کا تعین طاقت کرتی ہے۔ یوں ہر کلامیہ دراصل طاقت کے حصول کی حکمت عملیاں اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔ پیش نظر رہے کہ طاقت سے مراد محض سیاسی یا فوجی طاقت نہیں بلکہ کسی مخصوص نقطہ نظر کا اجارہ بھی ہے اور یہ اجارہ متعدد دوسرے کلامیوں کو بے دخل اور غیر موثر کرنے کی در پردہ کوشش کرتا ہے اور اس کیلئے وہ نئی اصطلاحات رائج کرتا، پرانی اصطلاحات کو نئے مگر اپنے مخصوص ترجیحی ڈھنگ میں استعمال کرتا اور تازہ بیانیے گھڑتا ہے۔ نائن الیون کے بعد جو کلامیے برقی وطباعتی میڈیا کے ذریعے رائج کیے گئے ان میں یہ بات مشاہدہ کیا جا سکتی ہے۔ مثلاً دہشت گردی، حق خود ارادیت، مزاحمت، بنیاد پرستی جیسی اصطلاحات کے نئے مفاہیم وضع اور رائج کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ پیش بند اقدام کی اصطلاح متعارف ہوئی ہے۔ ایک خطے کے عوام کو ایک غیر ملکی آقا کے ذریعے ان کے بنیادی سیاسی حقوق دینے کا بیانیہ اختراع ہوا ہے۔ کلامیہ کس

طور انسانی اذہان کو بدلتا، انہیں کنٹرول کرتا اور سوچنے کی حدیں مقرر کرتا ہے، یہ دیکھنا ہو تو جارج آرویل کا ناول 1984ء ضرور پڑھا جائے۔

سیاسی واقعات کے علاوہ معاشی اور ٹیکنالوجیکل نوعیت کے "واقعات" نے بھی ہماری دنیا کو بدلا ہے اور اس تبدیلی کا احساس اردگرد نظر ڈالنے سے بھی ہو رہا ہے اور نئی طرز کے کلامیوں سے بھی! ڈبلیو ٹی او، ملٹی نیشنل کمپنیاں، گلوبلائزیشن نئی قسم کی اکانومی رائج کر رہے ہیں، ان کے نتیجے میں معاشی طبقات اور نئے معاشی روابط قائم ہوئے ہیں۔ اس تبدیلی کا سب سے بڑا مظہر صارفیت کا کلچر ہے جو ہر شے کو کموڈیٹی کا درجہ دیتا ہے۔ خواہ وہ کوئی میک اپ آئٹم ہو، دودھ کا پیکٹ ہو، زندگی بچانے کی دواہو، لباس ہو، کتاب ہو، علم ہو، آرٹ ہو یا عورت کا جسم ہو، صارفیت ان سب کو اشیائے صرف خیال کرتی ہے، ان کی قیمتیں مقرر کرتی اور ان کے لیے نئی نئی مارکیٹیں تلاش کرنے میں لگی رہتی ہے۔ صارفیت کے کلچر نے اقدار کا ایک اپنا نظام وضع کیا ہے، جس میں اولیت معاشی برتری کے حصول کو دی گئی ہے۔ معاشی برتری کی خاطر ملٹی نیشنل کمپنیاں کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ روایتی اخلاقی تصورات کو تہس نہس کرنے سے لے کر بڑی بڑی جنگیں لڑنے کا اقدام کر سکتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس سارے عمل میں وہ پس پردہ رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ صارفیت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اشتہارات کی صورت میں "جادو اثر بیانیے" وضع کرتی ہے......... اسی طرح انٹرنیٹ، کیبل اور سیل فون نے بھی ہمارے باہمی ترسیلی روابط کو نئی صورت دی ہے۔ زمان و مکان سے متعلق ہمارے تصورات اور تجربات کو بدل دیا ہے اور دنیا کو ایک گاؤں بنا کے رکھ دیا ہے۔ انسانی ابلاغ، تعلیم اور تفریح کے نئے طور متعارف کروائے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سارے طور بھی صارفیت اور کبھی آئیڈیالوجی سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے انسان اپنی حقیقی آزادی سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ چیزیں انسان کی نجی زندگی اور اس کی خلوت گاہ میں بری طرح دخیل ہو گئی ہیں۔

یہ سب واقعات خارجی دنیا کے ہیں جنہوں نے دنیا کی فکری اور دانش ورانہ سطح کو متاثر اور متعین کیا گویا یہاں واقعات سبب ہیں اور مختلف کلامیے ان کا نتیجہ۔ تاہم عالمی و فکری مکاشفات بھی دنیا کو بدلتے ہیں اور نئے واقعات کو جنم دیتے ہیں۔ اس امر کی سب سے بڑی مثال طبعیات میں تاب کاری کی دریافت تھی جس سے ایٹم بم بنانا ممکن ہوا اور بعد ازاں جس نے تاریخ کے ایک بدترین واقعے (ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم برسانے کا واقعہ) کو جنم دیا۔ ماضی قریب میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء، مارکسی اور اینگلز کی تاریخی معاشی تھیوری، فرائیڈ کا لاشعور اور ژنگ کا اجتماعی لاشعور کا نظریہ، کوانٹم فزکس اور اس سے متعلق ہائزن برگ کا اصول لایقین نظریہ اضافیت، دایاں اور بایاں دماغ کا نظریہ، بگ بینگ کی تھیوری، وغیرہ اور گزشتہ چند دہائیوں میں لسانیات میں ساختیات، فلسفے میں دریدا (Derrida) کی ردتشکیل، تاریخی فکر میں فوکو کے نظریات (بالخصوص طاقت اور ڈسکورس کے نظریات)، طبعیات میں ایم تھیوری جینیات میں کلوننگ وغیرہ نے بھی دنیا کو بدلا ہے اور اس ساری فکری صورت حال کو مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا ہے۔ مابعد جدیدیت پر تفصیلی گفتگو کا یہ محل نہیں تاہم اس کے تین عناصر کا ذکر ضروری ہے جو دراصل بدلتی ہوئی دنیا کو سمجھنے میں ہمیں مدد دیتے ہیں، وہ تین عناصر ہیں تکثیریت، ارتباط باہم اور تشکیل حقیقت (ہائپر ریئلٹی)، تکثیریت کا مطلب یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کسی واحد بیانیے، نظریے کسی ایک ثقافت اور حصول علم کے کسی ایک ذریعے کو حتمی خیال نہیں کرتی۔ یہ بیانیوں، نظریوں، ثقافتوں اور طریق ہائے مطالعہ کی کثرت کا تصور دیتی

ہے اور مرکزیت اور اجارے کو چیلنج کرتی ہے۔ غور کریں تو مابعد جدیدیت کی غالب فکر یا نیں بازو کی ہے۔ یہ جب مرکزیت اور اجارے کو مسترد کرتی ہے تو گویا کسی ایک مقتدرہ کی کسی اکثریت کے خلاف اندھے اقدامات اور ان اقدامات کو جواز مہیا کرنے والے کلامیوں کو بھی رد کرتی ہے۔ یہاں مغربی حضرات کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو مابعد جدیدیت کو مغربی استعمار کا آلۂ کار قرار دیتے ہیں۔ اس بات کو ہمارے یہاں بہت کم سمجھا گیا ہے۔ مابعد جدیدیت کے اہم مفکرین دریدا، فوکو، ایڈورڈ سعید وغیرہ کے افکار مغرب کی استحصال پسند سیاسی حکمت عملیوں کا حصہ نہیں ہیں۔ مابعد جدیدیت کا دوسرا عنصر ارتباط باہم، علوم کے مابین مغائرت کو دور کرنے اور inter disciplinary مطالعات کو رائج کرنے پر زور دیتا ہے۔ جدیدیت میں علوم کی حد بندیاں مستقل تھیں مگر اب ایک علم کی بصیرت کو دوسرے علوم کے شعبوں میں آزمایا اور برتا جا رہا ہے۔ لسانیات کو ادب، بشریات، فلسفہ حتیٰ کہ کمپیوٹنگ میں برتا گیا ہے۔ بہت سوں کے علم میں ہوگا کہ انٹرنیٹ کے سرچ انجنوں میں لسانیات کے اصولوں سے مدد لی جاتی ہے۔ ہائپر رئیلٹی بھی ہماری بدلتی دنیا کا اہم مظہر ہے۔ یہ ہمیں حقیقت کے نئے تصور سے آشنا کرتی اور حقیقت کے نئے تجربے سے دوچار کرتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے لسانی یا برقی ذریعے سے تشکیل دیا جا رہا ہے۔ اپنی اصل میں یہ حقیقت برعکس پرچھائیں یا بیانیہ ہے مگر اس کا تاثر ایک مادی حقیقت کا سا ہو رہا ہے اور ہم اپنے اوقات کا بیشتر حصہ عکسی، لسانی اور تشکیلی حقیقتوں کے تحت گزار رہے ہیں۔ ہمارے عمومی تجربے میں مادی اور تشکیلی حقیقت کا فرق مٹتا جا رہا ہے، یوں ہمارا عمومی تجربہ بھی بدل گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ادب بھی ایک کلامیہ ہے، جو بدلتی دنیا کے مظہر اور نتیجے کے طور پر وجود میں آتا ہے یا دنیا کو بدلنے کا اقدام کر رہا ہے؟ دراصل دو طرح کا ادب لکھا جاتا ہے اور لکھا جا رہا ہے، یا دو طرح کے لکھنے والے ہوتے ہیں۔ محرر اور تخلیق کار۔ پہلی قسم کے لکھنے والے وہ ہوتے ہیں جو دنیا کو محض منعکس کرتے ہیں، جو کچھ ارد گرد رونما ہو رہا ہے اس سے ہی تاثر قبول کرتے اور اسے پیش کر دیتے ہیں۔ اور ان کے تاثر میں بھی کوئی گہرائی نہیں ہوتی۔ ایک واقعہ عام انسانی حسیات کو جس طرح متاثر کر رہا ہے، غم یا نشاط سے ہم کنار کر رہا ہے، بس اسی طور پر لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے بالعموم ادب کی مروجہ ہیئتیں، مثلاً متداول اسلوب اور رائج علامتی نظام استعمال ہو رہا ہے۔ نتیجتاً ٹائپ کردار ہوتے ہیں اور سطحی جذبات نگاری ہوتی ہے۔ گویا یہ ادب کلامیے کی صورت ہوتا ہے جو دراصل مروج اور مقبول طرز احساس کی نمائندگی کر رہا ہے اور اکثر بے خبری میں یہ ادب کسی مقتدرہ کے رائج کردہ کلامیوں کے استحکام کا باعث بنتا ہے، تاہم کبھی کبھی یہ فوری عوامی ردعمل کو بھی پیش کرتا ہے۔ نائن الیون کے بعد بیشتر ادب اسی طرح کا لکھا گیا ہے۔

دوسری قسم کے تخلیق کار دراصل دنیا کا کلی تصور رکھتے ہیں۔ وہ محرروں کی طرح دنیا کو محض حسی تجربہ نہیں کرتے بلکہ وہ بیک وقت حسی اور فکری سطحوں پر متحرک ہوتے ہیں۔ وہ واقعات اور کلامیوں، دونوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ واقعے کی حیثیت و جسمانیت اور کلامیے کی فکریت ان کی گرفت میں ہوتی ہے، چنانچہ وہ محض واقعہ نہیں لکھتے، واقعے کی منطق کو بھی کچھ اس طور پر پیش کرتے ہیں کہ وہ نری منطق نہیں رہ جاتی۔ واقعے کے ساتھ اس کا رشتہ گوشت اور ناخن کا سا ہو جاتا ہے، چونکہ وہ واقعے کا حسی تجربہ اور منطق کی بصیرت دونوں رکھتے ہیں، اس لیے وہ محض ہو چکے واقعات اور ان سے منسلک منطق کو پیش کرنے کے پابند اور مجبور نہیں ہوتے وہ خود واقعہ تخلیق کر سکتے، نیا حسی تجربہ کر سکتے اور نئی منطق تراش سکتے اور نئی ہیئتیں، نئے اسالیب، نئی علامتیں تخلیق کر سکتے ہیں۔ موجود واقعات کو مسترد کر سکتے اور رائج منطق کو رد کر سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک ایسا کلی وژن رکھتے

ہیں جو بیک وقت معلوم اور نامعلوم حس اور ماورائے حس، دونوں کو محیط ہو رہا ہے۔ کلی وژن سے نمود پانے والا ادب بدلتی ہوئی دنیا کا کلی فہم ہی نہیں دیتا، تبدیلی کی جہت کا وسیع انسانی تناظر میں محاکمہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس طور یہ ادب کسی ایک مقتدر گروہ کی حکمت عملیوں اور کامیابیوں میں شریک ہونے کے بجائے انسانی مسرت و فلاح کا وسیع تصور دیتا ہے۔ ہمارے یہاں بدلتی ہوئی دنیا کے سیاسی، معاشی اور بعض ثقافتی پہلوؤں کے حوالے سے تو ادبی تجزیے سامنے آئے ہیں اور اس ضمن میں کمزور اور مظلوم طبقات کی حالت زار کو پیش کیا گیا اور عالمی طاقتوں کے مکروہ ہتھکنڈوں کو منکشف کیا گیا ہے مگر ایسا ادب بھی کم لکھا جاتا ہے جو معاصر زندگی کا کلی وژن دے اور پھر اس طور دے کہ معاصر زندگی کے ساتھ خود زندگی کا اسرار بھی اس میں سمٹ آئے۔

ڈاکٹر نذیر تبسم

ادب کیا ہے؟ یہ ایک کثیر الجہتی موضوع ہے اور اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اسی طرح ادب کے مقصد اور منصب کے سلسلے میں مختلف ادوار میں مختلف نظریات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے مگر ان تمام افکار و خیالات کی تہہ میں جو مفہوم مشترک نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ادب اور زندگی بشمول کائنات آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور اس طرح مربوط و مشروط ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ادب زندگی کا عکاس بھی ہے ترجمان بھی ہے، اور ناقد بھی۔

ادب ایک اعتبار سے ماضی کی شعوری اور لاشعوری روایات کی تمخزی انجائے، حال کا آئینہ بھی ہوتا ہے اور مستقبل کا اشاریہ بھی اور اس کے لیے بیک وقت واقعیت اور تخیلیت، افادیت و جمالیت اور اجتماعیت وانفرادیت بھی رویوں کی آگہی بہت ضروری ہے۔ یقیناً ماحول اور معاشرہ ادیب کو پیدا کرتا ہے مگر ادیب ماحول کو از سر نو تعمیر اور معاشرے کو متاثر کرتا ہے اور ماضی حال مستقبل تینوں زمانے اس کی بالغ نظری کی دسترس میں ہوتے ہیں۔

ایک چھوٹا سا سوال یہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ بذات خود زندگی کیا ہے؟ زندگی دراصل ارتقاء اور مسلسل ارتقاء کا دوسرا نام ہے، جس میں انفرادی اور اجتماعی پہلو شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ انفرادیت، اجتماعیت کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتی اور اجتماعیت انفرادیت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اور ان دونوں کو ارتقائے حیات میں ایک دوسرے کا ممد و معاون ہونا چاہیے۔ اسی کا نام حیات انسانی کا ارتقاء ہے اور ادب کو بھی لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی خارجی صورت حال اور باطنی کہکشاؤں کی دریافت کا نباض ہونا چاہیے۔ بقول کرنل غلام سرور:

''دراصل ادیب کسی خیالی دنیا میں نہیں رہتا۔ وہ جس معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے اس کے حقائق و کوائف سے وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ایسا کرے گا تو اس کی تخلیقات کو یاد پیائی کے سوا اور کسی نام سے نہ پکارا جا سکے گا۔ اس لیے ادیب پر لازم ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کو، اپنے ماحول کو، اپنے معاشرے کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کو ملحوظ خاطر رکھے اور ادب کے ارتقائی عمل میں معاون ہو۔ اس کی تخلیقات سے اس کے عہد کی خصوصیات کا، اس کے زمانے کے تمدنی مزاج کا، اس کی ثقافتی اقدار کا سراغ ملے، وہ زمانے کے ساتھ چلے کہ زندگی حرکت کا دوسرا نام ہے اور جمود موت کا۔ ادب کے موضوعات جتنے انسانی زندگی سے قریب تر ہوں گے اتنے ہی انسان کے لیے زیادہ اہم ہوں گے اور اسی اعتبار سے ادبی تخلیقات میں عظمت و رفعت پیدا ہوگی۔''

تاہم ان تمام باتوں کے لیے ضروری ہے کہ تخلیق کار کو، شاعر اور ادیب کو کائنات اور زندگی کے ارتقاء اور تواریخ کا منضبط اور مدلل علم ہو اس لیے کہ ماضی کے واقعات، اس کی روایات، انسانی شعور کی بازیافت کے نیے ایک زینہ ہیں تو حال کے تمام اکتسابات و اسالیب زندگی اور مستقبل کے ارتقائی امکانات، دونوں کے لیے اپنے ہنر کی آبرومندی کا جواز بھی ہیں۔

زندگی کے بارے میں یہ ادراک و شعور ادیب شاعر کے باطن میں اس وقت تک بیدار نہیں ہوتا جب تک وہ زندگی کو متحرک اور ارتقاء پذیر نہ سمجھے۔ زندگی میں ماضی، حال اور مستقبل اصل وجود رکھتے ہیں تو یقیناً وہ ایک متحرک حقیقت ہے، جو لمحہ بہ لمحہ، عہد بہ عہد بدلتی جاتی رہی ہے اور اس کی اشکال اور خدوخال میں منفی و مثبت تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں۔ مفکرین کی غالب اکثریت کا خیال ہے کہ حال کے لمحہ موجود میں ماضی کی پوری آگہی کام کر رہی ہوتی ہے اور کوئی دانشور مستقبل سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

اس گفتگو کے تناظر میں جب آج کی دنیا کے بدلتے ہوئے معاملات و رجحانات پر نگاہ ڈالی جائے تو صورت حال خاصی الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ دنیا نہ صرف گلوبل ویلج میں سمٹ کر رہ گئی ہے بلکہ مختلف علوم و فنون کی انتہائی ترقی یافتہ صورتحال نے فردکی ذہنی کیفیات کو انتشار سے دوچار کر دیا ہے اور ظاہر ہے کہ معاشرے نے خدوخال کی تشکیل، افراد اور خصوصاً سوچنے والے اذہان کے ذہنی رویوں ہی سے اعتبار حاصل کرتی ہے۔

دراصل لمحہ موجود کی محاکاتی تشکیل کے پیچھے گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں کے سیاسی، سماجی اور فکری واقعات کی اثر پذیری موجود رہی ہے۔ اجتماعی فکر انسان کی بنیادوں کو لرزانے اور تشکیک کے عنصر کو پروان چڑھانے میں گلیلو اور کوپرنیکس کے انکشافات، ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور فرائڈ کے نظریات کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ ان نظریات نے مذہبی اقدار کے حوالے سے نہ صرف انسان کے مرکز کائنات ہونے کے تصور پر کاری ضرب لگائی بلکہ انسانی رشتوں کے تقدس کو بھی ایک سوالیہ نشان بنا دیا۔ مذہب اور اقدار پر انسانی یقین متزلزل ہوا تو فکر انسانی انتشار کی جول بھلیوں میں بھٹکنے لگی اور اس سارے منظر نامے میں ایسے یہ سامنے آیا کہ اس ذہنی انتشار کے سلجھاؤ کے لیے سنجیدہ اجتماعی کاوشیں یا تو ہوئیں نہیں یا پھر سامنے نہ آسکیں اور یوں تشکیک کی فضا اور آب و ہوا میں سانس لینے والی نسل انسانی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگئی اور حقیقت یہ ہے کہ عام انسانی ذہن آج بھی اسی الجھاؤ کا شکار ہے۔ کسی بھی نظریے کا رد، مخالفت برائے مخالفت سے نہیں ہوتا، اس کے لیے دلائل کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ مباحث کی سطح پر سنجیدہ طرز عمل کی بجائے محض سطحی پن کا مکالماتی انداز اختیار کیا جاتا رہا۔ اسی طرح بیسویں صدی میں مختلف علوم فنون کی دریافت، بازیافت اور پھیلاؤ سے نقصان یہ ہوا کہ فکر انسانی سائنسی ترقی کی دوڑ میں طاقت اور حالات کا ساتھ نہ دے سکی۔ تمام علوم کی جزنیاتی تہہ داریوں کے انکشافات نے انسانی فکر کو تجزیاتی اظہار کا موقع ہی نہیں دیا۔

خصوصاً تیسری دنیا کی آب و ہوا میں سانس لینے والوں کی کیفیت تو ایسے ہوگئی جیسے کسی نرسری کلاس کے بچے کو دو کا پہاڑہ یاد کراتے کراتے اچانک ایٹمی تھیوری سمجھائی جانے لگے۔

دراصل لمحہ موجود میں مختلف علوم کی مائیکرو سطح کی نے کائنات کے اسرار و رموز کی اس طرح گرہ کشائی کر دی ہے کہ منجمد اقدار و افکار کا حوالہ ہی بدلنے لگا ہے اور انسان یعنی آج کا انسان اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہو پا رہا، اور راستے میں در بدر پھر رہا ہے۔

بیسویں صدی ہی میں دو عالمی جنگوں خصوصاً ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی نے نسلِ انسان کو اجتماعی طور پر عدم تحفظ کا شکار بنا دیا۔ یہ خوف کہ اچانک کسی جنونی انسان کے ایک بٹن دبانے سے نسلِ انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا، ذہنوں میں دنیا اور کاروبارِ حیات کی لایعنیت سے شروع ہونے لگا۔ جب اس خوف نے آسیب کی صورت ذہنِ انسانی میں جا بیٹھنا شروع کیا تو سب تلخی رویوں میں ظاہر ہونے لگی اور اعتبار کے چراغ مدھم ہونے لگے۔

انہی جنگوں کی وجہ سے عالمی کساد بازاری اور نتیجے میں دیہات سے شہروں کی طرف مراجعت نے گھر اور رشتوں کے خاندانی نظام کے تصور کو پارہ پارہ کر دیا۔ فرد اکیلا ہوا تو مسائل و مصائب اس کا نصیب بنے۔ انسانی رشتوں پر زوال آیا تو اخلاقی اقدار ختم ہونے لگیں۔ جس کے نتیجے میں خود غرضی کے عناصر پروان چڑھنے لگے۔

پھر ملکی سطح پر قیامِ پاکستان کے بعد کی سیاسی و سماجی صورتحال نے آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کو مسمار کر دیا۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پیشہ وروں کی خاطر نکالا۔ انہوں نے ایک ایسے کلچر کی بنیاد ڈالی جس میں خوف، دہشت اور بے یقینی کی پرچھائیاں ابھرنے لگیں۔ لوگ عبادت گاہوں میں جانے سے کترانے لگے تو دوسری طرف بچوں کو سکول بھیجتے ہوئے بھی ڈرنے لگے۔ باہر کا خوف اندر کے سناٹوں میں بسنے لگا تو شخصیت کی نرمیوں پر زوال آیا اور یوں معاشرے کے تہذیبی خدوخال بھی مجروح ہونے لگے۔

پاکستان کے منظرنامے میں ناقص داخلی و خارجہ پالیسیاں، ہیروئن اور کلاشنکوف کے پھیلاؤ کا سبب بنیں تو اندھیرے نوجوان نسل کی رگوں میں اترنے لگے۔ یہ سانحہ ہوا تو مروت و محبت گھر سے رخصت ہونے لگی۔ توازن و اعتدال کے دروازے بند ہونے تو ذہنی دباؤ میں اضافہ ہونے لگا۔

علمی سطح پر غیر منطقی مباحث سے اس نسل کا جو سامنا ہوا تو حصولِ ادب کی راہ چھوٹنے لگی۔ ذہنی آبیاری کے سوتے خشک ہونے لگے تو زندگی سے جمالیات کے پرندے بیزار ہونے لگے۔

داخلی حالات سے ادھر، کچھ بین الاقوامی واقعات بھی ایسے موجود ہیں جو فکرِ انسانی کو منتشر کرنے کے درپے ہیں۔ افغانستان، کشمیر، عراق اور دنیا کے کچھ دیگر علاقوں میں علاقائی اور بین الاقوامی دہشت گردیاں، سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ سے طاقت کے توازن کا بکھر جانا، عالمی سطح پر سامراجیت کی دوغلی پالیسیاں اور دوسرے ممالک کے وسائل پر غاصبانہ قبضے کے لیے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی بدصورت حکمت عملی خصوصاً معاشی سطح پر دنیا کے غریب ممالک کو غلام بنانے اور نوآباد ممالک کو اپنی منڈیوں میں تقسیم کرنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی منصوبہ بندیاں۔ یہ سب تلخ سچائیاں آج کا ایسا المیہ ہیں جنہوں نے فکری پس منظر ہی میں نہیں عملی حوالے سے بھی لوگوں کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بے معنویت کا جن بوتل سے باہر آنے لگا ہے اور فرد کو اپنی بے بسی اور بے چارگی نے ایک اعتبار سے مفلوج کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر ترقی یافتہ ممالک کی دسترس نے تیسری دنیا کے ممالک کو ذہنی افلاس کا شکار بنا دیا ہے۔ احساسِ کمتری ان لوگوں کا نصیب بن رہی ہے۔ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کا عمل بتدریج بڑھ رہا ہے زندگی کی سہولیات کی فراہمی نے کچھ طبقوں کو اندر سے بزدل بنا دیا ہے اور وہ کچھوے کی طرح اپنے خول میں سمٹنے لگے ہیں۔ انسان نہ صرف دوسرے انسانوں سے دور ہو رہے ہیں بلکہ ہمدردی و غمگساری کا جذبہ بھی بے چہرگی کا شکار ہو رہا ہے۔

ساری دنیا کے ایک عالمی گاؤں میں سمٹنے کے تصور نے مختلف اقوام کی تہذیبی شناخت پر کاری ضرب لگانا شروع کر دیا ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی حوالے سے بھی اپنی زبان اور اپنی تہذیب کا سہارا فرد کو ایک باطنی تیقن سے نوازتا ہے، اسے اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے اسے دوسری اقوام کے افراد سے الگ ایک پہچان اور شناخت دیتا ہے جبکہ سیٹلائیٹ کی سہولت اور ٹیکنالوجی کی دستیابی نے مختلف زبانوں اور ثقافتوں کی مخصوص مہکار کو مجروح کر دیا ہے اور عین ممکن ہے میڈیا کی یلغار اور استعماریت کی چالاکیوں سے آئندہ پچاس برسوں تک بے شمار زبانیں اور ثقافتیں صفحۂ ہستی ہی سے مٹ جائیں۔ گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ آج زندگی زیادہ متنوع اور پیچیدہ ہوگئی ہے۔ سماجی نظام میں پھیلاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ معاشرے کی حدود وسعت پذیری کے عمل میں ہیں، انسانی زندگی محض عالم رنگ و بو پر قانع نہیں رہی بلکہ اب اس کے سامنے نئی کہکشائیں بھی آ رہی ہیں۔ جن سے نئی سچائیوں کے آفاق طلوع ہو رہے ہیں، چنانچہ ادب کی تخلیق میں ان بنیادی سچائیوں کا ادراک ادیب کا بنیادی فرض بنتا ہے۔ سائنس، مذہب، سماجی علوم اور ادب کا آپس میں رشتہ کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ادب کا کام ہمیشہ حقیقت کا ادراک رہا ہے۔

آج کے ادیب کو بھی اسی شعور و ادراک کی ترجمانی کرنا ہے۔ اسے تمام دنیا میں تخلیق ہونے والے عصری ادب کے ساتھ کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کرتے رہنا چاہیے۔ نہ صرف ادب بلکہ دیگر سماجی، سائنسی اور عمرانی علوم سے بھی آگاہی اس کی ذمے داری ہے۔ نہ صرف ان کا مطالعہ بلکہ تجزیاتی گرہ کشائی ہی ادیب کی شناخت کا حوالہ ہے۔

آج کے تخلیق کار کو تاریخ کو سامنے رکھ کر اپنے موضوعات انتخاب کرنا ہیں۔ اسے اپنی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اپنے کان بھی کھلے رکھنے ہیں، ترجیحات کے تعین میں وقت کی صدا کو سننا ہے۔ عالمی منظر نامے میں موجود اور نا موجود تبدیلیوں کے نتائج و عواقب پر رائے دینی ہے، اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اسے اپنی ذات، اپنی ریاست، اپنے معاشرے اور عالم انسانیت کی بقا کے لیے کیسا ادب تخلیق کرنا ہے۔ یقیناً اسے ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے کہ جو افرادی و اجتماعی بھی کرے اور درست سمت میں ان کی رہنمائی بھی، انہیں جمالیاتی حسیات کی آسودگی بھی فراہم کرے اور ان کے فکری دریچوں میں امکانات کی قندیلیں بھی روشن کرے اور سب سے اہم بات یہ کہ لمحہ موجود میں الجھے ہوئے راستوں میں درست راستے کے انتخاب کا شعور بھی دے۔

یقیناً یہ کام صرف شاعر و ادیب ہی کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ احساس تناسب و توازن سے اپنی تمام تر فکری صلاحیتوں کو برتنے اور آزمانے کا ہنر جانتے ہوں۔

واحد بخش بزدار

ارسطو نے کہا تھا کہ وقت اور تبدیلی دو لافانی چیزیں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کھربوں سالوں سے اپنے سفر پر پیہم رواں نظر آتی ہے اور یہ سفر ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ وقت کے اس طویل سفر میں ان گنت انسان مرتے رہے اور جنم لیتے رہے۔ ایک نامیاتی (Organic) حقیقت کے طور پر زمین، زندگی اور تہذیب کا یہ سفر وقت کے ساتھ برابر بدلتا، سنورتا اور ارتقاء پذیر رہتا ہے، جس طرح زندگی وقت کے ساتھ ساتھ تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو صورتوں میں خود کو متشکل کرتے ہوئے اپنے تسلسل کو برقرار رکھتی ہے، اسی طرح تہذیب بھی زندگی کے جلو میں اپنے ٹھکانے اور مسکنیں بدل بدل کر اپنے ارتقاء کے عمل کو دوامیت بخشتی ہوئی نظر آتی ہے۔

زندگی جہاں ایک طرف ماضی کی نسبت سے کہیں زیادہ حسین، بہتر اور مکمل ہوتی جارہی ہے، وہیں دوسری طرف مادی اور سائنسی ترقی نے انسانی رشتہ و تعلق، بنیادی اقدار و روایات اور خیالات و عقائد کو اس حد تک شکست و ریخت سے دو چار کیا ہے کہ زندگی اپنی افادیت، معنویت اور مقصد کھوتی نظر آتی ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ مادی اور سائنسی ترقی کے تناظر میں ادب اور سائنس کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ادب اور سائنس دونوں ہی اپنی فطرت میں انسان دوست رویہ کے حامل ہیں۔ بنیادی جھگڑا تو انسان کے اپنی وضع کردہ اخلاقیات اور معیارات کا ہے، جس کا تعلق بدیہی طور پر استحصالی اور غیر منصفانہ معاشی نظام و اقدار سے ہے۔

بہر طور انسانی رشتوں، عقائد و خیالات اور نظام اقدار کے توڑ پھوڑ کے باعث انسان کے وجود اور ہستی کا سوال، زندگی کے مستقبل کا تصور اور انسانی مقدر کا سوال ایک المیائی صورت حال بن کر سامنے آیا ہے۔

گو حضرت بلھے شاہؒ نے اس صورت حال کو بہت پہلے اپنے ہی انداز میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

بلھیا کیہ جاناں میں کون؟
نہ میں مومن وچ مسیتاں
نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں
نہ میں پاک آں وچ پلیتاں
نہ میں موسیٰ نہ فرعون
بلھیا کیہ جاناں میں کون

آج کی بات کریں تو ان گنت شاعروں سمیت اکبر بارکزئی (Face value) کی بجائے (Intensive value) کے تناظر میں اپنی مشہور نظم (نوکیس دور ءِ نوکیس انسان) یعنی (نئے دور کا نیا انسان) میں اس سوال کا احاطہ یوں کرتے ہیں۔

اک آواز دائم مجھ سے یہ سوال کرتی ہے!

کہ تم کون ہو؟

میں کون ہوں؟

میں ''میں'' ہوں!

اس جواب سے میرا دل مطمئن نہیں ہوتا

مجھے چاہئے کہ میں مان لوں

کہ میں اپنی ذات میں کتنے ''میں'' ہوں

میں کہ صرف ''میں'' نہیں ہوں

میں کبھی سوچتا ہوں

کہ مجھے تو نیا انسان کا خطاب بخشا گیا ہے

میں انسانِ نو ہوں

مگر کون جانے کہ میں اپنے باطن میں کتنے ''میں'' ہوں؟

کبھی انسان ہوں میں، کبھی شیطان ہوں میں

کبھی معصوم ہوں میں، کبھی خونخوار ہوں میں

کبھی رہبر ہوں میں، کبھی رہزن ہوں میں

کبھی حیوان ہوں میں، کبھی انسان ہوں میں

مجھ پہ فخر کرتا ہے نیا زمانہ

کہ نئے عہد کا نیا انسان ہوں میں

مگر میں نہ جانوں

کہ میں کون ہوں؟

شاید انسان ہوں میں!

نئے دور کا انسان ہوں میں!

(نوکیس دور ءِ نوکیس انسان۔ اکبر بارکزئی)

یا بہت پیچھے چلے جائیں تو کوئی تین ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ مصری ادیب ''موت کی مدح'' میں ''زندگی کا نوحہ'' لکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

آج میں کس سے بات کروں؟

دل حریص ہو گئے ہیں
ہر شخص اپنے ساتھی کا سامان ہتھیا رہا ہے
شرافت ختم ہو گئی
لوگ بُرائی پر آمادہ ہیں
کوئی بھی مطمئن نہیں
کوئی جگری دوست نہیں ملا
دھرتی پر بُرائی کا دور دورہ ہے
آج میں کس سے بات کروں؟ (موت کی مداح)

یہ ایک فرد کا یا ایک فرد کے عہد کا المیہ نہیں ہے بلکہ پورے بنی نوع انسان کے مقدر کا المیہ ہے اور یہ المیہ ایک طرف لخت لخت انسانی وجود کا پیرائیہ اظہار بھی ہے اور دوسری طرف زوال پذیر سماجی قدروں کے تناظر میں انسانی زندگی کے مختلف رویوں، صورتوں اور کرداروں کے تضاد کے درمیان جدید انسان کے وجود کی معنویت کی تلاش کا ایک عمل بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ادیب اپنے عہد کا نمائندہ اور ادب اپنے عہد کا ضمیر ہوتا ہے۔ یقینی طور پر اس کا مطلب یہی ہے کہ ادیب اپنے عہد سے ایک کومٹ منٹ (Commitment) رکھتا ہے۔ کسی زمانے میں "ادب برائے ادب" کے پرچار کرنے والوں نے مصر کے پانچ سوفٹ بلند و بالا اہراموں کہ جن کی تعمیر کی خاطر متواتر بیس سال تک چھ سو میل دور سے کئی ٹن وزنی پتھر کھینچ لانے والے لاکھوں غلاموں اور تاریخ کی تاریک راہوں میں بہیمانہ طور پر مارے جانے والے ان گنت انسانی لاشوں پر کھڑے ہو کر، یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ ادب میں کسی کومٹ منٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ ادب میں کسی نظریہ یا پیرا ڈائم (paradigm) کی ضرورت نہیں ہے۔ مجید امجد نے اس طرح کی ہی صورتحال کے بارے میں کہا تھا۔

ستم کی تیغ چلی، گردنوں کی فصل کٹی
اور اس تمام فسانے کی اک بھی سطر حزیں
زبورِ غم میں نہیں

کہا نہیں جا سکتا کہ یہ سب کچھ ادب اور ادیب کے کردار کو (Minimize) کرنے کی ایک شعوری کوشش تھی یا لاشعوری ردعمل۔ بہرحال اس نظریہ سے وابستہ لوگ اپنے عہد کا علم اور وقت کی صلیب اُٹھانے کی بجائے اپنے ہی بے جان اور مُردہ لفظوں کے ہاتھوں مصلوب ہوتے رہے۔ جب ادیب اپنی ذات سے، اپنے عہد سے اور اپنے عہد کے لوگوں سے کوئی کومٹ منٹ نہیں رکھتا تو بھلا ادب کیسے تخلیق کیا جا سکتا ہے؟ ادب تو لوگوں سے محبت اور رومانس (Romance) کا نام ہے۔ محبت اور رومانس کے لئے تو بہر طور کومٹ منٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پوری انسانی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے، اس میں بزدل آدمی نہ تو کسی سے محبت کرتا ہوا نظر آتا ہے اور نہ ہی شاعری کرتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ بزدل آدمی نہ تو اپنی ذات سے کوئی کومٹ منٹ رکھتا ہے اور نہ ہی اپنے سماج سے۔

بہرحال "ادب برائے ادب" کے نام پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، وہ تو کتب خانوں اور کتب فروشوں کے دکانوں پر مُردہ

لفظوں کی قبریں نظر آتی ہیں ورنہ ادب تو کبھی نہیں مرتا یا بقول بے ڈبلیو ہن (زندہ ادب کسی وقت بھی نہیں مرتا اس پر ہر ایک دور کا زمانہ حاضر ہی چھایا رہتا ہے)۔

رہا یہ سوال کہ بدلتی دنیا میں ادب کوئی کردار ادا بھی کر سکتا ہے؟ یا زیادہ واضح لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کیا ادب میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ سماج کی صورتحال کا پانسا اپنے حق میں پلٹ سکے اور وقت کی باگ کو اپنی گرفت میں لے سکے؟

اس کا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ اگر ادب میں اتنی قوت نہ ہوتی تو ارسطو کو اسے اپنی "Republic" سے خارج کرنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہ ہوتی لیکن یہاں یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ہر بار معصوم اور بے ضرر پاک اور پوتر غزلوں یا نظموں سے سماج میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی، اور نہ ہی بدلتی ہوئی دنیا میں ادب سے کوئی موثر کام لیا جا سکتا ہے، کیونکہ کسی بھی کام کو کرنے کے لئے زندہ و تابندہ حرف و الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ لوگوں میں سماجی اور تاریخی جبر کا شعور اجاگر کیا جا سکے۔ اس لئے ادیب کے لئے نہ صرف عصر کا شعور ضروری ہے بلکہ اسے ایک مرکزی نظریہ کی بھی ضرورت ہے۔

یاد رکھیئے! ادب تو وہی ہوتا ہے جس میں دیکھنے کی قوت اور بولنے کی سکت ہو۔ وہ ادب ہی کیا جو نہ بول سکتا ہو اور نہ ہی بات کر سکتا ہو۔ سارتر نے کہا تھا کہ (معصوم ادب تو سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم معصومیت سے نہ بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں)۔

یہاں کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ادب کو (Trade Union) ادب کے سنگھاسن پر فائز کیا جائے۔ ادب کو کسی پارٹی کا "Organ" یا سلوگن "Slogan" بنا دیا جائے۔ ادب کے نام پر بے ادبی کی جائے۔ کہتے ہیں کہ بڑا ادب تو وہی ہے جو زندگی اور زندگی کے کاروبار سے بلند ہو کر زندگی پر غور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ زندگی کو سنوارنے، نکھارنے اور خوبصورت بنانے کی قوت رکھتا ہو۔ یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ خاطر رہے کہ زندگی کو خوبصورت بنانے اور سماج کی بدصورتی کے خلاف سب سے پہلے ادب ہی نے مزاحمت کی تاریخ رقم کی ہے۔ ظلمت، جہالت اور بربریت کے خلاف انکار، ردعمل، احتجاج اور بغاوت کی روایت ادب ہی نے قائم کی ہے اور ادب ہی نے انسانی مقدر کے سوال کو اہمیت اور اولیت دی ہے یہ بھی ذہن میں رہے کہ بالآخر ادب ہی انسانی مقدر اور انسانی مستقبل کا آخری اور دائمی حوالہ ہے۔

یہاں "New Testament" کا یہ حوالہ دینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔

"In the beginning was the word, And the word was God"

اکبر بارکزئی نے اسی پس منظر میں اپنی مشہور نظم "لبز" یعنی (لفظ) میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔

لفظ ابتدائے حیات

لفظ انتہائے حیات

لفظ وحرف کے پیغمبرؑ کو صد درود و سلام

لفظ ہستی کا نقش ازل

لفظ روح عصر

لفظ رہنمائے دہر

لفظ پروردگار

لفظ شہر پناہ

لفظ کو وندا

لفظ آزاد کرتا ہے انسان کو

لفظ برباد کرتا ہے انسان کو

لفظ کے خوف سے سنگ و آہن پگھل جاتے ہیں

پہاڑوں کے دل بھی دہل جاتے ہیں

لفظ کی روشنی کو قتل کرنا ممکن نہیں

لفظ کو پابہ زنجیر کرنا ممکن نہیں

لفظ کو جراتِ اظہار دو

لفظ کو سلیقہِ اظہار دو

لفظ آزادی کی تعبیر ہے

لفظ زندگی کی تفسیر ہے

لفظ ظلم کی موت ہے

لفظ آدرشِ حیات

لفظ سقراط کا متاعِ ہنر

لفظ منصور کا ایمان ہے

سوچ کو لفظ کی صورتیں بخش دو

خیال کو لفظ کی حرمتیں بخش دو

(لہٰذ ۔ اکبر کزئی)

اور جو ہر میر نے بجا طور پر کہا تھا:

اک ہم ہی نہیں ، اہلِ قلم اور بھی ہوں گے
لکھیں گے جو رودادِ ستم اور بھی ہوں گے
اے نوحہ گرو تم صفِ ماتم نہ بچھاؤ
زندہ ہیں ابھی ہم تو یہ غم اور بھی ہوں گے

ورڈز ورتھ نے کہا تھا کہ جب تک انسان اپنے وجود، اپنی ہستی کو وسعت نہیں دے گا، تب تک اس کی معنویت پوری طرح اُجاگر نہیں ہو سکتی۔ زندگی کی معنویت کو اُجاگر کرنے کے لئے ادب میں ایک مرکزی نظریہ یا ایک مرکزی آدرش کی ضرورت ہے، جو غیر تاریخی اور غیر جغرافیائی طرزِ احساس کا حامل ہو۔ غیر تاریخی اور غیر جغرافیائی تصور کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ ادیب سے اس کا شخصی، سماجی اور وطنی مفہوم منہا کیا جائے اور یہ بھی نہیں کہ ادیب اپنی ذات کے اردگرد مکڑے کی طرح ایک

جاۓ نہ کہ ساری عمر اپنے ہی حصار میں مقید رہے۔ یاد رکھیے! انسان اتنا چھوٹا کبھی نہیں ہوتا کہ اسے کسی حقیر اور بے توقیر نظریاتی چوکھٹ میں بند کیا جا سکے بلکہ اس حوالے کو وسیع تناظر میں اس طرح سے لیا جائے کہ اپنی سرزمین سے محبت، اپنی روایت اور ثقافتی سرمایہ پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ پورے بنی نوع انسان سے محبت و احترام کا ایک دائمی اور آفاقی رشتہ استوار ہونا چاہیے

زندگی اور انسان کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے، جب سماج میں بدصورتی کی تمام وضعیں چاہے وہ نسلی اور لسانی تعصب کی شکل میں ہوں، طبقاتی جبر و فرق، عدم برابری کی شکل میں ہوں، ختم ہوں اور انسان اشرف المخلوق کی حیثیت سے سماج میں اپنی ذمہ داریوں اور مقام و مرتبت کا تعین کرے کیونکہ انسانوں کی فلاح اور خوشحالی کا راز مجموعی انسانی بقا، عالمی امن اور عالمی اجتماعیت میں مضمر ہے۔

اسی خواہش کی تکمیل کے لئے ساحر لدھیانوی نے بجا طور پر ایک خواب بننے کی بات کی تھی۔

آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے غم ناک درد کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکیں

ساحر لدھیانوی کے خواب کی طرح ملک طوقی کی آرزوئے سحر بھی انسانی تقدیر کے حوالے سے ایک ایسا بنیادی سوال ہے کہ جس کا حل صرف اور صرف عالمی اجتماعیت، عالمی امن اور عالمی احساس میں پنہاں ہے۔

زندگی اِک عذاب ہے
مگر اس کے بغیر بھی کچھ نہیں
آؤ! اپنے چاند جیسے حسیں بیٹوں
اور گلبدن بیٹیوں کی خاطر
اک خوبصورت سحر تراشیں
ان عذابوں سے جان چھڑا لیں
اگر میں نہ ہوں گا
تو تم رہو گے
میری نسل کے جری سپوتو!
ہم نہ ہوں گے
مگر زندگی تو تاابد رہے گی

(Exsitentialism۔ملک طوقی)

بعینہ اسی طرح بلوچی زبان کے نامور شاعر عطا شاد اپنی نظم ''ساعت نیسران اِنت'' (یعنی وقت امر ہے)، میں زندگی کی

ابدیت کے تناظر میں تابناک انسانی مستقبل کی آرزو کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وقت امر ہے
انسان مرتے ہیں
میں ایک نئی اعلیٰ و ارفع
زندگی کا منتظر ہوں

(ساعت نیراں انت۔ عطا شاد)

یہ تمام تر خواہشیں اور آرزوئیں اپنی جگہ برحق ہیں مگر صورت حال یہ ہے بلکہ اسے المیاتی صورت حال کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ ایک طرف انسان زندگی کی تلاش میں کائنات کے وسیع اور بیکراں وسعتوں میں فطرت کے سربستہ رازوں اور تاریک گوشوں کو کھوجنے میں مگن ہے تو دوسری طرف ظلمت، جہالت، پس ماندگی، عدم مساوات، عدم رواداری اور جنگ و جنون کی جلو میں بربریت آج ایک نئی تاریخ لکھنا چاہتی ہے۔ اتنی بلندی اور اتنی پستی!

ول ڈیورانٹ کے بقول "بربریت تو جنگل کی طرح ہوتی ہے جو اپنی شکست کبھی تسلیم نہیں کرتی۔" ایسے حالات میں جب بربریت اپنے لاؤ لشکر سمیت پورے جاہ و جلال کے ساتھ زمین، زندگی اور تہذیب پر شب خون مارتی ہوئی نظر آتی ہے تو کیا ادیب کو اپنی متاع لوح و قلم پھینک کر سرنڈر (Surrender) کرنا چاہیے؟

اگر نہیں تو، حرف و لفظ کے پاسداروں کو والتیر کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ "جب میں قلم اٹھاتا ہوں، تو حالت جنگ میں ہوتا ہوں" اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں سارتر کا یہ قول بھی یاد رکھنا چاہیے کہ "ادیب کی حیثیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک خاص قسم کا انسانی سماج ہو۔ ہر قسم کے سماج میں اس کی حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی۔ مظلوم و مجبور سماج میں ادب زندہ نہیں رہتا۔"

خدا نہ کرے اگر سماج کے سر سے ادب کا سایہ اٹھ جائے تو قدم قدم پر بربریت اپنے خونی پنجے گاڑتی ہوئی نظر آئے گی اور ہمارے صاف و شفاف چشمے زہر سے بھر جائیں گے۔ یاد رکھیے! ادب ہی نے انسانی اور غیر انسانی سماج کے درمیان فرق و امتیاز کی لکیر کھینچ دی ہے، اور اگر درمیان سے ادب کی یہ لکیر مٹ جائے تو وہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مجبور سورانی

ادب زندگی ہے اور زندگی ادب، ادب وہ آئینہ ہے جس میں کسی قوم کی تہذیب، ثقافت، عقائد، رجحانات اور رسم و رواج منعکس ہوتے ہیں۔ وقت ایک ایسا دریا ہے جو کبھی نہیں رکتا اور اپنے ساتھ اقوام کو بہائے چلا جاتا ہے۔ اس بہاؤ میں جو اقوام اور معاشرے ہاتھ پاؤں مار کر خود کو سنبھالنے کی جد و جہد کرتے ہیں وہی قومیں صفحۂ ہستی پر نمودار رہتی ہیں اور جن کے پاؤں اکھڑ گئے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمانے کے سمندر میں ڈوب کر فنا ہو جاتی ہیں۔

ماضی کی تاریخ اور آثار قدیمہ سے قوموں کے عروج زوال کا جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سے جتنی اقوام مٹ گئیں تو مٹتے وقت مادی لحاظ سے وہ انتہائی عروج کو چھو رہی تھیں، اگر مادی ترقی کسی قوم کی بقا کی ضمانت ہوتی تو ہڑپہ، موئنجو داڑو، بابل، نینوا کی تہذیبیں آج بھی روئے زمین پر اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہوتیں۔ قیصر و کسریٰ آج بھی پوری شان و شوکت سے جلوہ افروز رہتے، لیکن ایسا نہیں ہے کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی قوم کی بقا، اخلاقی اقدار کی حفاظت میں ہے اور جب یہ اقدار تمدن و معاشرت کا حصہ بن کر تہذیب کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں تو ان تہذیبوں کو دوام اور بقاء حاصل ہوتا ہے۔

بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر اگر کوئی لکھنا چاہے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے اس موضوع کو ایک مقالہ میں نہیں بلکہ ایک کتاب ہی میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بدل گئی اور بدل رہی ہے قوموں کی پرانی اقدار، رہن سہن کے اطوار اور ادب، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے متاثر بلکہ مسحور ہو رہے ہیں۔

ایسے حالات میں ادب اور لکھاری اپنے قومی اقدار اور تہذیب و تمدن کو اپنی آغوش میں بھرتا ہے اور ان کی ترویج و ارتقاء کے لیے اگر قدم اٹھاتا ہے تو گویا اپنے دامن کو انگاروں سے بھرتا ہے۔ آج دنیا بدل گئی اور بدلی ہوئی دنیا نے ہم کو نئی لغات اور اصطلاحات سے متعارف کیا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی جدید ڈکشنری میں ظالم اور جابر کو امن کا علمبردار مانا جاتا ہے۔ مظلوم و محکوم قومیں اگر اپنے دفاع کے لیے کچھ ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں تو جدید ڈکشنری میں اس کو دہشت گردی اور عالمی امن کے لیے خطرہ گردانا جاتا ہے۔

ایسے حالات میں ادیب اور لکھاری کا فرض ہے کہ وہ ادب میں حقیقت پسندی سے کام لیں، سچائی کو نصب العین بنائیں، ان جدید اور پرفریب اصطلاحوں کی گہرائیوں اور ان کی پشت پر جو قوتیں کارفرما ہیں نظر میں رکھیں اور سوچیں کہ ایک وقت وہ تھا

کہ جب یہ قوتیں ادیبوں اور شاعروں کو "ترقی پسندی" کے نام پر عریانی وفحاشی اور لادینیت کی پرچار کے لیے استعمال کر رہی تھیں ۔ اس طرح آج بھی سامراجی قوتیں اپنے مذموم عزائم پر پردہ ڈالنے اور اپنے مکروہ منصوبوں کی تکمیل کے لیے ادیبوں اور شاعروں کو "روشن خیالی" اور "اعتدال پسندی" کی اصطلاح سے گمراہ کر رہی ہیں۔

لہٰذا بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار حقیقت پسندی اور سچائی ہونا چاہیے۔

ہر آن بدلتی دنیا میں سب سے اہم کردار ان سائنسی علوم وفنون کا ہے جن کا آغاز اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ہوا لیکن بعد میں ان علوم وفنون نے اپنے اصل مرکز سے ہٹ کر مغرب کی گود میں پرورش پائی۔ ایسا کیوں ہوا، اب اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے ہیں، اس کی ہلکی سی جھلک شاید اس مضمون میں نظر آسکے۔ "بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار" ایک وسیع موضوع ہے اس کا احاطہ کرنے کے لیے پوری دنیا کے ادب کی آگاہی ضروری ہے۔ موجودہ دور میں عالمی سطح پر دہشت گردی کی جو شدید لہر اچانک آئی ہے، پوری دنیا کے ادیب اس کو کس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اس دہشت گردی سے انسانی زندگی کس طرح متاثر ہوئی، اس کے پس پردہ وہ کونسے عوامل ہیں جنہوں نے پوری دنیا کو خوف، تشدد، بے سمتی اور کرپشن کے اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔

اس عہد کا اضطراب اور ہوس اقتدار پوری انسانیت کو کس منزل کی طرف لے جا رہا ہے مستقبل میں انسانی زندگی کی تصویر کیا ہوگی۔ کیا سائنس نے تمام مسئلوں کا حل دریافت کرلیا ہوگا؟ یہ تمام سوالات بہت اہم ہیں جن کا جواب عالمی ادب کے پاس شاید ہو...... یہاں شاید کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ مذکورہ حالات جو غالباً جنگ عظیم کی ہولناکی سے کسی طرح کم نہیں، اس پر آج تک 1935ء میں ہونے والی بین الاقوامی مصنفین کی کانگریس برائے تحفظ و کلچر جیسی کانفرنس دوبارہ منعقد ہو سکی۔ پیرس میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں تقریباً پوری دنیا کے ادیب شریک تھے اور اس کا مقصد انسانی تہذیب اور تمدن کو رجعت پرستی اور زوال سے بچانے کی کوشش پر مشتمل تھا۔ اس میں سفارش کی گئی تھی کہ ادب کو سائنسی عقلیت پسندی سے ہم آہنگ کر کے ایسے اصول مرتب کئے جائیں جن کے تحت جدید علوم وفنون کے ساتھ ساتھ سماجی، تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کو عالمی تناظر میں اس طرح فروغ حاصل ہو کہ پوری انسانیت بدلتی دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے قابل ہو سکے۔

یہ کانفرنس انیس ویں صدی کی ان سائنسی فتوحات کا ردعمل تھی جو جنگ عظیم پر منتج ہوئیں۔ مغرب میں ریشنلزم کا نظریہ مقبول ہوا جس کے تحت ہر مسئلے کا حل عقل اور سائنسی ترقی کو سمجھ لیا گیا تھا، یہاں تک کہ انسان خود بھی سائنسی فارمولے پر قائم ایک ایسی تخلیق قرار پایا جو عقل کے تابع تھی۔ ارتقائے نسلی اور وجود کو برقرار رکھنے کے لیے خوراک کی ضرورت ... ان دو چیزوں کو بنیاد بنا کر انسان کی فارمولاتی تشریح کی گئی ہے اور یہ حقیقت فراموش کردی گئی کہ انسان اس کائنات کا ایک ایسا راز سربستہ ہے جو سائنس کی تمام ترقی کے باوجود آج تک خود اپنے آپ پر بھی منکشف نہیں ہو سکا جس کے بغیر کائنات تک رسائی ناممکن ہے۔

بقول اقبال:

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

زندگی کی یہی وہ شب تاریک ہے جو ادب اور سائنس کے مابین حائل خلیج نے پیدا کی ہے جس کے سبب سائنسی فتوحات کے حیرت انگیز مظاہر کے باوجود انسانی زندگی آج بھی بھوک افلاس اور تشدد کا شکار ہے، جس کے سبب تیرگی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور ماضی کے ان جھروکوں میں جھانکنے کی دعوت دیتی ہے جب ہٹلر نے جرمنی پر، مسولینی نے برطانوی اور فرانسیسی پشت پناہی سے مشرق کے ایک پس ماندہ ملک حبشہ پر قبضہ کیا تھا ۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ غور کیا جائے تو موجودہ دور میں صرف افغانستان اور عراق کے حالات سے بھی بہت کچھ سیکھنے میں مدد ملتی ہے اس بات سے قطع نظر کہ عالمی سطح پر اس کہانی کی اصل حقیقت کیا ہے قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں خود وہاں کے لوگوں کا اپنا کردار کیا تھا۔ افغانستان میں بے سروسامانی کے باوجود سوویت یونین جیسی قوت کو شکست دینے کے بعد فتح کا یہ نشہ ہوس اقتدار کی باہمی جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ عراق میں بھی اندرونی قوتوں کی باہمی رسہ کشی نے موجودہ حالات پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دنیا کے بیشتر ترقی پذیر خصوصاً مسلم ممالک قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود جس کسمپرسی کا شکار ہیں وہ تمام عالم انسانیت کے لیے درس عبرت ہے، کیونکہ علمی اور مذہبی سطح پر ان کی اصل روح کو سمجھے بغیر کئے گئے عمل نے انہیں سینکڑوں فرقوں اور گروہوں میں جس طرح تقسیم کیا، یہ چیز خود عبرت انگیز ہے۔ وہ قوم جو پوری دنیا کو معیشت، سیاست، مذہب اور تہذیب کے اعلیٰ معیار دینے پر قادر ہو سکتی تھی بے علمی کا شکار ہو کر آج تک کنزیومر سوسائٹی کا حصہ ہے۔

یہاں ایک بات تو صاف ہے کہ مذکورہ ممالک اگر اقتدار کی باہمی جنگ اور علمی سطح پر نقالی کی بجائے قومی صلاحیتوں اور قومی ضرورت سے ہم آہنگ ایک مضبوط تعلیمی نظام کی طرف توجہ دیتے تو شاید آج صورت حال یکسر مختلف ہوتی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ رہنمائی کون کرتا؟ ترقی یافتہ اقوام میں رہنمائی کا یہ فریضہ بالعموم ادیب، شاعر اور دانشور کے پاس ہوتا ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب ماضی اور حال کی روشنی میں مستقبل کی حقیقی تصویر کا ادراک رکھتا ہے، جس کے سبب وہ پوری قوم کو فکر و احساس کے وہ پیمانے عطا کر سکتا ہے جو قومی پس منظر میں آگے بڑھنے اور دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا شعور عطا کرتے ہیں لیکن یہاں بھی افسوس ناک بات یہی ہے کہ ماضی میں نوآبادیاتی نظام کی چکی میں پسنے والے ممالک میں طبقاتی نظام تعلیم نے وہ روشنی پیدا ہی نہیں ہونے دی جس میں ادب اور دانش کی پرورش ہوتی۔

قومی سطح پر بھی اگر غور کیا جائے تو آزادی کے بعد اس نظام تعلیم نے کم از کم نوے فیصد لوگوں کی ذہانت اور صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ پچھلے چند برسوں میں زندگی کے ہر شعبہ کی طرح تعلیمی شعبے میں بہتر تبدیلیاں آئی ہیں جو مختصر عرصہ کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ ہیں لیکن اب بھی ہمارے تعلیمی نظام کی گاڑی جن دو پہیوں پر چل رہی ہے اس میں ایک پہیہ سائنس کی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی ہے وہ مغرب سے درآمد کیا گیا ہے۔ اس پہیے کا سائز بہت بڑا ہے۔ دوسرا پہیہ آرٹ، تہذیب،

کلچراور ادب ہے جو ہمارا اپنا ہے، تعلیمی تناظر میں اس کا سائز بہت چھوٹا ہے۔ 56 سالہ زندگی میں طبقاتی نظام تعلیم اور دو غیر متوازن پہیوں پر چلنے والے تعلیمی نظام نے نہ صرف غربت بلکہ intelectual poverty میں بھی خطرناک حد تک اضافہ کیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو 1857ء کے بعد بھی intelectual poverty کی یہ صورت حال نہیں تھی جب برصغیر میں انسانی زندگی کے اجتماعی مسائل بے زمینی اور فلاکی کیفیت سے دوچار تھے۔ اس کی زندہ تصویر داغ، حالی اور اس عہد کے دیگر شعرا کے مرثیوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ میر اور غالب کی شاعری میں اس عہد ہندوستان کے آنسو مجسم ہیں۔ یہی آنسو اقبال کی شاعری میں رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ یہی وہ آنسو تھے جو سرسید تحریک میں عقیدت پرستی بن کر اترے اور یہی آنسو ایک بدلی ہوئی شکل میں فیض کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں سود وزیاں سے بلند ایک ایسی آواز سنائی دیتی ہے جو نظریاتی ہونے کے باوجود معاشی، مذہبی، اخلاقی وتہذیبی خانوں میں منقسم نہیں بلکہ تمام حقائق کو مل کر انسانیت سے محبت کی شکل میں وحدت تاثر کی قوت بنے۔ ان کی شاعری کا محور ومرکز ایک ہی سوال ہے کہ یہ دنیا صدیوں سے تاریک بہیمانہ طلسم کا شکار کیوں ہے؟ انہوں نے ذاتی کرب کے آئینے میں پوری انسانیت کو دیکھا اور دکھ کے ذاتی تجربوں سے پوری انسانیت کے درد کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی۔ فیض کو یہ معلوم تھا کہ ذات کا کرب جن قوتوں کا پروردہ ہے وہی قوتیں معاشرے کے لیے ناسور ہیں۔ ذات کا کرب اور زمانے کا کرب ہم آہنگ ہو کر ہی کسی ادیب کی تخلیق میں جذبے اور سوچ کی وہ لہریں پیدا کرتا ہے جو پورے معاشرے کے دل کی دھڑکن بن کر تبدیلی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ان کے نزدیک عشقیہ کیفیت کوئی انفرادی جذبہ نہیں بلکہ ملک، قوم، رنگ ونسل کے تعصب سے پاک درد کا ایسا رشتہ ہے جو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں غزل کے روائتی رقیب سے بھی درد کا یہ رشتہ غم الفت کا مشترکہ تجربہ بنتا ہے۔ وہ رقیب تک سے بھی یوں مخاطب ہیں۔

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

یا پھر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی!
یاس وحرمان کے دکھ، درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخ زرد کے معنی سیکھے

ان اشعار میں ادب کے اس کردار کی وضاحت ہوتی ہے جس کے تحت پوری دنیا اور پوری انسانیت سے محبت کرنا ہی ادب کا اصل منصب ہے۔

آج کی بدلتی ہوئی دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی متحیر کرنے والے ایجادات نے ایک طرف خارجی زندگی کو مادی آسائشوں سے نوازا ہے تو دوسری طرف داخلی جذبوں اور احساسات کو نظر انداز کر کے روحانی سطح پر انسانیت کو ایک غیر مرئی خوف میں مبتلا کیا ہے۔ سائنسی ترقی کے اس متضاد کردار میں توازن پیدا کرنے کے لیے ادب آج بھی وہی کردار ادا کرسکتا ہے جو جنگ عظیم کی ہولناک تباہی کے بعد بین الاقوامی کانفرنس میں دنیا بھر کے ادیبوں نے مل کر سوچا تھا، کیونکہ پرانی جنگوں کی شکست و

ریخت میں اقتدار کی محرومی یا حصول کے بعد زندگی اسی طرح رواں دواں رہ سکتی تھی لیکن آج کے عہد میں جس ایٹمی جنگ کے خطرات منڈلا رہے ہیں اگر خدانخواستہ یہ چھڑی تو انسانی زندگی ملبے کا ڈھیر بن جائے گی۔ انسان چرند، پرند، برگ و بار کسی چیز کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا۔ یہی وہ فیہ مرئی خوف ہے جس نے پوری عالمی برادری کو گھیر رکھا ہے آج جب کمپیوٹر ہونے ادیب کے ہاتھ میں وہ جام جم دے دیا ہے جس میں اس بدلتی دنیا کا ایک ایک لمحہ منعکس ہو رہا ہے اور اس کے پاس وہ ذرائع بھی موجود ہیں کہ اپنی بات بہت آسانی کے ساتھ دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا سکتا ہے۔ تو یہ ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ نئی نسل کے ہاتھ میں ایسا آئینہ دے جس میں وہ دیکھ سکے کہ بدلتی دنیا کے تناظر میں وہ کس منزل اور کس مقام پر ہے، جو بے حسی، دہشت گردی اور جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی اس نسل کے دکھ سمجھ سکے جو کولہو کے بیل کی طرح فکر معاش میں سرگرداں ہے، اس کے لیے فکر و شعور کی ان راہوں کا تعین کر سکے جن میں اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق کسی واضح نصب العین کی تصویر ہو۔

اپنی بات یہاں ختم کروں گی کہ سائنس کی حیرت انگیز فتوحات کے باوجود یہ عہد اپنے اس ادیب اور دانشور کی تلاش میں ہے جو اس عہد کی پہچان اور روح عصر کا ترجمان ہو جس کی تحریروں میں مذہب، کلچر، ملک یا سیاست کی دیواریں حائل نہ ہوں اور جو سائنسی ترقی کی رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ ساتھ انسان کے ان داخلی جذبوں تک رسائی رکھتا ہے جو ہر قسم کے تعصب اور سود و زیاں سے بلند صرف مشفقیہ قوتوں سے تشکیل پاتے ہیں، جو سائنسی ترقی اور ایٹم کی دریافت کو وہ سمت مہیا کر سکے جو دنیا کو راکھ کا ڈھیر بنانے کے بجائے جنت ارضی بنانے پر قادر ہو اور جو فیض کی طرح یہ کہہ سکے ۔

غمِ جہاں ہو، رخ یار ہو کہ دست عدو
سلوک جس سے کیا، ہم نے عاشقانہ کیا

قیصرہ حیات

اعلیٰ اقدار کا حامل ادب اور اس کے شہ پارے ہمیشہ سے انسان کے ذہنی ارتقاء، شعوری پختگی اور کرداری تربیت میں اہم کردار ادا کرتے آ رہے ہیں کیونکہ ادب کی تمام اصناف کا مقصد انسانی جذبات کی نشوونما، انکا نکھار سسں اور خیالات کی ترجمانی ہے اور بہترین ادب کا درجہ اسے ہی دیا جاتا رہا ہے جو اپنے عہد کی معاشرتی زندگی کا بہترین اور بھرپور عکاس ہو، جس کا کینوس زندگی کے تمام پہلوؤں سے لبریز ہو اور جس میں زندگی کے تمام شوخ و چنچل، رو کھے پھیکے، رنگ، جذبات و احساسات کی نیرنگیاں بھرپور انداز میں قاری کے پراگندہ ذہن اور منتشر خیالات کے لیے آسودگی کا باعث بن کر ان کو معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہوں۔

جیسا کہ عام طور پر یہ قیاس ہے کہ معاشرتی انحطاط کے دور میں (جب اخلاقی و سماجی قدریں بری طرح پامال ہو رہی ہوں) بہترین ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ تنزلی کے ان ادوار میں انسان کے اندر چھپی مخفی قوتیں، دبے ہوئے احساسات و جذبات اور ایک بہترین معاشی زندگی کے حصول کے لیے تصورات بھرپور انداز میں جنم لیتے ہیں۔ تبھی انسان کا باطن قدرے متحرک ہو کر زندگی کے پردے پر بھرپور انداز میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس دور کے معاشرتی رویے و اخلاقی تقاضے انسان کی سوچ کو ایک خاص رخ کی طرف پھیر دیتے ہیں اور ایک نئی جذباتی دنیا جنم لیتی ہے۔ جب اس دور کا حساس تخلیق کار اپنے مخصوص انداز میں ان رویوں کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ اس مخصوص دور کی مخصوص آواز بن کر ابھرتا ہے۔ جیسے اقبال کی شاعری نے جدوجہد پاکستان کے دوران ایک نیا موڑ لیا، فیض کی انقلابی شاعری اور پریم چند و منٹو کے افسانوں کے علاوہ ان تمام ادباء و شعراء کی تخلیقات جنھوں نے زندگی اور معاشرے میں موجود خلا کو اپنے اپنے انداز میں محسوس کیا اور اسے احاطہ تحریر میں لائے، اور آنے والی نسلوں نے بھی ان میں ایک اچھوتا پن محسوس کیا۔ جیسا کہ لازوال ادب وہی ادب کہلایا ہے جو ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرتا آیا ہے، جو اپنے دور میں بھی محظوظ کرتا آیا ہے اور آنے والے ادوار کے قارئین کے لیے بھی ذہنی آسودگی کا باعث بنتا رہا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مختلف ادوار میں ادباء کی ذمہ داریاں بھی مختلف رہی ہیں کیونکہ انسانی معاشرہ ہمیشہ سے تغیر و تبدل کا شکار رہا ہے۔ زندگی کبھی بھی پرسکون سمندر ثابت نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے اس جوار بھاٹے میں جنم لینے والی انسانی اقدار بھی عروج و زوال کا نشانہ بنتی رہی ہیں اور اس روانی کو معتدل کرنے کے لیے لوگ اپنی اپنی کاوشوں اور نظریات پر مبنی تخلیقات سے

معاشرے پر اثر انداز ہوتے رہے۔

اگر ہم ماضی کا جائزہ لیں تو ایسی ایسی شاہکار تخلیقات سامنے آتی ہیں کہ انسانی ذہن کے اس ارتقاء اور سوچ کے منفرد زاویوں کو محسوس کر کے عقل و سوچ محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ان ادبی روایات کا جائزہ لیتے لیتے جب گزشتہ صدی کے اختتام اور نئی صدی کے آغاز کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ایک حساس ادبی ذہن چونک جاتا ہے اور سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ ادیب کہاں گیا جو اعلیٰ ادبی ذوق کی تسکین کرنے والا تھا، جو معاشرے کی رویوں کو نئی جہت اور نیا رجحان دینے والا تھا، جو ذہنی ارتقاء میں اہم کردار ادا کرنے والا تھا، جو معاشرے کا بہترین عکاس تھا۔ ہر طرف ایک گہرا سکوت اور جمود سا دکھائی دیتا ہے۔ مسئلہ یہی ہے کہ ادب، ادیب اور قاری ایک مثلث کے تین اہم زاویوں میں سے کوئی ایک اپنی سمت سے ہٹ گیا ہے جس نے دوسرے دو زاویوں کو بھی غیر مستحکم کر دیا ہے اور اب تینوں عدم توازن اور بے ثباتی کا شکار نظر آتے ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ادب کا وجود ادیب سے ہے اور ادیب کا وجود قاری سے۔ جب تک ادب کو پڑھنے والا، سمجھنے والا اور سراہنے والا قاری نہیں ہوگا ادیب اپنی ذمہ داریوں کی طرح احسن طریقے سے پوری کر سکے گا۔ گو کہ ادب اب بھی تخلیق ہو رہا ہے اور تب تک تخلیق ہوتا رہے گا جب تک قدرت ادبی ذہن تخلیق کرتی رہے گی مگر ادب کا جو تنزلی کے اس دور میں رو بہ زوال نظر آتا ہے اور وہ قیاس کہ معاشرے کی تنزلی کے دور میں بہترین ادب تخلیق ہوتا ہے ایک قیاس ہی ثابت ہو رہا ہے جس میں صداقت نہیں رہی کیونکہ قاری معاشرہ ہے اور ادیب اس معاشرے کا عکاس جو اپنے نظریات و احساسات کو ادب کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ جب قاری ہی شدید مسائل سے دوچار ہو اور زندگی کی جدوجہد میں بھرپور کردار ادا کرنے والا ایک مشینی پرزہ بن گیا ہو جو مادیت کے حصول میں بری طرح الجھا ہو وہ کس طرح اپنی منزل کا تعین کر سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کا قاری، قاری نہیں رہا بلکہ احساسات و جذبات سے محروم روبوٹ بن گیا ہے جس کے اندر سب کچھ تو ہے مگر کچھ بھی نہیں۔ وہ ہر دم بدلتی دنیا اور اس کے مختلف ذائقوں کو حیرت سے دیکھ رہا ہے، گلوبل ویلج کا نام دے رہا ہے مگر اس کی حقیقت سے بے بہرہ ہے۔ یہ ہر دم قریب آتی دنیا نے قریبی انسانوں کو بھی ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ ایسی دنیا جو بڑی آبادی یعنی فیملی کمیونٹی اور انفرادیت تک محدود ہوتی جا رہی ہے مگر جذباتی طور پر کٹتی دور ہوتی جا رہی ہے۔ گو کہ آج کا انسان بہت باشعور ہو گیا ہے مگر سائنسی ایجادات کی بھرمار اور روز مرہ زندگی کی تیزی نے احساسات کی زبان ہی چھین لی ہے۔ خوبصورت پیرائے میں سموئے خوبصورت الفاظ، جذبات و احساسات کے بہترین عکاس گو کہ ناپید نہیں ہوئے مگر ان سے لطف اندوز ہونے والے لوگوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ کمی ہوتی جا رہی ہے۔ درحقیقت اس مشینی دنیا اور اس کی تیزی سے بدلتے تقاضوں نے اس دور کے انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ آج کے انسان کے پاس سوچنے کے لیے لامحدود موضوعات، نت نئے مسائل اور ان گنت خیالات ہیں اور اس کی یہ سوچ معاشرے کی بدلتی ہوئی ان اقدار کا نتیجہ ہیں جو اتنی ہی تیزی سے بدل رہی ہیں جتنی تیزی سے انسان کا ذہن اور آج کا ادیب ان کو احاطہ تحریر میں لانے کی جدوجہد میں مصروف ہے مگر اس جدوجہد کی رفتار قدرے سست ہے کیونکہ گزشتہ ادوار کی نسبت آج کے ادیب کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ میڈیا ہے۔ آج کل میڈیا اتنا سٹرانگ ہو گیا ہے کہ ادیب سوچنے، لکھنے اور کتاب چھپوانے کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے کہ وہ خیالات ایک خوبصورت، دلچسپ اور گلیمر سے بھرپور ٹیکنالوجی کے ذریعے عوام کے سامنے آ جاتے ہیں اور ادیب کی تمام کاوشیں سرد پڑ

جاتی ہیں۔

نیز ادبی زبان جس کے بغیر ایک ادیب اپنی تحریر کو خود ہی تشنہ محسوس کرتا ہے آج کا قاری اس سے ایسے ہی دور بھاگتا ہے جیسے ماضی کا قاری غیر ادبی و غیر سنجیدہ اور غیر معیاری تحریروں سے بدکتا تھا۔ فی زمانہ بدلتی اقدار نے آج کے ادیب کو قدرے حیران کر دیا ہے۔ وہ جو منٹگو بیلجیئم Montague Belgium کے اس قول کہ "ادب کے مطالعے سے زندگی کے رنگ و روپ اور مزاج و طبیعت کے ادراک اور وجدان میں وسعت پیدا ہوتی ہے" کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ اسے ہر جانب تضاد نظر آ رہا ہے۔ کیونکہ جب معاشرے میں مادیت پرستی عروج کو پہنچی رہی ہو اور ہر طرف گلیمر کا دور دورہ ہو، جب ادب سے اکتایا قاری ذہنی تفریح کے سامان ڈھونڈنے میں مصروف ہو تو ایسی دگرگوں فضاء میں کس طرح کا ادب جنم لے سکتا ہے۔ اور اس کا کیا مقام ہو سکتا ہے؟ یہ لمحہ فکریہ ہے کیونکہ فی زمانہ ادب کا مفہوم ہی بدلنے لگا ہے۔ ادب جسے خیالات میں ارتقاء، بلندی، احساسات میں گداز اور جذبات میں شدت پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، جو انسانی فطرت اور اس کی پیچیدگیوں کے راز منکشف کرنے اور ریت کے ذرے میں سورج اور قطرے میں سمندر دکھانے کا علمبردار تھا، آج انگشت بدنداں ہے کیونکہ اسے آج جن مسائل کا سامنا ہے وہ اس سے قبل اتنے گھمبیر نہ تھے۔ اور یہ مسئلہ جتنا گھمبیر ہے اتنا ہی ناقابل فہم ہے۔

ہر چیز میں کمرشلزم نے اس دور کے تقاضوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے گلیمر اور کمرشلزم نے اس دور کے ادیب سے آزادی خیالات کو چھین لیا ہے کیونکہ ایک ادیب سے پبلشرز مخصوص قسم کی تحریروں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بھاری بھرکم موضوعات کی بجائے ہلکی پھلکی تحریریں، استعاراتی تحریروں کی بجائے عام، سادہ فہم، رومانوی موضوعات اور ادبی زبان کی بجائے اردو انگریزی زبان کے اختلاط سے جنم لینے والی ماڈرن لینگویج کا جب ادیب سے مطالبہ کیا جائے گا تو اس کے ادبی رویوں ذہنی رجحانات کو زک پہنچے گی اور وہ خود ہی ذہنی طور پر بے چینی اور بے قراری محسوس کرنے لگا۔ اس طرح کی اضطراری کیفیت میں کس طرح کا ادب تخلیق ہوگا، ایسے دور میں ادب کا مقام کیا رہ جاتا ہے؟ اور ادیب کہاں کھڑا نظر آتا ہے.........؟

اگر آج کی دنیا یہ محسوس کرتی ہے کہ ادب کو صرف سلیبس تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیے اور عملی زندگی میں بھی اس کا مظاہرہ ہونا چاہیے اور آج کے انسان کی اندرونی کیفیات اور ان کی تسکین کا ذریعہ ادب سے ہونا چاہیے تو اس کے لیے سازگار ماحول ترتیب دینے کی ضرورت ہے، اور یہ ماحول حکومتی سرپرستی کے بغیر قطعی ممکن نہیں۔ الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا تب تک اتنے موثر تھے جب تک حکومت نے ان کو مکمل خود مختاری و آزادی نہ دی اور ان کی سرپرستی کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر طرف میڈیا کا راج نظر آتا ہے اگر آج حکومت ادب و ادیب کی اہمیت کو سمجھتی ہے تو اس کو اس کی سرپرستی بھی کرنا ہوگی جس سے عوام میں شعور بیدار ہوگا۔ گزشتہ صدی میں جس طرح شہری سطح پر مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا اور جن کی جگہ آج کل کنسرٹس نے لے لی ہے اور شعراء کی بجائے "پاپ سنگرز" ہر جگہ جانے جاتے ہیں کیونکہ حکومتی و عوامی سطح پر ان کی بھرپور پذیرائی ہوتی ہے، جب اس پذیرائی کا کچھ حصہ ادباء و شعرا کرام کو ملے گا تو یقینی طور پر ادب کے لیے سازگار اور مثبت ماحول پیدا ہوگا۔

نیز منفی ادبی رویوں سے بھی ادب کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ازالہ ہونا چاہیے اور ادب کی حیثیت کو منوانے کے لیے

ایک سنجیدہ مشترکہ کوشش ہونی چاہیے۔ اس کی مثال تو ایسے ہے کہ ایک انسان جو زندگی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ نہیں لیتا اور اپنی زندگی کو لہو کے بیل کی مانند گزارتا ہے بالآخر تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے، بہ نسبت اس انسان کے جو زندگی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیتا ہے اور اپنی زندگی کو کامیابی سے گزارنے کے لیے نئے نئے حربے آزماتا ہے اور نئی نئی ٹیکنیکس کا سہارا لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح ادب کے ٹمٹماتے دیے کی لو کو از سر نو جلا بخشنے کے لیے مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب نے بھی بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ اپنے آپ کو بدلا۔ دو صدیاں پہلے استعمال ہونے والا اسلوب بیان، تشبیہات، استعارے، موضوعات اور ادبی روایات اس انداز تحریر سے قدرے مختلف ہیں جو گزشتہ صدی میں استعمال ہوئیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جب ہر شے میں تغیر و تبدل جزو لازم ہے تو آج کے ادیب کو بھی وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ ادب تخلیق کرنا چاہیے، اسے بھی سوچ کے دھاروں کو آجکل کی ضرورت کے مطابق تشکیل دینا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس طرف قاری کی سوچ جارہی ہے ادیب بھی اپنی سوچ کو اس طرف منتقل کردے بلکہ اپنی منفرد سوچ کو قاری کی سوچ کے قالب میں ڈھال کر اس طرح پیش کرے کہ قاری اور ادیب کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور اس ضمن میں اگر ادیب کوئی نئی شے تخلیق کرتا ہے تو اسے ٹی ایس ایلیٹ کے بیچ سٹون متعصفہ جیسے پیمانے پر جانچ کر اسے مسترد نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ادبی معیار کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس نئی سوچ کو قابل قبول بنانا چاہیے کیونکہ آج کے قاری کا یہی مطالبہ ہے کہ اس کی سوچ سے ہم آہنگ ادب تخلیق کیا جائے۔

آج بھی خوبصورت، قابل فہم ادبی نگارشات کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج بھی ایک اچھے جینوئن ادیب کا معاشرہ میں قابل احترام مقام ہے اور آج بھی اچھے، پختہ اور باشعور ذہن ادب کو سراہتے ہیں۔ گو کہ آج وہ بھرپور پذیرائی نہیں مل رہی ہے جو آج سے کچھ صدیاں پہلے تھی مگر پھر بھی ادب اور ادیب کا اپنا مخصوص مقام ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مقام و حیثیت کو منوایا جائے اور یہ مقام قاری کا کتاب سے رشتہ استوار کرنے سے بحال ہوسکتا ہے اور معاشرے میں انہی قدروں کو فروغ دینے سے حاصل ہوسکتا ہے جو ماضی میں ہماری روایات کا حصہ رہی ہیں جیسا کہ افلاطون اپنی کتاب Republic میں تبصرہ کرتا ہے کہ ''بچوں کی تعلیم میں لائی جانے والی تمام کہانیوں کو ارفع اخلاقی مقاصد اور نقطہ ہائے نظر کا حامل ہونا چاہیے تاکہ ان کے ذہنوں میں اچھے اور مثبت خیالات پختہ ہوسکیں۔'' اگرچہ آجکل کے زمانے کے بدلتے ہوئے ماحول کے مطابق ماؤں اور نانیوں دادیوں کی کہانیاں، بچوں کے لیے ایک مضحکہ خیز خیال ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جبکہ اس بات میں آج بھی صداقت ہے کہ بچے ان کہانیوں کو آج بھی دلچسپی سے سنتے ہیں اور یہ فطرت کا خاصہ ہے جو قدرت نے انسان کو عطیہ کیا ہے کہ لاحاصل شے کی تمنا اور جستجو ہر انسان کے اندر موجزن ہے، جیسے چاند پر رہنے والی پریوں کو دیکھنے کی تمنا، اور اس پر رہنے والی بڑھیا کا چہرہ۔ سننے والے ذہن اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں جو ان کی دنیا سے قدرے مختلف ہوتی ہے تو پھر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسان کا باطن تو وہی ہے، سرشت بھی وہی ہے، بس فکری تقاضے بدل گئے ہیں اور فکری تقاضوں کے بدلنے سے پورا ماحول تو نہیں بدلا جاسکتا۔ بلکہ فکر کو ماحول سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک نئی جہت کو ترتیب دینے کی ضرورت ہے جو تینوں زاویوں کو درست رکھ سکے یعنی سوچ، تخیل اور تجربہ۔ ایک مثبت سوچ کا حامل شخص ایک خوبصورت تخیلاتی دنیا تخلیق کرتا ہے اور اس کا عملی تجربہ ان دونوں عناصر کا نتیجہ ہوتا ہے، اس ضمن میں سقراط کے الفاظ قابل فہم ہیں۔

"ہر کام کا آغاز بے حد اہمیت کا حامل ہے، کم عمر اور نازک طبع اذہان ہر طرح کے تاثرات جلد قبول کر لیتے ہیں اور کئی ہم بے احتیاطی سے کام لیتے ہوئے غیر ذمہ دارانہ افراد کی رطب و یابس سننے کے لیے انہیں چھوڑ سکتے ہیں تاکہ ان کے دماغوں میں ان خیالات سے برعکس ایسے خیالات جڑ پکڑ جائیں جو ہم بلوغت کے بعد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ماؤں اور اماؤں کو ایسی کہانیاں اپنے بچوں کو سنانی چاہیں جس سے وہ بچوں کے ذہنوں کو مخصوص سانچوں میں ڈھال سکیں آج کل کی مروجہ داستانوں میں سے اکثر کے ترک کر دینے میں ہی بہتری ہے (اس نے اساطیری Mythological، اور ہومر کی منظومات کو ناپسند قرار دیا)۔

اس بات میں کافی سچائی ہے کہ مستقبل کے بارے میں پیشن گوئی کرنے سے پہلے موجودہ نسل کے ذہنی و فکری زاویوں کو جانچنا پڑتا ہے تب حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ آج کل ادب جس انحطاط کا شکار ہے وہ یقینی طور پر گذشتہ نسل کی عدم سرپرستی کا نتیجہ ہے اور جن گھروں میں ادبی ماحول پروان چڑھتا ہے ایسے خاندانوں میں تازہ فکر نئی نسل جنم لیتی ہے جو معاشرے کی تقدیر سنوارنے میں اہم کردار کرتی ہے۔

اگر آج حکومت معاشرے کو ادب و ادیب کی افادیت باور کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اعلیٰ نگارشات کا حامل ادب آج بھی تخلیق کیا جا سکتا ہے اگر آج بھی ادبی فضا فروغ پاتی ہے تو فکری زاویے درست ہو سکتے ہیں۔ نشیب و فراز جہاں زندگی کا حصہ ہیں وہاں ادب میں ان کا موجود ہونا حیرانگی کی بات نہیں۔ حیرانگی کی بات تب ہے جب اس کی سربلندی کے لیے سنجیدہ کوشش نہ کی جائے اور اس کی مناسب سرپرستی نہ کی جائے۔ معاشرہ اور ادیب اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر کے ادب کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلا سکتے ہیں، جس کی اس بدلتی ہوئی دنیا کو اشد ضرورت ہے۔

•

محمد اظہار الحق

عنوان میں دو الفاظ کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ ایک دنیا اور دوسرا ادب۔ پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ نیا دنیا سے مراد وہ کنواں ہے جسے ہم پاکستان کہتے ہیں یا وہ دنیا ہے جو ملکوں اور اقوام پر مشتمل ہے۔ اسی طرح کیا ادب سے مراد صرف پاکستانی ادب ہے یا ہم نے ادب کو وطنیت، مذہب اور اس قسم کی دیگر قیود سے آزاد رکھ کر اس کے کردار کا جائزہ لینا ہے۔ دو وجوہ کی بنا پر ہم دنیا کو پوری دنیا سے مماثل رکھنے پر اور ادب کو عالمی ادب کے مترادف سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اول اس لئے کہ بدلتی ہوئی دنیا میں ہمارے اپنے یعنی پاکستانی ادب کا کردار کوئی خاص قابل رشک نہیں (اس کی تفصیل آگے آئے گی) اور دوم اس لئے کہ کوئی بھی قوم اور اس کا ادب کبھی بھی اطراف عالم سے بے نیاز اور غیر اثر پذیر نہیں رہے۔ چہ جائیکہ آج کے عصر میں جب Globalization ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔

بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا ادب بدلتی ہوئی دنیا میں کوئی کردار ادا کر سکا ہے؟ قیام پاکستان سے لے کر اب تک ہمارے ہاں جو جو سیاسی اور سماجی پیش منظر رہا ہے اور جس طرح اس پیش منظر نے ہماری اقتصادیات کو روز افزوں تنزل سے دوچار کیا ہے کیا ہمارا ادب اس کا احاطہ کرتا رہا ہے؟ یہ جو اقتصادیات کے روز افزوں تنزل کا ذکر کیا گیا ہے تو اس میں کوئی اچنبھا نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ اعداد و شمار کے گورکھ دھندے سے ہر دور میں اقتصادیات کی خوبصورت تصویر کشی کی جاتی رہی ہے لیکن جو معاشی پراگندگی زیریں طبقات میں ہے اور رہی ہے اور مڈل کلاس جس طرح ختم ہونے کے قریب آ گئی ہے اس سے معیشت کا مدقوق چہرہ اعداد و شمار کی سرخی پوڈر کے باوصف عیاں ہے۔ یوں بھی پاکستانیوں کو ہمیشہ Growth کے جال میں پھانسا گیا جب کہ صحیح اقتصادی پیرومیٹر Growth سے نہیں بلکہ Development سے عبارت ہوتا ہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی نکتہ سامنے آ گیا تھا۔ ہم اصل سوال کی طرف لوٹتے ہیں کہ کیا ہمارا ادب ہماری بدلتی ہوئی صورت حال کے ساتھ چل سکا ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس ضمن میں اطراف و اکناف میں کیا ہوا ہے اور کیا ہوتا رہا ہے۔ اختصار کو بروئے کار لاتے ہوئے صرف تین حوالوں سے عالمی ادب کے کردار کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ تین حوالے اس لئے چنے گئے ہیں کہ ان کی روشنی میں ہم یا تو اپنی صورت حال کا تجزیہ کر سکتے ہیں یا ان سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اولاً افریقی Diaspora کے حوالے سے، ثانیاً بعد از استعماری صورت حال کے حوالے سے اور ثالثاً چین میں بدلتی ہوئی سیاسیات کے حوالے سے۔

افریقی Diaspora لغوی طور پر یہودیوں کی اس منتشری کو کہتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح بابلی جلاوطنی کے بعد فلسطین

سے باہر کے علاقوں میں ہوئی۔ اصطلاحی طور پر Diaspora سے مراد وہ گروہ ہوتے ہیں جو اپنے وطن سے باہر رہ رہے ہوں لیکن اپنا ثقافتی تشخص قائم رکھے ہوئے ہوں۔ Diaspora کا قصہ یہ ہے کہ شمالی امریکہ کی نوآبادیوں میں افریقی حبشیوں کی درآمد کا پس منظر سب جانتے ہیں۔ Alex Hailey نے اپنے شہرۂ آفاق ناول Roots میں یہ ساری کہانی بیان کی ہے۔ اس کے بعد کئی سو سالوں پر پھیلی ہوئی جدوجہد کی داستان بھی ہم سب جانتے ہیں جس میں امریکہ کی سول وار سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ گذشتہ صدی کے اواخر تک امریکہ میں بسنے والے افریقی اپنی سماجی حیثیت کو منطقی انجام تک پہنچا چکے تھے اور جب یہ مقام خدا خدا کر کے حاصل ہوا تو ادب اس سے کس طرح اغماض برت سکتا تھا۔ نوے کی دہائی میں صرف ہسپانیہ میں تین عالمی کانفرنسیں امریکی افریقی ادب پر منعقد ہوئیں جن میں سے تیسری کانفرنس 1996ء میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر افریقی Diaspora کے ادب پر ایک سمپوزیم بھی منعقد ہوا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکی افریقیوں کا ادب عالمی ادب کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے۔

اس ادب کے تجزیہ میں دو مختلف گروہ نمایاں طور پر سامنے آئے ہیں۔ ایک کا موقف یہ ہے کہ جس طرح سیاہ فام امریکی ادیب بالخصوص خواتین افریقہ کو ثقافتی مرکز کے طور پر بیان کر رہی ہیں، وہ محلِ نظر ہے۔ کیونکہ انہیں اصل افریقی ثقافت کا تجربہ ہی نہیں۔ اس ضمن میں Nikki Giovanni, Paule Marshall, Gloria Naylor اور Toni Marrison جیسے معروف سیاہ فام ادیبوں پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ انہوں نے نہ صرف اپنے تخلیقی مقاصد کے لئے افریقہ کا استحصال کیا بلکہ اپنے افریقی اور امریکی اجداد کے درمیان ذاتی شناختوں کی خلیج پاٹنے کے گناہ کا ارتکاب بھی کیا اور اس جدوجہد میں انہوں نے افریقی شناخت کو داغ دار کیا۔ افریقہ کی منفرد ثقافتی روایت کی توہین کی اور افریقہ کی دستکاریوں کو اپنے چھوٹے تخلیقی آرٹ میں سمونے کی کوشش کی۔ ان ادیبوں پر یہ اعتراض بھی شدت سے کیا گیا کہ انہوں نے افریقہ کو جاننے اور سمجھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور یہ جو افریقہ کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کا فقدان ہے، دوسرے لفظوں میں افریقہ سے جہالت، یہ گناہ ان ادیبوں کے گناہوں میں سرفہرست ہے۔ ان پر دوسرے گناہوں کا الزام بھی ہے مثلاً ایک اور بڑا گناہ جو افریقہ کے ساتھ کیا گیا یہ ہے کہ ہر افریقی ملک کی الگ شناخت ہے اور الگ ثقافت ہے لیکن امریکہ کے سیاہ فام ادیبوں نے ان سب کو ایک اکائی شمار کیا اور اپنے ادب میں وحدت کے طور پر سمو دیا۔ حالانکہ اس اکائی، اس وحدت کا وجود ہی نہیں۔ ان ادیبوں پر نخوت، تکبر اور خود بینی کا الزام بھی لگایا گیا۔ انہوں نے امریکہ کے سفید فام ادیبوں کو یہ کہا کہ ہم سیاہ فام ہیں افریقہ ہمارا ہے اور افریقی ادیبوں سے یہ کہا کہ ہم امریکی ہیں اس لئے افریقہ کے تعبیری حوالوں، ادبی استعاروں اور علامات پر ہمارا حق فائق ہے اور یوں انہوں نے ادب میں اس طرح بڑے بھائی کا کردار ادا کیا جس طرح امریکہ دوسرے شعبوں میں قوموں کی برادری کے ساتھ کر رہا ہے!

لیکن ادیبوں اور نقادوں کا ایک اور بڑا گروہ اس سارے موقف سے اختلاف کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ گناہ جیسی اصطلاحات کا تعلق تو مذہب سے ہے۔ ان کا بے محابا استعمال ادب میں جائز ہی نہیں۔ یہاں تو زیادہ سے زیادہ تنقیدی آرا میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس گروہ کا موقف یہ ہے کہ امریکہ کے افریقی ادیبوں کے پاس اتنی طاقت کہاں سے آ گئی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لئے افریقہ کو ایک بار پھر کالونی بنالیں! نہ ہی انہوں نے افریقہ کی امیجری سے کوئی مالی فائدہ اٹھایا ہے۔ افریقہ کا استحصال بے چارے ادیبوں نے کیا کرنا ہے۔ یہ کام تو ملٹی نیشنل کارپوریشنیں کر رہی ہیں، جو افریقہ کے لئے بہت بڑا

رکھتے ہیں۔ جہاں تک یہ الزام ہے کہ افریقہ کی مختلف النوع اور بوقلموں ثقافتی شناختوں کو ایک وحدت کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے تو اصل صورت حال یہ ہے کہ افریقہ کا براعظم اتنا وسیع و عریض ہے کہ اس کے ایک حصے میں بسنے والے افریقی اس کے دوسرے حصے میں بسنے والے بھائیوں کی زبان ثقافت اور تہذیب سے ناواقف اور بے بہرہ ہیں اور انہیں افریقیوں کے باہمی فرق سے آگاہی ہی نہیں، تو جب خود افریقیوں کو اس تنوع کا علم نہیں تو امریکہ میں رہنے والے افریقی ادیبوں اور نقادوں سے اس کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے؟

افریقی Diaspora کے لٹریچر کے چوادر پہلو بھی ہیں جو ان دنوں زیر بحث ہیں۔ مثلاً امریکہ کے بلیک معاشرے میں مرد کا ثقافتی اور سیاسی غلبہ۔ اس لٹریچر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ جزائر غرب الہند، لاطینی امریکہ اور یورپ میں تخلیق کئے جانے والے افریقی ادب کی کثیرالنوعیت اور بین الثقافتی رشتوں پر مسلسل مذاکرات سمپوزیم اور بحثیں ہو رہی ہیں۔ سیاہ فام لوگوں کے ساتھ جو سلوک امریکہ میں ہوا اس کی جو مماثلت جنوبی افریقہ میں روا رکھے گئے ظلم کے ساتھ ہے اس کے متعلق باقاعدہ بلیک تھیٹر موومنٹ چلی ہے۔

زیر بحث موضوع کے حوالے سے ایک اور اہم مسئلہ Post-Colonial لٹریچر کا ہے۔ ایک طرف تو ارن دھتی رائے جیسی مصنفہ عالمی ادب پر چھائی ہوئی ہے، دوسری طرف دنیا کی کوئی ایسی بڑی اور قابل ذکر یونیورسٹی نہیں جہاں پوسٹ کالونیل لٹریچر بطور مضمون نہیں پڑھایا جا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ اصطلاح بذات خود متنازعہ ہے۔ یوں بھی ہر پوسٹ کالونیل ملک کا ادیب ہونا ضروری نہیں۔ پوسٹ کالونیل نظریہ سیاسیات، تاریخ اور تمام دیگر متعلقہ علوم میں در آیا ہے۔ مختصراً پوسٹ کالونیل لٹریچر سے مراد وہ ادب ہے جو سابقہ کالونیوں میں بسنے والے ادیب تخلیق کر رہے ہیں لیکن اس تعریف کو صحیح مان لیا جائے تو کچھ مشکلات راستے میں آتی ہیں۔ مثلاً سب سے پہلی مشکل یہ ہے کہ کیا نوآبادیاتی نظام میں وہ استعمار بھی شامل ہے جو فی نفسہ سیاسی نہیں اور صرف ثقافتی اور نظریاتی ہے؟ ساٹھ کی دہائی کے مفکرین نے نیو امپیریلزم کی اصطلاح وضع کی۔ اس وقت اس سے مراد وہ غلبہ تھا جو امریکہ، لاطینی امریکہ کی ریاستوں پر حاصل کر رہا تھا۔ معاشی لحاظ سے اپنے مغلوب ملکوں کے لئے ہی بنانا ری پبلک کی اصطلاح وجود میں آئی۔ دوسرے لفظوں میں پوسٹ کالونیل کی اصطلاح ہی غلط ٹھہری کیوں کہ کالونیل ازم ابھی گیا ہی کہاں ہے۔ یہ درست ہے کہ تکنیکی لحاظ سے مغربی استعمار نے بوریا بستر اٹھایا اور چل دیا لیکن ثقافتی اور معاشی استعمار تو جوں کا توں ہے، بلکہ نیو کالونیل ازم نئی اور لباسوں میں ملبوس پھر سے آ گیا۔ وسط ایشیائی ریاستوں میں یہی ہوا ہے۔

دوسری مشکل اس تعریف میں یہ ہے کہ یہ تعریف فرض کر لیتی ہے کہ ان ملکوں کے لئے استعمار کا تجربہ اہم ترین تجربہ تھا۔ حالانکہ برصغیر کے ممالک میں استعمار سے پہلے کا بھی بہت لٹریچر ہے۔ تیسرا تضاد اس میں یہ در آیا ہے کہ پوسٹ کالونیل دور میں بہت سے ادیبوں نے استعمار کو ہدف بنانے کے بجائے مقامی آمروں اور بدعنوان حاکموں کو موضوع بنایا۔ چنانچہ تکنیکی طور پر ایسا ادب اس تعریف میں سماتا نہیں۔ مثلاً نائجیریا کے ادیبوں Chinua Achebe اور Wole Soyinke نے بالکل یہی رویہ اختیار کیا۔ یہ الگ بات کہ ان کے نقادوں نے مقامی آمروں کی بدعنوانی کا ذمہ دار بھی گذرے ہوئے استعمار ہی کو ٹھہرایا۔ بھارت اور پاکستان کے جھگڑوں کا باعث بھی برطانوی استعمار کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ افریقہ میں پوسٹ کالونیل ادب میں ایک جھگڑا یہ بھی چل رہا ہے کہ اگرچہ کچھ ادیب عہد غلامی کی تلافی کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن بہت سے ادیب یہ بھی کہتے ہیں کہ ماضی کے

مسائل میں الجھ کر حال کو نہیں سلجھایا جا سکتا۔

لیکن پوسٹ کالونیل لٹریچر پر مغرب نے استعمارانہ نکتۂ نظر بھی اپنایا ہے۔ مثلاً کبھی اہل مغرب نے یہ کہا کہ اشاعت، اشتہار اور چھاپہ خانے سب اوزار استعمار نے دیے ہیں تو مقامی ادیب انہیں کیوں بروئے کار لا رہے ہیں۔ کبھی یہ کہا گیا کہ استعمار سے پہلے ان ملکوں کے پاس ادب تھا ہی نہیں۔ کبھی یہ کہا گیا کہ اصل ادب وہی ہے جو استعمار کی زبان میں لکھا جائے۔ ان اور بہت سے دوسرے اعتراضات کا نتیجہ Hybridty یعنی اختلاط کے نظریے کی صورت میں نکلا۔ یعنی استعمار اور محکوم ثقافتوں اور قدروں کی آمیزش لیکن اس نظریے نے ایک اور سوال کو جنم دیا کہ کیا ثقافتی آمیزش کا کام محکوم ہی کرے گا؟ یا استعمار بھی یہ کام کرے گا۔ اس کا دلچسپ ترین تجربہ برصغیر میں کیا گیا۔ 1800ء تک یعنی لارڈ ویلز لے کے آنے تک برصغیر میں انگریز مقامی ثقافت کو بہت حد تک مثبت طریقے سے اپنا رہے تھے۔ لکھنو اور حیدرآباد میں انگریز نمایندے ہندوستانی لباس پہنتے تھے۔ اردو اور فارسی بولتے لکھتے تھے۔ حقہ پیتے تھے اور مقامی خواتین سے شادیاں کرتے تھے۔ ایسے تمام انگریز White Mughals کہلاتے تھے لیکن ویلز لے نے اپنی انتہاپسندی سے یہ دروازہ بند کر دیا اور اس کے بعد Hypridity یعنی اختلاط کا سارا بوجھ مقامی ہندوستانیوں پر آ پڑا جو آج تک جاری و ساری ہے۔

اب بہت ہی مختصر ذکر چینی ادب کے بارے میں۔ چینی ادب حقیقت کی ترجمانی میں ہمیشہ قیادت کا کردار ادا کرتا آیا ہے اور تنقیدی حقیقت پسندی کی یہ روایت مشکلات کے باوجود قائم و دائم ہے۔ چینی ادیب اپنے آپ کو دانشور سمجھتا ہے اور معاشرہ بھی اسے اسی مقام پر فائز گردانتا ہے۔ چنانچہ دانشور ہونے کے حوالے سے چینی ادیب معاشرے پر اثرانداز ہونا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ بعد از ماؤ زمانے میں بھی یہ تنقیدی حقیقت پسندی بدرجہ اتم بروئے کار لائی گئی اور ماضی قریب میں روا رکھی گئی ناانصافیوں کا کھل کر تذکرہ کیا گیا۔ دس سال تک ادیبوں کو جس طرح ہراساں کیا گیا اس کا ذکر آج کے چینی ادیب فکشن، شاعری، ڈرامے اور تنقید میں کر رہے ہیں۔ Peng Ruigoo کا علامتی افسانہ "ماؤ بھائی قصاب بن گئے" چینی ادب میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح Ye xin نے جس نے ثقافتی انقلاب کے دس سال دور افتادہ پہاڑوں میں بیگار میں گذارے، اس زمانے کے بارے میں کئی افسانے لکھے۔ شنگھائی جس طرح ایک جدید شہر بن گیا ہے اور صنعتی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی وجہ سے جو معاشرتی مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کے بارے میں لکھے گئے ادب کے کئی مجموعے الگ سے شائع کئے گئے ہیں۔

ہم عصر دنیا میں اور ہم عصر زمانے میں ادب کے حوالے سے ہم کہاں کھڑے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا آسان نہیں کیوں کہ راستے میں حوصلہ شکنی کی رکاوٹیں جگہ جگہ کھڑی ہیں۔ ایک حقیقت تو بالکل سامنے نظر آ رہی ہے کہ جنوبی ایشیا میں پاکستان کی شرح خواندگی تمام قابل ذکر ملکوں سے نسبت کم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آئے دن بدلتی ہوئی حکومتیں جھوٹے ہوئے اعداد و شمار شائع کرتی رہتی ہیں۔ اب جہاں خواندگی کا تناسب ہی ناقابل رشک ہوگا وہاں تعلیم کا تناسب کیا ہوگا اور ادب پڑھنے والے اور تخلیق کرنے والے کتنے ہوں گے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ آتا ہے کہ آج جو مسائل درپیش ہیں ادب ان کا احاطہ کر رہا ہے یا نہیں اور اگر کر رہا ہے تو کس درجے پر اور کس حد تک کر رہا ہے۔ پہلا ایشو یہ ہے کہ آج پاکستانی Diaspora ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا فیملی یونٹ ہو جس کا کوئی نہ کوئی رکن ملک سے باہر آباد نہ ہو۔ شمالی امریکہ، برطانیہ، سکینڈی نیویا، مشرق اوسط، مشرق بعید، پاکستانی Diaspora کے گروہوں کے گروہ ان خطوں میں آباد ہیں۔ کیا ملک کے اندر تخلیق کیا جانے

والا ادب ایک تحریک کے طور پر اس Diaspora کے مسائل کا احاطہ کر سکا ہے؟ پس ماندگان کی جذباتی شکست و ریخت کہاں تک ادب میں در آسکی ہے؟ پھر اس Diaspora کا تخلیق کردہ ادب کتنے پانی میں ہے، کیا اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ Diaspora کے چند افراد ادبی جشن یا محفلوں پر منعقد کئے گئے مشاعروں کا جو اہتمام کرتے ہیں اس کا ادب کی کسی تحریک سے کوئی واسطہ نہیں اور ان تفریحات Entertainments پر جتنی کم گفتگو کی جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ ہم نے سطور بالا میں بتایا کہ صرف ہسپانیہ میں افریقی Diaspora پر کئی بین الاقوامی کانفرنسیں اور سیمپوزیم منعقد کئے جا چکے ہیں۔ سوء اتفاق سے پاکستانی Diaspora کے ادب پر اس کے بارے میں تخلیق کئے جانے والے ادب پر کبھی کوئی کانفرنس یا سیمپوزیم منعقد نہیں ہوا۔

اقتصادی، سیاسی اور سماجی حوالے سے آج کا جو پیش منظر ہے۔ ہمارا ادب اس ضمن کہاں کھڑا ہے؟ یہاں یہ حوالہ دینا شاید مناسب نہ ہو اور اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ شہرۂ آفاق برطانوی ناول نگار Jonathan Swift طنز کے ہتھیار کو ناول میں استعمال کرتا ہی تھا، اس نے عوام میں تقسیم کرنے کے لئے پمفلٹ بھی لکھے۔ اس لئے اگر کوئی یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اقتصادی سیاسی اور سماجی مسائل ادیب کے دائرہ فکر اور دائرہ بیان سے باہر ہیں تو اسے نرم سے نرم الفاظ میں حاطب اللیل ہی کہا جا سکتا ہے

آج پاکستان میں ملکیت زمین کا ڈھانچہ تاریخ کے قدیم ترین خطوط پر ہے اور غالباً لاطینی امریکہ اور افریقہ کی بنانا ری پبلکوں کے بعد قدامت میں سرفہرست ہے جبکہ پڑوس کے ملک بھارت میں مدتوں سے پہلے زرعی خاندان کی حد فی خاندان مقرر کر دی گئی تھی۔ مثلاً بھارتی پنجاب میں یہ حد صرف 24 ایکڑ ہے۔ بلوچستان میں سرداری نظام Fiefdom بلکہ Serfdom کی صورت میں قائم ہے۔ سیاسی قیادتیں وراثت کی صورت میں منتقل ہو رہی ہیں۔ تعلیم کی صورت حال یہ ہے کہ غالباً یہ واحد ریاست ہے جہاں تین سے زیادہ نظام ہائے تعلیم بیک وقت رائج ہیں اور ماضی قریب میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ صرف ایک صوبے پنجاب میں نوے فیصد سرکاری سکول یا قاعدہ عمارتوں کے بغیر ہیں، یا عمارتیں چھتوں کے بغیر ہیں مختلف اور متحارب نظام ہائے تعلیم سیڑھی کے طور پر استعمال ہو کر طبقاتی نظام کی تسلسل اور استحکام کا باعث بن رہے ہیں۔ اور افق پر روشنی کے آثار کہیں بھی نہیں ہیں۔ اسلام کے نام پر دس سالہ اقتدار نے قومی اداروں کا تار و پود جس طرح بکھیرا اس کی تلافی تا حال نہیں ہو سکی۔

کیا ہمارا ادیب ان مسائل سے آگاہ ہے اور اگر ہے تو وہ کیا کردار ادا کر رہا ہے؟ اس سوال کا جواب ادب کے کارکنان قضا و قدر ہی سے پوچھا جا سکتا ہے!!

زینت ثناء

دنیا میں جب بھی ادب کے بڑے بڑے دوز وجود میں آئے تو سماجی قوتوں اور تہذیبی عوامل کے ساتھ ساتھ ادب پڑھنے اور اس میں گہری دلچسپی لینے والے قارئین ہمیشہ شریک رہے ہیں۔

اگر ادب اپنے دور کے مزاج اور اس کی روح کا اظہار کرے تو اس اعتبار سے وہ ادب نہیں صرف جھوٹے جذبات اور مصنوعی تجربات پر ادب کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ ادب اگر زندگی کے اظہار کا نام ہے تو زندگی کو نیا شعور دینا اس کے نئے انداز مرتب کرنا، زندگی کو سہارا دینا اسے بنانا سنوارنا ادب کا کام ہے۔

آج کی جدید زندگی میں سائنس پر غیر معمولی زور ہے۔ سائنس نے اشیاء کو تو ہمارے شعور میں داخل کر دیا ہے لیکن فکر و احساس کو زندگی سے نکال باہر کیا ہے۔ اسی وجہ سے آج ساری دنیا ایک ہولناک عدم توازن کا شکار ہے۔ زندگی ساری ترقیوں اور حیرت ناک ایجادات وانکشافات کے باوجود، بے معنویت کا شکار ہے اور توازن سے عاری ہوگئی ہے اس لئے ساری دنیا اس وقت ایک ایسے نظام خیال اور تصور حقیقت کی تلاش میں ہے جس سے انسان اپنے وجود کو بامعنی بنا سکے۔ یہ کام ادب کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ (حوالہ صفحہ نمبر 18)

حقیقت سے زیادہ حقیقت کا کھوج، اپنی اصل زندگی کا کھوج، زندگی کے معنی تلاش کرنا، ادب کا کام ہے۔ ادب نے انسان کو فکر دی، کہ آج وہ بلوغت میں پہنچا ہے۔ ادب کی تخلیق میں ادیب کا اظہار آزاد ہوتا ہے۔

جب ادیب چپ ہو جاتے ہیں تو معاشرہ بے راہ رو ہو جاتا ہے اور جب وہ معاشرے سے بے تعلق ہو جاتے ہیں تو ان کی تخلیقات یا تو بے ڈھنگی ہو جاتی ہیں یا بے روح۔

ادیب اس بات سے بے خبر ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ ہمارے ادب کو ایسے ادیبوں کی ضرورت ہے جو اپنے تجربات سے سچائی کے ساتھ آنکھیں ملانے کی سکت رکھتے ہوں۔ حقیقت سے زیادہ حقیقت کو سامنے لائیں۔ انہیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ جو کچھ کہیں ایمانداری اور سنجیدگی سے کہیں۔ ادب اور فن کو مصلحتوں کا غلام نہ بنائیں۔ بدلتی دنیا میں اب نئی قومی ضرورت اور نئے تقاضوں کے تحت ایسا ادب پیدا ہو جو ہماری تہذیب وطرز زندگی کی نمائندگی کرے۔ بین الاقوامی تہذیب کے نام لیوا نہ بنیں۔ اگر ایک مضمون، مقالہ، افسانہ، ناول یا نظم اپنی زبان میں لکھی جائے جو کہ اپنے ادب کی صحیح روایت کے ساتھ ہی اپنے طرز زندگی سے بالکل بے تعلق ہو اور وہ بین الاقوامی تہذیب میں اضافہ ہو جو کہ ہماری تہذیب وطرز

زندگی کو چھو کر بھی نہ گذرے، تو ایسے ادب کا کیا فائدہ۔

ادیب کے نظریات کچھ بھی ہوں مگر ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کی ساری سابقہ روایات ہماری وہ بنیادیں ہیں جن کی طرف ہماری فکر کو رجوع کرنا چاہیے۔ ادیب کو اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی روح میں چھپے ہوئے جذبات کو پہچانیں اور ان کی شناخت کریں۔ بے خبری ادب کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

سجاد باقر رضوی کہتے ہیں "ادب میں ماضی و مستقبل حال کی زبان بولتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یا تو ہم ماضی میں رہتے ہیں یا مستقبل میں اور جب حال میں آتے ہیں تو ماضی اور مستقبل سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ادیب کو ماضی و حال اور مستقبل کا شعور بیک وقت ہونا چاہیے۔ معاشرے سے اس کا تعلق دوگونہ ہو جائے گا۔ ا۔ بحیثیت تخلیقی انسان، ۲۔ بحیثیت عام انسان" (حوالہ صفحہ نمبر 39)

اس معاشرے میں اس دوگونہ تعلق والے انسان نے اپنی ذمہ داریاں کس حد تک پوری کی ہیں کیونکہ بیک وقت وہ اس معاشرے کا شہری بھی ہے اور تخلیق کار ادیب بھی ہے۔ معاشرے میں ایک شہری کی حیثیت سے وہ سب سے پہلے اپنے اردگرد کے واقعات اور حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ادیب کی حیثیت سے متاثر ہونے کے بعد وہ غور وفکر کرتا ہے۔ اس سے نتائج اخذ کر کے پھر اپنے اپنے طریقہ سے ان حقائق کی حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی تشریح کرتا ہے۔ جو کچھ بھی لکھا جائے وہ انسانی حوالوں اور رابطوں سے بے تعلق اور انہیں نظرانداز کر کے نہ لکھا جائے بلکہ ادب میں ایسے رجحانات ہی پیدا نہ کئے جائیں جو کہ انسانی حوالوں اور رابطوں کی موت بن جائیں۔ ادیب اور شاعران رابطوں اور حوالوں کو استعاروں اور علامتوں کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

"جب ادیب اور شاعر زندگی کے حوالے سے دنیا کو دیکھتا ہے اس کا اندازِ نظر کچھ ہو، مگر وہ ایک بصیرت اور ایک نیا تناظر پیدا کرتا ہے۔ شاعر ادیب دنیا کو صوری اور ظاہری سطح پر دیکھتا ہے۔ چاہے وہ انسان کے معاشرتی عوامل ہوں یا فطرت کے مظاہر ہوں وہ انہیں خاص ترتیب، خاص رنگ اور خاص آہنگ میں دیکھ کر زندگی کو ایک نئی سطح اور ایک نیا انداز دیتا ہے۔" (حوالہ صفحہ نمبر 45)

ہم جس دور میں جی رہے ہیں یہ تاریخ کا ایک ایسا دور ہے جس میں ہر طرف افراتفری، دہشت گردی، جنگ وجدل، خودکش حملے ہیں، جنگ مسلسل ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ ایٹمی جنگ کے خطرات، سماج میں نئے نئے واقعات کا ہماری زندگیوں پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ اثرات اجتماعی بھی ہوتے ہیں اور انفرادی بھی۔ اس صورت میں ادیب سماج اور معاشرے کو نیا دے رہے ہیں اگر وہ کچھ دیں گے تو معاشرہ بھی انہیں کچھ دے گا۔ ادب کا رشتہ عام زندگی سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ ادیب کو اپنے گرد خول بنانا نہیں چاہیے بلکہ قلم اٹھا کر لکھنا چاہیے۔ حقیقت سے زیادہ حقیقت کو سامنے لانا چاہیے۔ مگر لکھنے والے ذرا اسلوب اور کہنے کے انداز کو بنا سنوار لیتے ہیں، اور بس۔ ان حالات میں ہمیں ایک ایسے ادب کی ضرورت ہے جو کہ لوگوں کے دلوں میں حرارت اور توانائی پیدا کرے۔ نئی منزلوں کو سر کرنے کا حوصلہ دے۔ اس سلسلے میں جناب جمیل جالبی کہتے ہیں۔

"اس وقت ہمارے ادب اور معاشرہ کو ہنگامی ادب Topical literature کی ضرورت ہے۔"

محمد حمید شاہد

میں نے اس موضوع کو کورے کاغذ پر لکھا تھا کہ سارے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ خود پر جبر کر کے بدن میں تیرتی اس سنسناہٹ کو کاٹا تو کھلا کہ یہ موضوع سیدھے سبھاؤ کھلنے کا ہے ہی نہیں۔ میں نے عنوان کا سوانگ بھرے اس آدھے جملے کے آگے استفہامیہ علامت لگائی اور اسے کھلا بھی رہنے دیا، ہر دو صورتوں میں یہ میری چھاتی چاٹنے بنا ٹلتا ہی نہ تھا، سو میں نے یہ حیلہ کیا کہ اس آدھے جملے کو بھی دو نصف حصوں میں بانٹ لیا ہے۔ ایسا کرنے سے بدلتی ہوئی دنیا کی دہشت الگ ہو گئی ہے۔ اب ادب کا کوئی کردار اس دہشت کے منظر میں ہے یا نہیں؟ اس سوال کو میں نے الگ کونے میں لڑھکا دیا ہے۔

بدلتی ہوئی دنیا کیا ہے؟ اور اس کے بدلنے کا پیمانہ کہاں سے میسر آتا ہے؟ کسی زمانی پڑاؤ کے بیچ لکیر ڈال کر سوچیں کے تو کچھ پلے نہ پڑے گا تو یوں کرتے ہیں کہ زمانے کو بدلتی زندگی سے تعبیر دے دیتے ہیں اور زندگی کو اس لٹمس (Litmus) سے، جو ایسڈ (acid solutions) میں پڑتا ہے تو سرخ ہو جاتا ہے اور الکلائین میں ڈوبتا ہے تو رنگ بدل کر نیلا ہو جاتا ہے۔
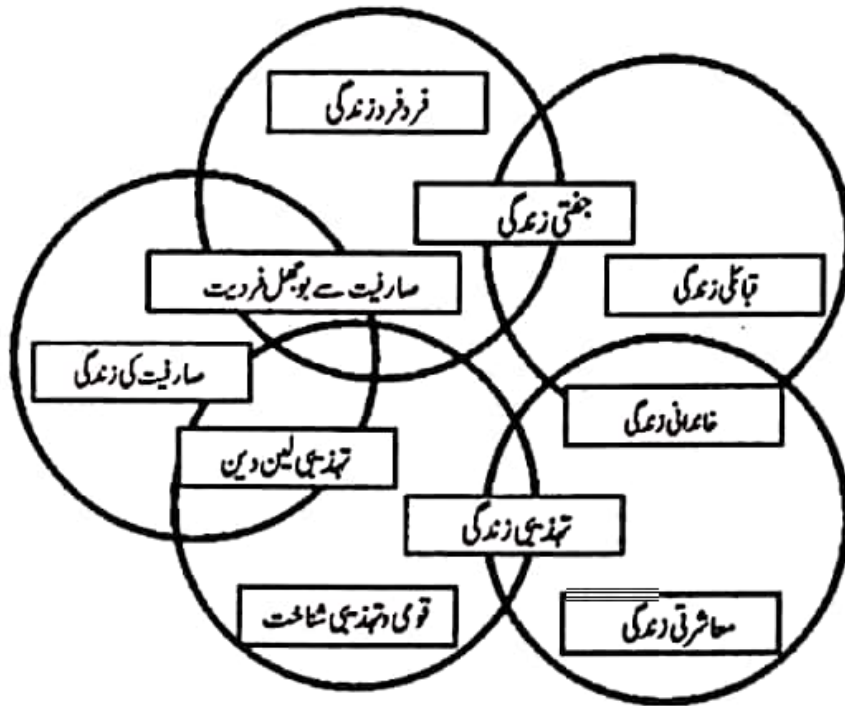
رنگ بدتی اس زندگی کو سمجھنے کے لیے پانچ دائرے لگاتے ہیں یہ پانچوں دائرے اپنے اپنے مراکز پر گھومتے تو ہیں ایک دوسرے کو کاٹتے اندر تک گھستے اور جزوی طور پر منطبق بھی ہوتے ہیں اور جس علاقے میں ایک دائرے کا دوسرے پر انطباق ہوتا ہے وہیں ان کے بیچ ایک انفساخ کو بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے دائرے کے اندر میں نے ،فرد فرد زندگی لکھا ہے اور اسے انسانی زندگی کی ابتداء جانا ہے جب ہر فرد اپنی ذات میں کلی طور پر آزاد تھا۔ آپ اسے انسانی تہذیب کا اولین بیج کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے دائرے میں قبائلی زندگی لکھ دیجئے اور یہ تب کی بات ہے کہ جب انسان نے اپنی ضرورتوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر لیا تھا، تب انہی انسانوں میں سے ایک ان سب پر بااختیار ہوا اور اتنا اختیار حاصل کر لیا کہ وہی آزاد تھا اور پورا قبیلہ اس کا غلام۔ ان دو دائروں کے درمیان وہ انطباقی علاقہ پڑتا ہے جہاں زندگی جنت کے جوہر سے آشنا ہوئی تب عورت اور مرد ایک دوسرے پر حاوی نہیں تھے بلکہ وہ اپنے آزاد اشتراک سے زندگی کے تسلسل کے امین تھے۔ حکمرانی کا لوبھ تو قبیلوں کے پیٹرن بننے کے بعد انہوں نے سیکھا۔ قبیلوں کے اتصال اور مخاصمت کے عمل سے معاشرتی دائرہ وجود میں آیا ہے۔ یہ وہ تیسرا دائرہ ہے جو دوسرے دائرے کے مشترکہ علاقے میں خاندان کی شباہت مکمل کرتا ہے اور چوتھے دائرے پر منطبق ہوتے وقت تہذیب اور روایت کی نمود اور بالیدگی کے سوال سے جڑ جاتا ہے۔ چوتھے دائرے میں تہذیبی زندگی کو جدید سائنسی زندگی کی جانب جست لگاتے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس جست میں انسانیت کے قدم تہذیب اور روایت کی سرزمین سے اکھڑ گئے ہیں اور یہ ایسی زندگی ہے جو چوتھے پانچویں یعنی آخری دائرے کے مشترکہ علاقے میں پڑتی ہے جسے میں نے آخری دائرہ کہا ہے اس میں صارفی زندگی یا پھر معاشی بالادستوں کی چیرہ دستیوں کا زمانہ کہہ لیں اور صاحبو یہی ہمارا بدلا ہوا زمانہ ہے۔

اس صارفیت (consurmerism) والے زمانے کا المیہ یہ ہے کہ اس میں چند ایک ملٹی نیشنل کمپنیوں (جن کی تعداد ایک اندازے کے مطابق سوئے لگ بھگ بنتی ہے) کے ہاتھ سرمائے کا ارتکاز ہو گیا ہے جو اسے ضرب دیئے چلے جانے پر قادر ہیں۔ پیسہ پیسے کی افزائش کرتا ہے۔ افزائش تو خوب ہو رہی ہے مگر ظلم یہ ہے کہ اس سارے عمل میں ان کا مذہبی اور نسلی تعصب بھی پوری طرح بیدار، متحرک اور کارفرما رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عالمی سطح پر بہت سے فیصلے انہی کی ایماء پر ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ واحد عالمی قوت بن جانے والے ملک کے اپنے داخلی سیاسی فیصلے ہوں یا بین الاقوامی، پیداواری مراکز پر قبضہ ہو یا نئی نئی مارکیٹوں کی دریافت اور تنظیم۔ حربی قوت کے استعمال کے فیصلے ہوں یا دست نگر حکومتوں میں ردوبدل کے معاملے۔ جی جمائی تہذیبوں کو بنیاد پرستی کے طعنے سے زچ کرنے اور ان کا رخ موڑنے کا معاملہ ہو یا روایت اور عصری زندگی کے تال میل سے قوت پانے والے ادبی متون کو تخلیق کی بجائے فقط اسے کچر بنا دینے کا معاملہ، ہر کہیں بین الاقوامی سرمایہ کاروں کے تعصبات پوری طرح دخیل دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس جانب توجہ دلاتے ہوئے ایڈورڈ سعید نے اپنے مضمون میں ایک سیاسی تجزیے کا حوالہ دیتے ہوئے نشان زد کیا تھا کہ عالمی سرمایہ کاری کے اس زمانے میں سرحدیں کمزور ہو گئی ہیں، الگ قومی شناخت پر چوٹ لگائی گئی ہے۔ معاشروں اور قومی اداروں کو داخلی سطح پر عدم استحکام سے دوچار کیا گیا ہے۔ مقامی ثقافتیں شناخت سے کٹ کر سرمائے کی اقلیم میں داخل ہو گئی ہیں۔ انفرادی میلانات کو قومی میلانات پر ترجیح دی جاتی ہے اور دنیا بھر کے پانچ میں سے صرف ایک انسان کو سرمائے کی برتری کے

آلہ کار کے طور پر چن لیا گیا جب کہ چار بنا پانچ دنیا ایسا اپاہج کی صورت ہو گئی ہے جس کا ایک ہاتھ آگے ہوتا ہے اور دوسرا پیچھے۔ سا جو اسی اپاہج دنیا میں میں بھی رہتا ہوں اور آپ بھی اور وہ بھی جو ہم میں سے ہیں مگر ادھر سے آنے والی روشن خیالی اور عالمی ثقافت کے فروغ کیلئے چن لیے گئے ہیں۔

تو معاملہ یہ ہے کہ میرے ہاں تو بدلے ہوئے زمانے کی یہ ادھوری تصویر بنتی ہے۔ میں نے اس تصویر کو اپنے ایک افسانے میں گوگول کے ہاں بننے والی اس نامکمل رہ جانے والی تصویر کا ساتھ اڑا دیا تھا جس کی شیطانی آنکھوں کو دیکھتے ہی ابکائی آ جاتی تھی۔ اس تصویر کی شیطانی آنکھوں میں بلا کی چمک ہے۔ اس چوندھ میں تہذیبی زندگی کا دائرہ ٹوٹتا جا رہا ہے یوں اب ہم خاندان سے دوسرے حصے سے جڑ جاتے ہیں کہ اس سمٹتے دائرے میں ادب کیا اپنی سانسوں کو بحال رکھ پائے گا یا یہ بھی بدلتے ہوئے زمانے کے سب سے کارگر حربے یعنی اشتہاریت اور صارفیت کا لقمہ بن جائے گا۔

یہیں سارتر کی ایک بات یاد آتی ہے اس نے لکھا تھا:

"امریکہ میں آپ سڑک پر اکیلے نہیں رہ سکتے، دیواریں تک آپ سے باتیں کرتی ہیں دائیں بائیں آپ کو تختوں پر لگے اشتہار، منور سائن بورڈ اور دکانوں کی بڑی بڑی آراستہ کھڑکیاں نظر آئیں گی جن میں ایک تو بڑی سی تصویر ہوتی ہے اور کچھ اعداد و شمار۔ ان تصویروں میں آپ دیکھیں گے کہ ایک پریشان حال عورت ایک امریکن سپاہی کو اپنے ہونٹ پیش کر رہی ہے یا ایک ہوائی جہاز کسی شہر پر بمباری کر رہا ہے اور تصویر کے نیچے لکھا ہوگا "ہم نہیں انجیل"۔

سو یوں ہے کہ اب منہ پھاڑ کر سنجیدگی سے سوچے بنا نصاب بدلنے کی بات ہوتی ہے، روشن خیالی کا درس دیا جاتا ہے عملی اور بے مہار ثقافتی پالیسی متشکل ہوتی ہے۔ کچھ ہم بدل چکے ہیں، باقی کا کام جدید ترانفارمیشن کا سیلاب آسان بنا رہا ہے۔ ہونٹوں، بموں اور اشتہارات کی نفسیات نے ہماری تہذیبی روایت کو اتنے چرکے لگائے ہیں کہ ادبی سرگرمی کو سنجیدہ و تخلیقی اور تہذیبی عمل سمجھنے کی بجائے ایک ثقافتی سرگرمی سمجھا جانے لگا ہے۔ ایسی سرگرمی جس کے مارکیٹ میں دام لگتے ہیں اور جس کے ذریعے صارفیت کے اس زمانے میں ساکھ بنائی جا سکتی ہے۔ میں خلوص نیت سے سمجھتا ہوں کہ ادب کا اگر کوئی کردار اس زمانے میں ہے تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے اس زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنا نہیں بلکہ اس کے منہ زور تھپیڑوں میں اپنی تہذیبی شناخت سے جڑے رہنے کے اصرار سے ہی بنتا ہے۔ یہی طرز عمل ہمیں اور ہمارے ادب حتیٰ کہ تمام انسانی تہذیبی مظاہر کو صارفیت سے بچا سکتا ہے۔

فاطمہ حسن

جب ہم بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کے کردار کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اس موضوع کا جائزہ لینے کیلئے دوجہتی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک جہت ماضی سے وابستہ ہے اور دوسری حال سے۔ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ماضی میں ادب نے کیا کردار ادا کیا ہے کیونکہ تبدیلی تو ایک مسلسل عمل ہے دنیا کی تاریخ میں ٹھہراؤ کا کوئی دور نہیں آیا۔ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے انسانی تمدن وتہذیب کے بننے کا عمل بھی اس وقت سے شروع ہوگیا ہے۔ جہاں تک انسانی تمدن کی تاریخ کا مطالعہ ہماری دسترس میں ہے وہاں تک ایک متوازی مطالعہ ادب کا بھی موجود ہے۔ اس طرح ادب تاریخ کی گواہی بن جاتا ہے۔ وہ روزنامچہ اور واقعہ نگاری جو مورخ نے کی ہے کس حد تک درست ہے، اسکی سند ادب سے ملتی ہے کیونکہ تاریخ کو لکھوانا اور لکھی ہوئی تاریخ کو مٹانا اہل اقتدار کا شیوہ رہا ہے۔ ایسے میں ادیب اور دانشور معاشرے کی سچی تصویر کشی کرتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو ظاہر کے ساتھ باطنی سچائی کو بھی محسوس کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کی نظریں اس رخ پر بھی پہنچ رہی ہوتی ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل ہے، وہ کسی بھی عمل کے اثرات کو ماضی کے تناظر سے مستقبل کے امکانات تک دیکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ وہ اقتدار اور گروہ کے دباؤ سے آزاد ہوکر لکھتے ہیں اور وہی لکھتے ہیں جو ان کا اپنا سچ ہے، مصلحتوں اور بدنیتی کی آلودگی سے پاک ہے۔ تبھی دانشور کا کردار بہت اہم ہو جاتا ہے کہ اسے آدمی کو تاریخ کے عمل سے گزار کر انسان بناتا ہے، یہ کردار وہ ماضی میں بھی ادا کرتا رہا ہے اور حال میں بھی۔ درندگی جو انسان کی جبلت ہے اس سے معاشرے کو بچانے کے لیے طاقت کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے بیماری کا علاج زہر سے کیا جائے۔ دانشور جراح نہیں ہوتا اس کی فکر اور تحریر معاشرتی بیماریوں کے لیے تریاق ہوتی ہے چنانچہ جب ارباب اختیارات خریدتے ہیں یا وہ کسی گروہی دباؤ میں جانبدار ہو جاتا ہے اور مخصوص طبقے یا فرد کے مفاد کے لیے کام کرتا ہے تو اس کا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ جب ہم ماضی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ارسطو سے لے کر قرۃ العین طاہرہ تک ایسے با کردار دانشور اور ادیب اور شعراء کی مثالیں ملتی ہیں جو اپنے عہد کے قصیدہ خوانوں کی تحریروں کو حرف غلط کی طرح مٹا گئے ہیں۔

ادیب و شاعر اپنے عہد کے سچ اور جھوٹ دونوں کو محسوس کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم انیسویں صدی کے یورپ کا ادب پڑھتے ہیں جو وہاں اخلاقی بحران کا دور تھا، اس عہد میں یورپ میں لکھے جانے والے ناول اور افسانوں کے متعدد کردار اور واقعات ہمارے اپنے آج کے معاشرے میں نظر آتے ہیں۔ یہ مشابہت ایک عہد کے حالات کی سچی تصویر کشی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً موپساں کا ناول بل امی (Bell Emi) جو 1884ء میں فرانس میں لکھا گیا وہاں کے اخبارات سے وابستہ افراد کے شب و روز پر مشتمل ہے۔ اس ناول کے کردار ہمارے آج کے معاشرے میں مل جائیں گے۔ موپساں نے اپنے

عہد کی منافقتوں کو اس طرح رقم کر دیا ہے کہ یہ ناول ایک ایسا آئینہ بن گیا ہے جس پران کرداروں کا عکس واضح ہے جو طبقاتی دوڑ میں آگے نکلنے کے لیے اخلاقی اقدار کو پامال کر گئے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں فیوڈل اور وڈیرہ کی جگہ بیٹنے کیلئے ایک اور طبقہ جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرتا ہے جس میں مذموم ترین قلم کا ذریعہ ہے۔ آج جب صحافت ہمارے یہاں صنعت بن گئی ہے، یہ ناول ہمارے اپنے معاشرے کو بھی بے نقاب کر رہا ہے۔ اتنا سچا اور بڑا ناول لکھنے کے لیے موپساں کی جو تربیت ہوئی تھی اس کا اندازہ ان الفاظ سے لگائیے۔ وہ اپنے مربی فلابیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں نے بہت محنت کر کے اپنی ابتدائی تحریر فلابیر کو دکھائی تو انہوں نے کہا اگر تم میں انفرادیت ہے اسے ظاہر ہونا چاہیے اگر نہیں ہے تو حاصل کرو۔ لٹریچر چھوٹوں کی تخلیق نہیں صلاحیت صبر آزما ہی ہے۔

فلابیر (Flaubert) کی تربیت نے موپساں جیسا حساس اور عظیم ادیب پیدا کیا اس عہد میں فرانس کے ناول نگاروں نے اپنے معاشرے کے تاریک گوشوں کو بے نقاب کیا۔ اس طرح انقلاب روس سے پہلے اور بعد کا دور پوری جزئیات کے ساتھ وہاں کے ناولوں میں موجود ہے۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے برصغیر کی تہذیب وتمدن کے ادوار اور سیاسی و سماجی تاریخ ادب پاروں میں محفوظ ہے۔ وہ شہر آشوب ہوں، مثنوی ہوں، قصیدے ہوں، خطوط اور تذکرے ہوں یا ناول ہمیں ہندوستان کی تاریخ اس عہد کے ادب میں مل جاتی ہے۔ یہ تمام مثالیں دینے کے بعد میں اب ادیب کے کردار کے اس حصے کی طرف آتی ہوں جو وہ اپنے عہد میں ادا کر تا رہا ہے کیونکہ ادب کا کردار در اصل ادیب کا کردار ہوتا ہے۔ پہلے تو ادیب کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ اپنے قلم کے ساتھ آزاد ہے۔ اگر اس نے یہ آزادی برقرار نہیں رکھی ہے تو اس کا کوئی کردار باقی نہیں رہا ہے، چنانچہ کسی بھی معاشرے میں ادب کا کردار اسی وقت موثر ہوسکتا ہے جب ادیب کا اپنا کردار برقرار ہو اور جس معاشرے میں چند ادیب ادبی خودکشی سے محفوظ رہ جاتے ہیں وہ پورے معاشرے کو ایسا آئینہ دکھا سکتے ہیں جس میں سیاہ اور سفید واضح ہو شرط ایسا لکھنے والوں کا موجود ہونا ہے۔ آج کا ماحول ایسے ادیبوں کے لئے سازگار نہیں کیونکہ اب صرف ارباب اقتدار ہی نہیں ہر وہ طبقہ جسے معاشرے میں بااثر ہونا ہے قلم کی قیمت ادا کرنے پر تلا بیٹھا ہے خصوصاً میڈیا کی یلغار نے ان لکھنے والوں کو مستعد کر دیا ہے۔ جو "آج کے دن" میں زندہ ہیں۔ وہ اعلیٰ قدریں جو علم و دانش اور جمالیات سے فروغ پاتی ہیں آج جتنے خطرے میں ہیں پہلے نہیں تھیں۔ آج کی دنیا میں ضروری ہے کہ ان علوم کی طرف توجہ دی جائے جو دانش (Intelect) اور احساس جمال (Aesthetic sence) کو بلند کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی قدر کی جائے جو اپنے کردار کو بچا کر ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کے قلم کی حفاظت کی جائے اور ایسے حالات نہ پیدا کئے جائیں کہ وہ بھی کسی ساہوکار کے ہتھے چڑھ جائیں۔ تاہم بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ آج کے ادبی مباحث میں ایک بحث یہ بھی شامل ہے کہ انسان نے اپنی تمام تر علمی اور سائنسی ترقی کو دوسرے انسان کی تباہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ کیا ادیب اس الزام سے بچے ہوئے ہیں۔ ادیب کو انسان کی گمراہی پر دکھ اور شرمندگی کا سامنا ہے۔ آج گلوبلائزیشن کے دور میں ساری دنیا کے ادیبوں کو اپنا بنیادی کردار ادا کرنا ہے اور وہ ہے تمدن کی حفاظت۔ یہ تمدن خواہ کسی بھی خطے کا ہو اسے محفوظ رہنے دیا جائے۔ دنیا کے ہر فرد کو امن، محبت اور حسن کے احساس و معنی سے آگاہ کرنا ہی ادب کا بنیادی کردار ہے۔

زاہد حسن

دنیا جامد، غیر متحرک اور ٹھہر جانے والی حقیقت نہیں، بلکہ دنیا سے جو تصورات وابستہ ہیں، جو نظریات جڑے ہیں، ان میں تصور کی تبدیلی اور نظریے کے بدلنے کے عوامل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں یوں جب ہم دنیا کو ایک تبدیل ہونے والی حقیقت کے طور پر دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ دنیا سے جڑی اشیاء، واقعات اور حالات بھی تبدیل ہونے والی حقیقتوں کے زمرے میں آتے ہیں، سو دنیا سے اور اہل دنیا سے بھی، کلچر کا، تہذیب کا اور ادب کا جو تعلق بنتا ہے وہ بھی اس سے ہم آہنگ رہ کر مسلسل تبدیل ہوتے رہنے کا ہے۔ ترقی کا اور تبدیلی کا تعلق۔

ہمارے سامنے مسئلہ آج کی دنیا، آج کے ادب اور آج کے انسان کا ہے آج کی دنیا جو وسیع تر معنوں میں سکڑتے ہوئے انسان کی سکڑتی ہوئی دنیا ہے، آج کا ادب جو ایک ہمہ جہت استعارہ تخلیق کر رہا ہے آج کا انسان جو یہ استعارہ ہے یہ استعارہ بین الاقوامیت کے اس رجحان کو بھی ظاہر کر رہا ہے جس کا حصہ ہم بن رہے ہیں۔

یہ سیموئل پی ہنٹنگٹن کے اس نظریے کو بھی تقویت دے رہا ہے جو تہذیبوں کے تصادم سے ایک نئی تہذیب کو تخلیق کرنے والا ہے اور یہ استعارہ اس جستجو یا نہ ملنے کا اظہار بھی ہے جو بیک وقت دنیا، انسان اور انسانی تہذیب کا قبرستان بن چکی ہے۔

آج ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار کیا بنتا ہے؟

ایک بات طے ہے کہ ہر عہد، کسی بھی طرح کے حالات اور کسی بھی طرح کی تاریخی اور تہذیبی صورت حال میں ادب اور ادیب نے اپنا کردار ادا کیا ہے؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادب آج بھی اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ نتائج کے لیے ہمیں کچھ وقت انتظار کرنا پڑے گا۔ وقت کی رفتار سے لگتا ہے کہ انتظار کا یہ عرصہ کچھ زیادہ طویل نہیں ہوگا۔

ہمارے سامنے ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا اس ادب کی تخلیق کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے جو بغیر نظریہ، بغیر اصول، بغیر منشور اور بغیر کسی آئینی ضابطے کے ہو۔ کیا دنیا ان اخلاقی، قانونی اور تہذیبی ضابطوں سے آزاد ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس ادب کی تخلیق کیوں ضروری ہے جو کسی بھی نظریئے سے خالی ہو۔ اگر ہم یہ کہیں کہ تاریخ کے کسی بھی دھارے پر دنیا نے حقیقی انسانوں کو نظر انداز نہیں کیا تو وہاں پر ہی یہ عظیم ادب کا منصب رہا ہے کہ وہ اپنے لیے حقیقی مصنف ڈھونڈے اور پھر کسی بھی مصنف کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی منصب کو پہچانے اور محمد سلیم الرحمن کے الفاظ میں "کسی مصنف کی بدترین غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی منصب کو پہنچانے سے قاصر رہے۔"

موجودہ عہد اور اس عہد کے ادیب کو دیکھئے تو وارث شاہ کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔

"حق سچ دی گل نہ کرے کوئی، جھوٹ بولنا رسم سنسار ہوئی۔"

مجھے اپنی بات بڑھانے کے لیے عظیم ادیب لوشاں کی تحریر کا حوالہ دینا ہے وہ "پاگل کی ڈائری" میں لکھتے ہیں۔

"جس چیز کو سمجھنا ہو اس پر محتاط غور کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدیم زمانوں میں لوگ عموماً انسان کھاتے تھے مگر اس کے بارے میں میری معلومات دھندلی ہیں۔ میں نے اس پر غور کرنے کی کوشش کی مگر میری تاریخ میں کوئی تسلسل نہیں اور ہر صفحے پر ہر جگہ یہ الفاظ بے ترتیبی سے لکھے ہوئے ہیں "نیکی اور اخلاقیات" چونکہ مجھے کسی طور پر نیند نہیں آتی تھی اس لیے میں آدھی رات تک پڑھتا رہتا تھا، اس وقت تک جب تک کہ مجھے بین السطور لفظ نظر آنے لگے پوری کتاب ان دو الفاظ سے بھری ہوئی تھی آدم خور"۔

دراصل لوشاں کے تخلیق کردہ کردار کے سامنے چار الفاظ ہیں لیکن ان کی شناخت دو، دو کی اکائیوں میں بٹ چکی ہے۔ "نیکی اور اخلاقیات" کی علیحدہ شناخت اور "آدم خور" کی اپنی علیحدہ شناخت، سو ہماری آج کی تاریخ انہی چار الفاظ سے ترتیب پا رہی ہے، ہمارا آج کا ادب انہی چار الفاظ سے تشکیل پا رہا ہے۔

تاریخ کے دانشوروں کے نزدیک یہی بدلتی دنیا کے تقاضے ہیں اور بدلتی ہوئی دنیا کی صورت گری کرنا ہی ہمارے جدید ادب کا بنیادی اور اہم کردار بنتا ہے۔ آدم خور ایک اضافی علامت ہے جو جدید سرمایہ دارانہ نظام سے تشکیل پائی ہے۔ اس سرمایہ دارانہ نظام کی پرورش دنیا بھر میں موجود جاگیردارانہ ذہنیت نے حال اور دہشت پسندانہ عناصر کر رہے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ آج جب اس سارے نظام کی "جکڑ" ٹوٹ رہی ہے، کہیں نہ کہیں ایسی ہی بعض دوسری قوتوں کی گرفت دنیا پر اور اہل دنیا پر اور زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور فی زمانہ بعض روشن خیال لوگ بھی جدیدیت کی یلغار میں آ کر فنا ہو رہے، ختم ہو رہے دنیا کے تمدن، اس کی ثقافتی رنگارنگی کے مٹنے پر نوحہ کناں ہیں کہ ان کے نزدیک عظیم ادب انہی عظیم تہذیبی عناصر سے جڑا ہوا ہے۔ ایک بین الاقوامی کلچر کا فروغ ان کے نزدیک ان بیشتر دوں تہذیبوں کی موت کا پیام ہے جو صدیوں سے انسان کے ذہنی، روحانی، تہذیبی، اور سماجی عناصر کی نشوونما کرتی چلی آئی ہیں۔

اسی گھمبیر مسئلے سے ایک نیا راستہ نکالنا ہی دراصل آج کے ادب، ادیب اور دانشور کا واحد فرض بنتا ہے کہ وہ ایک ایسے انسانی معاشرے کی تخلیق ممکن بنائے اور اس معاشرے کی تشکیل کے لیے ایسے ادب کی تخلیق ممکن بنائے جو اپنے اندر وسیع المعانی زندگی کے عناصر لیے ہو۔

بیک وقت تبدیلیوں کے عمل کے زمانے میں اپنے کلچر اور تہذیبی عناصر کے ساتھ یکجہتی کا اظہار ممکن نہیں۔ انسان کے لیے برابری اور انصاف کے عمل کا حصول ہی بعض اوقات ہمارے صدیوں پر محیط کلچر کے لیے موت کا وسیلہ بن جاتا ہے تاہم یہی عمل ہے جو ان غیر انسانی اور غیر اخلاقی روحانی قدروں کو سبوتاژ کرنے کا سبب بنتا ہے جن کا ہمارے ماضی کے عظیم ادبی ورثے سے گہرا تعلق ہے۔ ہمارا کلچر اور ادب جن عظیم عناصر کے لیے ہیں ان میں فوک وزڈم اور لوک گیتوں کے وہ حصے بھی شامل ہیں جو عورتوں سے متعلق ہیں۔ انسانی آزادی اور اس سے بڑھ کر عورت کی آزادی کے لیے ہمیں بہت کچھ قربان کرنا پڑے گا، جس میں زیادہ تر حصہ لوک ادب پر مشتمل ہوگا ہم نے دیکھا ہے کہ غیر جمہوری معاشروں نے انسانی ذہن اور اس سے بڑھ کر انسانی فکر کے

،رکھوے ہیں۔اسی جسمانی کشاکش اور فکری گھمبیرتا نے بڑے ادب کے لیے سازگار حالات پیدا کیے۔آج کا عہد مسائل کے حل کا نہیں بہت سے بحرانوں کے یکجا ہونے کا عہد ہے۔آج کا عہد عظیم انسانی ایسے کا راستہ ہے،جس سے گزرنے کا مطلب ہے کہ عظیم فکری طرف پیش رفت .... وہ نوآبادیاتی سامراج جس نے ایک وقت میں پوری دنیا میں جاگیرداری نظام کو زندگی،استحکام اور تحفظ فراہم کیا تھا،وہی سامراج آج ایک عالمگیر انسانی سماج کو ترتیب دینا چاہتا ہے۔اس کے ممکنات اور ثمرات سے آگہی بھی آج کے ادب اور ادیب کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ایک راستہ انسانی حقوق کی طرف جاتا ہے۔ انسانی حقوق اسی وقت میسر آسکتے ہیں جب دنیا بھر کے معاشروں میں موجود سماجی مسائل حل ہو جائیں،وہاں بنیادی جمہوریتیں قائم ہوں،رائج معاشرتی ڈھانچوں کو مناسب اور قابلِ برداشت ڈھانچوں میں تبدیل کیا جائے اور درحقیقت یہ معاشرتی سدھار ،معاشی ہم آہنگی اور معاشی برابری سے ہی ممکن ہے۔معاشی ڈھانچے کی تبدیلی یوں ممکن ہے کہ تعلیم عام کی جائے،زراعت اور کاشتکاری کے نظام کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے۔مطلب یہ کہ معاشی ہم آہنگی ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو اس انسانی اور کائناتی حسن کو دائم و قائم رکھ سکتا ہے اور آج ہم جس عدم توازن اور بدصورتی کا سامنا کرتے آئے ہیں اس کی بنیاد بھی معیشت ہی رہتی ہے اور وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ

''مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے۔''

تو بجا کہا ہے۔

عزتِ نفس کا تحفظ،خوراک،تعلیم،صحت جیسے ذرائع کی دستیابی عظیم انسانی خواب ہے جو دنیا پر جنت آباد کرنے کے عمل سے جڑا ہے۔اظہارِ رائے کی آزادی،اپنے خیالات،عقائد اور تہذیبی عناصر کے مطابق جینے کے عوامل اس کے بعد آتے ہیں۔تاہم کسی معاشرے کا تاریخی ورثہ،تہذیبی قدریں،مذہبی آزادی،ترقی،خوشحالی،اندرونی و بیرونی خوف سے تحفظ،اور قومی شناختوں کو قائم رکھنے اور وسعت دینے والے افکار اور نظریات کو عملی شکلیں دینا اور معاشرتی زندگی پر ان کا اطلاق جیسے عوامل ہی لوگوں کو سیاسی طرزِ زیست عطا کرتے ہیں۔عوام معاشی و سماجی ترقی کے خوابوں کو عملی شکل دینے کے لیے سیاسی جماعتیں بناتے ہیں۔ادب اور ادیب بھی ایک پیرلل سیاسی جماعت کا روپ ہیں اور انہیں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ انہیں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

رواداری،برداشت،قبولیت،مخالف نقطۂ نظر کو تحمل سے سننا،دلیل کو دلیل سے قبول کرنا،اپنی آزادی کا حق جتاتے وقت دوسروں کی آزادی کا احترام کرنا،ایسے عناصر ہیں جو بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے رجحانات زیادہ واضح کرتے جا رہے ہیں۔جب ہم آج کی دنیا،اس کی تبدیلی،اس میں تخلیق ہونے والے ادب اور ادیب کے کردار کا جائزہ لیں گے تو لامحالہ ہمیں ان تمام تر معروضی و غیر معروضی حالات کا مطالعہ کرنا پڑے گا جو اس نئی دنیا کی توڑ پھوڑ اور تشکیل و تعمیر میں بیک وقت کارفرما ہیں ہمیں ان عظیم تہذیبوں،ان عظیم تہذیبوں کے کلچر اور وہاں کے فنکاروں چاہے ان کا تعلق قرونِ اولیٰ سے ہو،قرونِ وسطیٰ سے،اور یا وہ دورِ موجود کا آشوب تخلیق کر رہے ہوں،سب کا جائزہ لینا پڑے گا۔

عراق،عراقی تہذیب اور عراق کا انسان آج کے ادب کا بنیادی استعارہ عراق یعنی میسوپوٹیمیا کی تہذیب۔

''کوئی چھ ہزار برس سمیری اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے بابل،آشوریہ،یونان،پارتھیا،ایران کے ساسانی اور آخر میں

عرب .... اس علاقے میں اپنی سلطنتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جسے آج عراق کہا جاتا ہے۔ اس لیے اسے میسوپوٹیمیا تمدن کا گہوارہ قرار دیا گیا ہے۔ آج ہماری زندگی جن سہولیات سے عبارت ہے ان میں سے بیشتر یا تو اسی سرزمین پر ایجاد ہوئیں یا ان کو ابتدائی شکل حاصل ہوئی، اسی سرزمین کے دو بڑے دریاؤں کے کنارے پر شہری تہذیب نے اپنے طویل سفر کا آغاز کیا۔" یہ سرزمین پورے کرۂ ارض پر منفرد ہے۔ روایت ہے کہ آدمؑ اور حوا کا باغ بھی یہیں ہے۔"

ضمیر نیازی نے عراق کو انسانی تمدن کا گہوارہ قرار دیتے ہوئے مزید لکھا ہے:

"یہ کئی انبیاء کی جائے پیدائش ہے جن میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یونسؑ، حضرت دانیالؑ، حضرت ایوبؑ اور کئی دوسرے شامل ہیں۔ یہ حضور پاکؐ کے کئی ساتھیوں کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ جن میں حضرت علیؑ نمایاں ہیں۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے 72 ساتھی اور بارہ میں سے سات اماموں کا مرقد بھی یہیں ہے۔ نہ جانے کتنے صوفیا، علماء، سائنس دان، فلسفی، شاعر، ادیب اور ہنرمند خطاط اسی خاک کا پیوند بنے۔"

یقیناً دنیا تبدیلیوں کی آماجگاہ ہے اور ان تبدیلیوں کے اثرات سے کوئی خطہ، کوئی تہذیب محفوظ نہیں رہتے۔ بسا اوقات تو ان تبدیلیوں کی شدت صدیوں پر محیط تہذیبی رنگینوں کو ڈھیریوں میں تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ تباہی و بربادی کی ذمہ دار طاقت بالآخر حق اور سچ کے لبادے میں دنیا کے سامنے ظاہر ہوتی ہے حالانکہ اس کا یہ اظہار صدیوں کے انسانی سفر کی موت کا سبب ہوتا ہے۔ اس صورتحال میں ایک ادیب کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ عرب دنیا کے نامور ادیب نجیب محفوظ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں وہ اپنے ایک مضمون "مصنف کا منصب" میں لکھتے ہیں:

"مصنف بھی ایک شہری ہوتا ہے اور کسی بھی دوسرے شہری کی طرح وہ اہم واقعات پر اپنے جوابی عمل کا اظہار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر عوام ہتھیار اٹھا لیتے ہیں تو مصنف بھی ان میں شامل ہو سکتا ہے۔ شاید وہ مصنف کے طور پر اپنا کردار صرف اس وقت ادا کر سکتا ہے جبکہ اس قسم کے واقعات ختم ہو جائیں۔ یقیناً وہ، جس وقت جنگ چھڑ گئی ہو، یہ نہیں کر سکتا کہ اپنے ہتھیار رکھ دے اور بیٹھ کر کوئی ناول یا ڈرامہ لکھنا شروع کر دے۔"

صرف ہنگامے کے ختم ہو جانے کے بعد ہی لکھنا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے خاصے عرصے اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے دوران فنکار واقعات کی فن میں ضروری منتقلی کی نئی صورت گری سے پہلے واقعات پر غور و خوض کر سکے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ فن جنگ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور میرے خیال میں یہی آخری بات درست ہے کہ فن ہی نہیں فنکار بھی جنگ کے ساتھ ساتھ چلے جنگ کی نفی کرنے، جنگ کو ایک منفی عمل، ایک غلط اقدام قرار دینے، سچ کی راہ پر گامزن انسانوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور درست نقطۂ نظر بیان کرنے کا بہترین وسیلہ بن سکتا ہے۔ یہ عمل، یقیناً حق کی اور سچ کی کوئی ایک اصطلاح، کوئی ایک صورت نہیں ہو سکتی لیکن انسانی سچائی کا ایک عالمگیر چہرہ ہے اور وہ ہے امن۔ ہمیں جنگ لکھنے والوں کو ایک عظیم عالمگیر امن کا حامل ادب تخلیق کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت ماضی میں ایسے پیدا شدہ حالات کی نسبت آج کہیں ضروری اور کتنی ہی اہم ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ بعض اوقات ایک معمولی سا واقعہ ایک عام سا کردار، عظیم تخلیق کا باعث بن جاتے ہیں لیکن یہ بہت کم زبانوں اور نہایت قلیل مصنفین کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ بڑے واقعات اور حادثات

ہی بڑے ادب کی تخلیق کی وجہ بنتے ہیں، تاریخ انسانی اس کی مینی شاہد ہے۔

اس لحاظ سے بھی ہمارا عہد بڑے واقعات، بڑے حادثات اور بڑی تبدیلیوں کا عہد ہے۔ سویت روس کا انہدام، افغانستان، عراق جنگ، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے باعث ایک بین الاقوامی زبان اور کلچر کی بنیاد، یورپین یونین کا قیام، برصغیر میں کشیدگیوں اور نفرتوں میں بدستور رہنا، رطلائزیشن کا عمل، سونامی کی تباہی، ان سب عوامل نے بر خاص و عام کی طرح لکھنے والوں کے سامنے بھی بہت سے سوالات ادھرے ہیں۔

یہ کہ ہر خطے کے انسان کو اپنی علیحدہ شناختوں اور آزاد حیثیتوں کے ساتھ بین الاقوامیت کا حصہ بنتا ہے۔ انسان کی یہ زندگی دو متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی زندگی ہوگی۔ یوں بہت کم زندگیاں ہوں گی جو اس دہری صورتحال میں باقی رہ جائیں گی اور ان کی بقا کی راہیں تلاش کرنا ہی ہمارے عہد کے ادب کا اہم کردار بنتا ہے۔

شہناز شورو

مضمون کا عنوان ادب کو کسی خاص حد تک، خطے یا زبان تک محدود نہیں کرتا کہ فلاں جگہ کا فلاں زبان میں لکھا جانے والے ادب کا فلاں خطے پر اثر .... وغیرہ

یوں بات زیادہ گہری اور اہم ہو جاتی ہے۔ اس گلوبل ولیج میں جس میں ہم زندہ ہیں، انسان، کلچر، تہذیبیں، روایات، رسم و رواج ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہوئے thesis اور Anti thesis کے عمل سے گزر کر synthesis کے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں اور یوں ایک بین الاقوامی کلچر معرض وجود میں آیا ہے جو میرے یا آپ کے پسند کرنے، ناپسند کرنے کے باوجود ہمارے گھروں میں داخل ہو رہا ہے اور اس خود کار عمل کو روکنا سر دست ممکن نظر نہیں آتا۔

عصر حاضر، حیرت انگیز عہد ہے۔ محض ایک صدی، بلکہ ایک سے بھی کم عرصے پہلے پلٹ کر دیکھئے تو آج کی تیز رفتار ترقی یافتہ دنیا کو منٹوں میں نیٹ کے ذریعے connect کرتا، ملاتا جوڑتا ہوا دور اور دیوانے کی بڑ یا الہ دین کے جادوئی چراغ کی طلسماتی اور ناقابل یقین دنیا سے زیادہ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ میں تو کبھی کبھی ان بادشاہوں اور جرنیلوں کے بارے میں سوچتی ہوں جن کی جنبش ابرو سے سلطنتیں ہل جاتی تھیں، آج وہ خون کے پیاسے کیسے بچارے معلوم ہوتے ہیں جو وقت کی رفتار کا مزہ نہ چکھ سکے۔

میرا تعلق چونکہ اردو اور سندھی ادب سے ہے اور انگریزی ادب پڑھنا مقسوم ٹھہرا۔ لہٰذا میں نے اپنی سہولت کے لیے اس وسیع موضوع کے ایک چھوٹے حصے کا انتخاب کیا ہے۔

عصر نو کو در پیش چیلنجز واقعتاً معمولی نہیں ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ ادب جو ایگریکلچر دور میں بڑی تمکنت اور شان سے نہ صرف تفریح طبع یا دلچسپی کا ذریعہ تھا بلکہ catharsis کا موثر ترین ذریعہ بھی، صنعتی دور کے شروع ہوتے ہی اس کی طاقت اور مزاحمت کمزور پڑ گئی اور آج کا دور جو صنعتی انقلاب کا دور ہے، ادب کو اسی اعتبار سے نہ صرف بڑے مسائل درپیش ہیں بلکہ ادب کی فعالیت سکڑ اور سمٹ رہی ہے۔ تجزیہ نگاروں کے خیال کے مطابق دنیا کتابوں سے دور ہو رہی ہے لکھے ہوئے لفظ پڑھنے کی فرصت کم لوگوں کے پاس ہے۔ سائنسی ایجادات سے استفادہ کرتے کرتے، سائنسی علوم انسان کے ذہن و دل پر حاوی ہو چکے ہیں اور ادب اس کی ترجیحات میں کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ ہر آنے والی نسل، اپنی پچھلی نسل سے زیادہ ذہین، ہوشیار زمانہ ساز اور سائنسی ادراک رکھنے والی ہوتی ہے مگر ادب کے معاملے میں ہر نئی نسل اپنی گزشتہ نسل سے کمتر نظر آتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے

کہ اپنی اس کمی، خامی یا کمزوری پر بجائے افسوس کرنے یا نادم ہونے کے، ادب کو الیم، بیکار لوگوں کا شغل اور شاعری کو احمقوں کی جنت وغیرہ وغیرہ جیسے القابات دیئے جا رہے ہیں۔ ادب سے دوری کی وجہ سے گھروں میں بدتہذیبی اور بے ادبی نے ڈیرہ ڈال دیا مگر لوگ اس بدصورت تبدیلی سے قطعاً بے نیاز ہو، بدتہذیبی پر فخر محسوس کر رہے ہیں۔ ادب زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ معاشرے کے تمام تر رخوں کو بیان کر کے اس کی خامیاں، کمزوریاں اور برائیاں بے نقاب کرتا ہے، تاکہ لوگ اندازہ لگا سکیں کہ کس رخ پر جا رہے ہیں اور یہ کہ تبدیلی کی سمت کیا ہے؟ درست اور غلط اور اک ادب سے بہتر اور کس ذریعے ممکن ہے؟

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں نے بھی اس مشکل ذمے داری کو اتنے اعلیٰ اور عمدہ طریقے سے نہیں نبھایا جتنا انہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپس کی ادبی چپقلش، زبانوں اور کلچر کے اختلافات سے صحت مند ادبی فضا کی بجائے ایک ایسی صورتحال نے جنم لیا جس نے تمام لوگوں کو ادب سے دور کیا اور ادیب پر بھروسہ ختم ہو گیا۔

ورنہ ادب ہی کی طرح ہر میدان میں، ہر شعبے میں آئے دن نت نئے چیلنجز آتے رہتے ہیں۔ سائنسی ایجادات، نیٹ کی دنیا، چینلوں کی بھرمار، میڈیا کا فروغ، کیا یہی رئیل چیلنجز ہیں اور ادب کا لکھنا پڑھنا، کتاب کا شائع ہونا، لوگوں کی کتاب سے دلچسپی کے ختم ہونے کے اسباب کیا یہی ہیں؟

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب سائنسی ترقی سے خوفزدہ ہے؟

یا ادب سائنسی ایجادات کا دشمن ہے اور ادب اور سائنس کی سمتیں مختلف ہیں۔ مجھے اس بات سے قطعاً اختلاف ہے۔ کیا ادب خیال اور فکر کا نام نہیں ہے۔ کیا ادب تخیل اور تصور نہیں ہے۔ سائنس کی کوئی بھی ایجاد تجرباتی سطح پر آنے سے پہلے سوچ فکر اور تخیل میں موجود ہوتی ہے۔ یقین سے پہلے گمان ہی ادب ہے کیا کوئی چیز معرض وجود میں آنے سے پہلے خیال میں نہیں آتی، اگر آتی ہے تو یہی ادب ہے۔ تصور جمال، تخیل پرواز سے لیکر سائنسی تصورات تک سب ادب ہی ہے۔

لہذا جواد با یا دانشور موجودہ دور میں ادب کی ناکامی یا اعلیٰ ادب تخلیق نہ ہونے کا ذمہ دار سائنسی ایجادات اور تہذیبوں کے ٹکراؤ کو ٹھہراتے ہیں، میرے خیال میں مناسب نہیں کرتے۔ حقیقتاً ہر کمزور چیز طاقتور قوت سے مات کھاتی ہے، تو کیا ادب کو ایک کمزور ادارہ سمجھ لیا جائے اور ادیب خود کو میڈیا کی یلغار کے سامنے کمزور پا کر سرنگوں ہو جائے۔

جدید دور کسی بھی طرح ادب سے متصادم نہیں، ہاں اگر کسی خطے کا ادب معاشرے میں اپنا نیا مقام متعین نہیں کرتا تو اس کے اسباب جاننے چاہئیں اس پر اوپن ڈسکشن ہونی چاہیے۔ ادب کی موت، معاشرے کا جمود ہے جو معاشرے ہر اعتبار سے کمزور، غلام، غیر محفوظ اور بے اعتمادی کا شکار ہوتے ہیں، وہیں ادب زوال پذیر ہوتا ہے اور لوگ ادب سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں ورنہ جن ممالک میں سائنس کو فروغ حاصل ہوا وہاں پر آج بھی ادیب اہم ہے، اعلیٰ ادب تخلیق ہو رہا ہے، لوگ کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں، تراجم ہوتے ہیں اور لوگوں کی ادب سے دلچسپی برقرار ہے

ابھی چند مہینے پہلے ہی ایڈیٹر جنگ جناب محترم محمود شام نے ٹورنٹو، کینیڈا میں ادب دوستی و ادب نوازی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ فیچر لکھا جسے "الفاظ گلی" کا نام دیا گیا۔ بقول شام جی "اس الفاظ گلی کو ایک تخیلاتی دنیا سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ ہر طرح کی کتابوں کے اسٹال، ادیبوں کی نشستیں، پڑھنے والے ادیب بھی موجود، سننے والے بھی، خریدنے والے ادب کے شائقین بھی، صبح سے شام تک مختلف اسٹالز اور خیموں پر جمع تھے۔ ادب کی ایسی بے مثال پذیرائی تھی کہ انہیں اپنے ادیب ہونے پر

فخر ہو رہا تھا۔"

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں اب بھی عمدہ اور معیاری ادب لکھا اور پڑھا جا رہا ہے۔ کتابیں لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچتی ہیں، نقاد اپنا کام جانفشانی سے کرتے ہیں۔ مترجم دوسری زبانوں کے شہ پارے اپنی زبانوں میں ترجمہ کرتے، پڑھنے والے کو رفتارِ ادب سے آشنا رکھتے ہیں مگر ہمارے ہاں صورتحال اس کے برعکس ہے۔ ادب سے دوری اس درجہ بڑھ چکی ہے کہ شاعر یہ بتاتے ہوئے ڈرتا ہے کہ وہ شاعری کرتا ہے۔ ادیب اپنے مخصوص حلقے کے علاوہ خود کو ادیب کہلاتے ہوئے شرماتے ہیں۔

فلسفی تو اس معاشرے میں شروع سے ہی قابلِ قبول نہیں، تنقید کی صورتحال بھی کچھ اچھی نہیں۔ ادیبوں، شاعروں، فلسفیوں اور مفکروں کے بارے میں انتہائی بے سروپا لطیفے بنا کر انہیں خبطی، احمق، بے وقوف بلکہ پاگل تک مشہور کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

ادب نے تاریخ میں کئی بار مایوس اور پژمردہ معاشروں میں انقلاب برپا کیا ہے۔ ایک خاموش انقلاب اور جب تک کسی معاشرے میں ادب اپنا روایتی کردار ادا نہ کر پا رہا ہو تو ایسے میں اندازہ لگانا چاہیے کہ دراصل ادیب مایوسی کا شکار ہے۔

ہمارے ادیب بڑے حادثوں یا بڑے سانحات کے انتظار میں رہتے ہیں۔ 1947ء میں تقسیمِ ہند کے بارے میں بڑا ادب تخلیق ہوا جو کہ مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر بین الاقوامی ادب کے ہم پلہ ٹھہرا۔ میں نے خود کئی بار ادیبوں سے سنا ہے کہ "اب ادب میں موضوعات نہیں رہے" سوال یہ ہے کہ کیا سب مسائل ختم ہو گئے؟ انسان نے تمام آلائشوں، عذابوں، مصیبتوں، بیماریوں، جسمانی، نفسیاتی و پیچیدہ ذہنی مسائل سے نجات پا لی ہے۔ کیا ذہنی غلامی سے انسان نے چھٹکارا پا لیا ہے؟ کیا حاکم و مظلوم طبقے کے درمیان فاصلہ سمٹ گیا ہے؟ کیا اس دنیا کی نصف آبادی یعنی عورت کو انسان کی حیثیت مل گئی ہے۔ کیا دولت، جنس اور حرص و ہوس کی آڑ میں معصوم جانوں کا قتل اور کاروبار بند ہو گیا ہے۔ کیا بچوں کی سمگلنگ، زیادتیوں اور جنسی جرائم، خون آشامی پر کنٹرول کر لیا گیا ہے؟ کیا تعلیم، صحت اور چھت ہر انسان کو نصیب ہو گئی ہے۔ کیا پولیس کسٹڈی میں اب نوجوانوں کی لاشیں برآمد نہیں ہوتیں؟ کیا آبرو ریزی، قتل و غارت گری اور رہزنی کے واقعات ختم ہو گئے ہیں۔ کیا جنگیں ختم ہو گئی ہیں، کیا دنیا میں تمام بارودی سرنگیں اور مارچ سیلز نیست و نابود ہو گئے ہیں؟ کیا مزدور کا خون پسینہ نہیں بکتا۔ کیا استحصال اب نہیں ہوتا؟ کیا انسان کی کسی نسل کا مقدر ایک بے خوف اور محفوظ زندگی ہے؟

یقین مانیں کہ ہر سوال کا جواب نفی میں ہے تو پھر اعلیٰ، مقصدی اور معیاری ادب کی تخلیق و نمو نہ ہونے میں ادیب بھی برابر کا ذمے دار ہے۔

چاند چہرہ ستارہ آنکھوں سے پرے بڑے متعفن جہاں آباد ہیں۔ جہاں دکھ، درد اور محرومی نے ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں، جہاں ہر چہرہ زرد ہے اور ہر آنکھ اشکبار۔ بس قلم اور قلمکار کے درمیان کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ جس کے بلاشبہ بہت سے اسباب ہیں۔

چند بڑے اسباب یہ ہیں ..... مثلاً یہ کہ ادیب کو اور اس کے بچوں کو بھوک بھی لگتی ہے لہٰذا اسے گھر میں راشن بھی بھروانا ہوتا ہے۔ بچوں کو کسی نیلے پیلے سکول میں پڑھانا بھی فرض ہے اور پھر پورے زمانے میں کبھی خوشی، کبھی روگ، عزیز و اقارب،

نوکری، تجارت، مہنگائی، بیماری، بجز...... ایک روگ ہو تو وہ گنئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے خود کو پسند کروانے کے لیے دنیا والوں کے سامنے جو سوانگ رچانا پڑتا ہے وہ تو اندر ہی اندر ادیب کو قتل کر دیتا ہے۔ خدا لگتی کہیے۔ کیا ہم ادیب اس معاشرے میں اس بات کو دوسرے تناظر میں دیکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے ادیبوں، شاعروں اور مفکرین کو وہ عزت و مقام دینا ہوگا جس کے وہ حقدار ہیں، اور وہ اگر دنیاداری کے تقاضے نہ نبھا سکیں تب بھی اس بات کو درگزر کر کے ان کے فن و ہنر پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ دراصل وہ ادیب جو اپنے ماحول و سوسائٹی میں مس فٹ ہوتے ہیں انہوں نے خود کو پرفیکٹ ثابت کرنے کے لیے اپنی قدرتی صلاحیت اور ادبی کمٹمنٹ کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

ذرا تصور کریں...... کہ چچا غالب پورا مسلمان بننے کے چکر میں ساغر و مینا سے ناطہ توڑ لیتے اور شاعری کے بجائے کوئی باعزت ذریعہ معاش مثلاً نوکری وغیرہ ڈھونڈتے...... یا ہمارے عہد کے ایک اہم بڑے شاعر" جون ایلیا" کی مثال ہمارے سامنے ہے اگر ان کے شب و روز بھی کسی بیوروکریٹ کی مانند گزرتے تو شاعری کا یہ معیار ہمارے نصیب میں ہونا ناممکن تھا۔

ہمیں یہ بات سیکھنا پڑے گی کہ بڑے ادیب یا بڑے شاعر کو عام آدمی کی طرح خشوع و خضوع سے جینے کا پابند نہ بنائیں۔ اس کے اندر کے فنکار کو نہ ماریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا ادیب مقابلے کی فضاء سے گھبراتا ہے۔ بیانیہ افسانے نے علامتی یا تجریدی انداز اختیار کیا تو ہمارے نقاد چلا اٹھے۔ ادب تجربہ گاہ ہے، اسے آسائشوں اور دنیا میں رونما ہونے والی ادبی تبدیلیوں و تحریکوں سے نہ صرف سیکھنا بلکہ ان کا حصہ بننا ہے۔ پوری دنیا میں ادبی میدان میں، ادبی رنگ میں نت نئی فارم اور ہیت پر تجربے ہو رہے ہیں۔ کچھ ناکام ہوتے ہیں کچھ کامیاب ہو کر پذیرائی حاصل کرتے ہیں، مگر جدت پسندی کا سلسلہ رواں دواں رہنا چاہیے جس کا ہمارے ہاں فقدان ہے۔ روایت پرستی یا قدامت پرستی کا یہ حال ہے کہ ادب کی کسی بھی صنف میں تجربے کو مکمل طور پر لکھنے، پڑھنے یا تنقید کے عمل سے گزرنے سے پہلے ہی رد کر دیا جاتا ہے۔ اردو میں اچھا اور معیاری ادب لکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہندی، فارسی و عربی زبانوں سے لے کر علاقائی زبانوں سے اچھی واقفیت ہو عربی و فارسی دونوں زبانیں ہمارے تعلیمی ماہرین کی پالیسیوں کے نتیجے میں دیس نکالا پا چکی ہیں۔ لہٰذا ہمارا آنے والا یا موجودہ ادیب اپنی بنیاد یا کلاسیکی روایات سے کٹا ہوا ہے۔ بلاشبہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، جاپانی، یا روسی ادب پڑھنا ناگزیر ہو چکا ہے مگر ہمیں اپنا پہلا رشتہ اپنی کلاسیکی روایات سے جوڑنا ہوگا۔ اس کے بعد اکتساب اور بین الاقوامی ادبی approach تک رسائی سے ذہن کی متعدد کھڑکیاں کھلیں گی۔

مہنگائی اور بے حساب سماجی مسائل نے کافی ہاؤس کی روایت بھی چھین لی ہے جو کہ ادبی سرگرمیوں کے لیے اہم ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ پوری دنیا میں جہاں جہاں ادب نے انسان کو ظلم و جبر اور زیادتی کے شکنجوں سے نجات دلائی وہاں پر کافی ہاؤسز کے مضبوط institutions موجود تھے۔ جہاں ادیب نہ صرف catharsis کے لیے جمع ہوتے تھے بلکہ اس گفتگو سے ہی تحریروں کو نمو اور جلا ملتی تھی۔ آج کا ادیب بے چارہ اس درجہ اپنی زبان اور اپنے ادب سے خائف ہے کہ اپنے بچوں کو اردو یا دوسری صوبائی زبانوں کے ادب کی طرف راغب نہیں کرتا۔ نتیجے کے طور پر جن گھروں میں اردو کے بڑے ادیب رہتے ہیں ان کی اگلی نسل انگریزی بولتی ہے اور انگریزی ادب و زبان سے لیکر انگریزی محاوروں تک سے گہرا شغف رکھتی ہے۔ سندھی زبان کے ادیبوں کے پاس بھی سوائے چند ایک کے کوئی بڑا نام نہیں ہے۔ سندھ کا مزاحمتی ادب ون یونٹ والے دور کے بعد دم توڑ چکا ہے۔

حالانکہ مزاحمتی ادب بھی ترقی پسند ادب کی طرح کسی عہد یا وقت کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ اسے ہر وقت پروان چڑھتے رہنا ہے۔ کراچی کا مزاحمتی ادب صرف کراچی کا نوحہ گر ہے۔ اسے اندرون سندھ کی سرسبز و شاداب زمینوں کی ہریالی سوکھنے کا ماتم نہیں، پانی نہ ہونے سے آنے والی تباہی، اور دیگر سماجی مسائل سے اسے ذرا کم ہی سروکار ہے۔

بنظر غائر دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی زبانوں، کو اپنے قدیم فن شاعری و نثر کو خود ہی نظروں سے گرایا، اسے کمزور اور کمتر سمجھنا شروع ہو گئے ورنہ انتہائی مضبوط وسیع و بلیغ زبانوں کے اشتراک سے بننے والی زبان جو برصغیر کے کروڑوں افراد کی محبوب زبان بن جائے، جو محبت و عشق سے لیکر سیاست و عدل کی زبان بن جائے جس کا ادب دنیا کی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو کر داد و تحسین وصول کرے وہ محدود، کمتر یا کمزور ہرگز نہیں ہو سکتی۔

مگر موجودہ دور میں ہماری زبانوں کے ادب اپنی شناخت کھو رہے ہیں۔ علمی و ادبی مباحث سنجیدگی سے نہیں ہوتے۔ ہمارا ادیب آج بھی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث میں الجھا ہوا ہے اور مغرب کے مباحث کہاں سے کہاں نکل گئے۔

نہ صرف تخلیقی ادب بلکہ ادبی پروگراموں میں بھی مطالعہ و دلچسپی کا عنصر گھٹ گیا ہے اگر کوئی نوآموز شاعر یا ادیب کسی کہنہ مشق استاد کو اپنی تخلیق دکھانے کے لیے لے جاتا ہے تو اکثر اوقات اسے بڑی مایوسی ہوتی کیونکہ ایک مخصوص جملہ... "آسان زبان و الفاظ کا استعمال کریں" مروج ہے...... جو کہ میرے خیال میں ادب کے لیے بڑی نقصان دہ بات ہے۔ دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ "مختصر لکھیں"۔ صاحب الرائے کی نصیحتوں کو پلے سے باندھ لینے سے نتیجہ یہ نکلا کہ نظمیں چار سطری اور پانچ سطری لکھی جانے لگیں۔ افسانہ، افسانچے کی شکل میں آ گیا اور ایک عرصہ ہوا کہ ہماری زبان میں کوئی بڑا ناول نہیں شائع ہوا۔

محنت سے مقالہ تیار کر کے آنے والوں کو پروگرام میں آنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دس منٹ کے بجائے اسے چار منٹ ملیں گے۔ پس چند ادھر ادھر کے پیراگراف پڑھ کر فوراً اسٹیج چھوڑ دے۔ سننے والے، پڑھنے والوں سے زیادہ جلد باز ہوتے ہیں، اور انتظامی امور سنبھالنے والے ان سے کہیں زیادہ جلد بازی کے مظاہرے کرتے ہیں۔ ادیبوں کی گروپ بندیوں اور ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مساجد نے بھی ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔" ترقی پسند تحریک کے علاوہ کوئی ایسی تحریک یا تنظیم نہیں جو کہ ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر سکے۔

ایسی ہی کئی وجوہات کی بناء پر عصر حاضر میں ادب زندگی کا عکاس نہیں رہا، سماج کا آئینہ دار نہیں ہے اور وہ ادب جو اپنے ارد گرد ہونے والے مظالم کو تمام تر فنی رموز اور سچائیوں کے ساتھ اپنے قاری تک نہیں پہنچاتا، وہ محض ماضی کی نقالی، ذاتی فرسٹریشن دور کرنے کا ذریعہ یا نقاد کی سمت کو دیکھ کر لکھا جاتا ہے جو زیادہ تر غیر معیاری، بے سروپا اور جلد فنا ہو جانے والا ہے۔

آج ادبی منظر پر جو بڑے اور معتبر نام نظر آتے ہیں ان میں سے اکثریت کا تعلق ہندوستان کے علاقوں سے ہے جو وطن عزیز کی محبت میں کشاں کشاں چلے آئے۔ وہ آج بھی ادب کو اپنی محنت، ہنر، لفظ اور خیال بخش رہے، مگر یہاں پیدا ہونے والی نسل میں سے اکثریت کا وہ معیار نہیں جو کہ ہونا چاہیے۔ اگر ہمارے اس تبصرے پر آپکو اعتراض ہے تو بتائیے کہ آج کی دہائی میں لکھنے والے جو خالصتاً پاکستان کی پیداوار ہیں ان میں کتنے لوگ ہیں جو کہ ادبی دبستانوں، تنقید، فن عروض، گرائمر، لسانیات، ہندی، عربی و فارسی ادب پر عبور رکھتے ہیں۔

ہم نے لکھنے والوں کی اکثریت نیم تعلیم یافتوں کی سی ہے، کلاسیکی ادب کا مطالعہ صفر، غیر ملکی ادب کا مطالعہ صفر، جو عام بھی ادبی افق پر ابھر رہے ہیں ان کا معیار ماضی کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے کہیں کمتر ہے۔

جو انہیں بھی سننے کو ملتا ہے کہ فکر معاش اور صحافت ادیبوں کو کھا گئی تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ماضی کے شاعروں اور ادیبوں کے پاس قارون کا خزانہ تھا؟ بلکہ نصف صدی کی اس دوڑ میں ایک بھی ادیب یا شاعر جو اپنی اعلیٰ منزل سے ہٹ گیا ہو۔ ذاتی و معاشی مسائل اس کے راستے میں حائل نہیں ہوئے کیونکہ ان کے لئے ادب کی تخلیق عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ ادب ہی ایسے دوسری روشن حقیقت، نیکی، سچائی، انصاف، خوبصورتی کا پھیلاؤ اور اعلیٰ اخلاقی و معاشرتی قدروں، وسعت ذہن و دل کا فروغ بذریعہ حسن تحریر ہے۔ اگر آج بھی ادیب شاعر، فلسفی و دانشور اپنی ترجیحات میں کچھ تبدیلی لائیں۔ اپنے فکر کی تمام تر توانائیاں اور فکری صلاحیتیں ادب کو دیں اور قاری کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑیں تو ادب میں ایک اور دور زریں آ سکتا ہے۔

وہ ادب جو قاری کو چونکاتا نہیں اور سوچنے پر مجبور نہیں کرتا ہے، سماج کا وہ چھپا ہوا چہرہ نہیں دکھاتا جو اس کے جہل میں اضافے کا باعث ہے یا اسے حقائق سے آشنا نہیں کرواتا۔ وہ تخلیقی قوت سے عاری، بے جان، بے روح الفاظ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ ادب کو اسی شعور، بیداری اور جنون و دیوانگی کی تلاش ہے جو اس سے بچھڑ چکی ہے۔

امجد طفیل

''بدلتی دنیا میں ادب کا کردار'' ایک ایسا موضوع ہے جس کا جائزہ ہم ایک سے زیادہ سطحوں پر لے سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہمیں دو باتوں کی وضاحت کر لینی چاہیے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب ہم ''بدلتی دنیا'' کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہے اور دوسرا ''ادب'' سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔

ہمارے ارد گرد کی دنیا مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس بات کے اقرار کے لیے کسی پیچیدہ فلسفیانہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا روزمرہ تجربہ ہمیں یہ بتا دیتا ہے۔ یہ تبدیلی معاشرتی، تہذیبی، سیاسی، فکری، تکنیکی اور جذباتی سطح پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ انسان ان تبدیلیوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگر ہم انسانی تہذیب کے سفر پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی سادگی سے پیچیدگی کی طرف جا رہی ہے۔ ہماری زندگی میں سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کا اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ فطرت اور انسان کے درمیان موجود ربط اب انتہائی کمزور پڑ رہا ہے۔ خارجی زندگی کے میکانکی اصول فرد کے باطن میں بے اطمینانی، بے سکونی اور انتشار پیدا کر رہے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان جہاں ایک طرف اپنے لیے آسانیاں اور آسائشیں پیدا کرتا جا رہا ہے وہاں وہ نئی پیچیدگیوں سے بھی دو چار ہو رہا ہے۔ یوں نہ صرف انسانی زندگی مسلسل تبدیلی کی زد پر ہے بلکہ انسان کے لیے نئے نئے چیلنجز بھی سامنے آ رہے ہیں۔ اکیسویں صدی میں چند سوال انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان خود کو بدلتی ہوئی صورتحال سے کس طرح ہم آہنگ کرے کہ اس کی نفسیاتی ساخت کسی دھچکے سے بچی رہے اور وہ اپنے ماحول کی ہر لحظہ متغیر ضروریات کو پورا کر سکے، اگر ایسے طریقوں کی نشاندہی نہ ہو سکی اور انسان نے بیرونی تبدیلی کو اپنے باطن کے ساتھ تیزی سے ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت حاصل نہیں کی تو اس بات کا خدشہ ہے کہ اکیسویں صدی میں انسانی پاگل پن معیاری اور مقداری ہر دو حوالوں سے خطرناک حد تک بڑھ جائے گا۔

جب ہم انسانی زندگی میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو اس کی ایک جہت سیاسی اور فکری تبدیلی بھی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو بھی اکیسویں صدی اپنی ابتداء ہی میں حیرت انگیز تبدیلیاں لائی ہے۔ ان تبدیلیوں نے اس دنیا کے جغرافیائی اور سیاسی نقشے کو بدلنا شروع کیا ہے۔ دنیا ایک نئے استعماری عہد میں داخل ہوئی ہے۔ یہ استعماری عہد اعلیٰ صنعتی (Super industrial) دور کا پیدا کردہ ہے۔ موجودہ استعمار ایک بار پھر سے اپنے ساتھ خوش کن نعرے لے کر آیا ہے۔ جدیدیت، روشن خیالی، سیکولر اقدار، لبرل ازم، عالمی ثقافت، انسانی حقوق وغیرہ۔ جہاں تک ان باتوں کے

معاشرے میں رواج پانے کی بات ہے تو اختلاف رائے کے باوجود ان کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے فیصلے کا اختیار صرف کسی معاشرے کی اکثریت کو حاصل ہوتا ہے۔ اصل بات یہ نہیں کہ ہمارے معاشرے میں روشن خیالی ہونی چاہیے یا نہیں، انسانی حقوق کا احترام کیا جانا چاہیے یا نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ اس قوت میں ان باتوں پر کتنا ایمان ہے۔

سیاسی و فکری تبدیلی جو ہماری ملکی اور عالمی سطح پر وقوع پذیر ہو رہی ہے ساری دنیا میں اور ہمارے ملک میں بھی لکھنے والے اس کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ اس دنیا پر جو غیر انسانی رویے اور حالات نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کے خلاف "استعمار مخالف ادب" کی لہر پوری دنیا میں جاری ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسا کسی منظم پارٹی یا فورم کے زیر اثر نہیں ہو رہا بلکہ دنیا کے مختلف خطوں کے لکھنے والے اپنے اپنے تخلیقی شعور کی رہنمائی میں تخلیقی سطح پر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔ غیر انسانی رویوں کے خلاف مزاحمت میرے خیال میں ادب کا وہ کردار ہے جو وہ ہر دور میں ہر معاشرے میں اور ہر صورتحال میں ادا کرتا رہا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔

سائنسی اور تکنیکی سطح پر بھی ہمارے اردگرد کی دنیا تبدیل ہو رہی ہے۔ نئی نئی ایجادات ہماری روزمرہ زندگی کا لازمی حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ جینیٹکس میں ہونے والی پیش رفت آنے والے سالوں میں انسان کے بارے میں ہمارے تصورات میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرنے والی ہے۔ نیورالوجی کی دریافتیں انسانی ذہن اور شخصیت کے بارے میں بہت سے سوالوں کو متروک کر دیں گی اور بہت سے نئے سوال اٹھائیں گی۔ خلائی تحقیق نئے امکانات کے دروازے وا کر رہی ہے اور انسان نئے جہانوں کی سیر میں نکلنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ یہ سب باتیں جو انسان کے خارج میں وقوع پذیر ہو رہی ہے انسان کے باطن میں کیا ہلچل پیدا کرتی ہیں، اس بات کا ادراک اور اس بات کو تخلیقی سطح پر محسوس کر کے اس کا بیان کہ یہ فرد کے باطن میں نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت اور توانائی پیدا کرے، وہ کام ہے جو ادب کو کرنا ہے۔ میرے خیال میں سائنسی علوم اور سماجی علوم اپنے اپنے الگ خانوں میں کام کرتے ہیں وہ ایجادات و اختراعات کرتے ہیں۔ نئے نئے مظاہر دریافت کرتے ہیں لیکن ان مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر تصویر بنانے کی صلاحیت ان علوم میں نہیں یہ کام یا تو ادب کرتا ہے یا فلسفہ۔ میرے خیال میں ادب اور فلسفے کو ایک نیا تصور کائنات تشکیل دینا ہوگا تا کہ انسان کائنات میں اپنے مقام کا تعین از سر نو کر سکے۔

انسانی تہذیب میں جن اداروں کی نشوونما ہوتی ہے فنون لطیفہ اور خاص طور پر ادب ان میں ایسا ادارہ ہے جس کا کام انسان کا تزکیہ کر کے اس میں اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا کرنا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو فنون لطیفہ اور ادب معاشرے میں توازن، ہم آہنگی اور ترتیب پیدا کرتے ہیں۔ ایسا یہ فنون انسان کے باطن میں تبدیلی لا کر کرتے ہیں اور یہ تبدیلی چند منٹوں یا گھنٹوں میں نہیں آتی بلکہ اس کے لیے طویل ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ تبدیلی وقتی یا ہنگامی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ پائیدار اور دیرپا ہوتی ہے۔ ادب فرد کو باطن سے تبدیل کرتا ہے اس لیے میرا یقین ہے کہ ادب کا مطالعہ کرنے والے اور ادب کا مطالعہ نہ کرنے والے کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ چونکہ ادب اعلیٰ انسانی اقدار جیسے محبت، انصاف، آزادی، امن، سچائی اور حسن وغیرہ کی پروجیکشن کرتا ہے اس لیے ادب کا قاری اپنے باطن میں ان اعلیٰ انسانی اقدار کے لیے اپنائیت اور لگاؤ محسوس کرتا ہے۔ ان اقدار کو اپنے باطن میں بسانے سے عام انسان بھی اعلیٰ انسانی اوصاف کا حامل بن سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اعلیٰ انسانی اقدار کا حامل فرد معاشرے میں بھی ان اقدار کا چلن دیکھنا پسند کرتا ہے اور جب معاشرے میں اعلیٰ انسانی اقدار کا چلن ہوگا تو معاشرہ توازن، ہم

آہنگی اور ترتیب حاصل کر لے گا۔

ہمارے ارد گرد کی بدلتی ہوئی دنیا میں جو انتشار، بے ترتیبی اور انتہا پسندی نظر آتی ہے، وہ معاصر دنیا میں فنون لطیفہ اور ادب سے برتے جانے والے اغماض کا نتیجہ ہے۔ میں لفظ انتہا پسندی ان محدود معنوں میں استعمال نہیں کر رہا جن معنوں میں یہ سیاسی طور پر مروج ہے اور استعماری قوت کے اشارے پر اسے مسلمانوں اور خاص طور پر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لیے برے بیجل کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ انتہا پسندی سے میری مراد زندگی میں ایک ایسا رویہ ہے جو دوسرے افراد کے لیے جگہ نہیں چھوڑتا۔ یہ رویہ ہمیں بالا دست طبقوں میں زیادہ نظر آتا ہے جو جتنا طاقتور اور اثر و رسوخ والا ہے وہ اتنا ہی انتہا پسند ہے۔ مقامی اور عالمی سطح پر بالا دست طبقوں کی یہی انتہا پسندی ہے جو معاشرے میں انتشار اور بے ترتیبی پیدا کرتی ہے۔ معاشرے میں توازن اور اعتدال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ ہر بار اس کا ذمہ دار کمزور کو قرار دیا جاتا ہے اور اسے نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس انتشار کے سبب کو مٹانے کے لیے تمام وسائل استعمال کیے جاتے ہیں اور پھر ایک سبب کو ختم کرنے کے بعد کوئی دوسرا سبب تلاش کر لیا جاتا ہے اور ہر بار دنیا کو پہلے سے زیادہ منتشر اور بے ترتیب کر دیا جاتا ہے۔

فرد اور معاشرے کی زندگی میں فنون لطیفہ اور ادب توازن، ترتیب اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں یہاں یہ بات یاد رہے کہ میں فنون لطیفہ اور ادب کے کردار پر بات کرتے ہوئے دیگر علوم و فنون کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہر علم و فن اپنی اپنی جگہ اہم ہے اور انسانی زندگی اور معاشرت میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

فنون لطیفہ اور ادب کا کردار اس حوالے سے اہم ہے کہ یہ انسان کو انسان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً طب کی تعلیم ہمیں اچھے ڈاکٹر دے سکتی ہے۔ انجینئرنگ کی تعلیم ہمیں اچھے انجینئر دے سکتی ہے لیکن مجھے اس بات میں شک ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے یہ علوم جن کا اس وقت دنیا پر غلبہ ہے ہمیں اچھے انسان بھی دے سکتے ہیں۔ ایک اچھا پروفیشنل وہ ہے جو اپنے علم پر عبور رکھتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ اعلیٰ انسانی اوصاف کا حامل بھی ہو۔ دیکھیں ایک بہت بڑا سرجن اگر مریض کو آپریشن ٹیبل پر لٹا کر لواحقین سے پیسوں کا لین دین کرتا ہے تو ہو سکتا ہے وہ اپنی فیلڈ کا سب سے بڑا پروفیشنل ہو لیکن اچھا انسان ہرگز نہیں۔ اس طرح ایجادات کرنے والے یا ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مختلف مصنوعات تیار کرنے والے اگر ان ایجادات اور مصنوعات کو انسان کے لیے مثبت اثرات کا حامل نہیں بناتے تو ان کے اچھے پروفیشنل ہونے پر تو شاید شک نہ کیا جا سکے ان کے اچھے انسان ہونے پر شک ضرور کیا جائے گا۔

ادب ایک فریضہ ابتدا ہی سے سرانجام دیتا چلا آ رہا ہے اور وہ ہے انسان کو انسان بنانا۔ اس حوالے سے ادب نے ہر دور میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور آج اگر ہمیں یہ شک گزرنے لگا ہے کہ ہمارے رویے غیر انسانی ہوتے جا رہے ہیں، ہمارے ارد گرد کی دنیا میکانکی اصولوں کے تابع ہوتی جا رہی ہے، ہمارے ارد گرد انتشار، بے ترتیبی اور عدم توازن پاؤں پھیلا رہا ہے، تو اس کے سیدھے معنی یہ ہیں کہ جتنی ضرورت ادب کی آج ہے شاید آج سے پہلے نہ تھی۔ ہمارے ارد گرد کی ہر لحہ بدلتی دنیا میں ادب ایک قدرے پائیدار ادارے کے طور پر موجود ہے۔ وہ انسانی جذبوں، انسانی رویوں، انسانی جبلتوں اور انسانی ضروریات کو اپنا موضوع بناتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ باتیں اس کرہ ارض پر پہلے انسان سے لیکر آج تک کے جدید انسان اور مابعد "جدید انسان" میں موجود ہیں۔ ان جذبوں، رویوں، جبلتوں اور ضروریات کو پورا کرنے، انہیں انسانی زندگی میں مقام دینے کے حوالے تو

تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں نے ان کے حوالے سے مختلف نقطۂ نظر تو ضرور اختیار کئے ہیں لیکن ان کی موجودگی سے نہ انکار کیا جاسکا ہے اور نہ کیا جاسکے گا کیونکہ جب تک انسان اس کرۂ ارض پر موجود ہے وہ اپنے ان لوازم کے ساتھ موجود رہے گا اور جب تک یہ لوازم موجود ہیں ان کی تسکین اور تشفی کے لیے بھی کوششیں کی جاتی رہیں گی، جب تک یہ کوشش جاری رہے گی انسان ادب تخلیق کرتا رہے گا۔ تخلیق شدہ ادب اپنے قارئین بھی پیدا کرتا رہے گا اور یہ قارئین یقیناً اپنے انسانی اوصاف میں ان لوگوں سے بہتر ہوں گے جو ادب کا مطالعہ نہیں کرتے اور یوں ادب ایک بہتر انسان کی تخلیق کے خواب کی تلاش میں اپنا سفر جاری رکھے گا۔

اب آتے ہیں پہلی بات کی جانب کہ اکیسویں صدی میں جو تیز رفتار تبدیلیوں کی صدی ہے اور جس میں انسان، انسانی معاشرت، انسانی تہذیب اور انسان سے وابستہ اداروں کے خدوخال اس طرح بدل جائیں گے کہ بیسویں صدی کے انسان کے لیے ان کی شناخت ناممکن ہو جائے گی تو ایسے میں ادب خارجی دنیا کی ان تبدیلیوں کو اپنے باطن سے ہم آہنگ کرنے میں بھی مدد دے گا۔ مختلف شعبہ ہائے علوم سے وابستہ افراد اپنے اپنے دائرے میں کام کرتے ہیں اور ان کے کام کی بنیاد ماضی میں کئے گئے کام پر ہوتی ہے، اگرچہ وہ اپنی متخیلہ کے استعمال سے نئے نئے امکانات تلاش کرتے ہیں لیکن متخیلہ کا جیسا استعمال ادیب، شاعر اور فنون لطیفہ سے وابستہ دیگر افراد کرتے ہیں وہ سائنسی علوم اور سماجی علوم سے وابستہ افراد کے لیے اگر ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور ہے۔ میں اپنی بات کی وضاحت ایک دو مثالوں سے کرتا ہوں۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں چیک ادیب فرانز کافکا نے ایک ایسی انسانی صورتحال کا نقشہ کھینچا جو اس وقت لوگوں کے لیے نامانوس تھی کیونکہ اس کی کوئی مثال اس دنیا میں موجود نہیں تھی لیکن بیس سال کے اندر اندر مغرب کے لوگوں نے جس میں سرمایہ دار اور سوشلسٹ دونوں بلاکوں کے رہنے والے شامل تھے خود کو کافکائی صورتحال کا اسیر پایا تب لوگوں نے کہا کہ کافکا کی تحریروں نے سماجی جبر کی کیفیت کو ہمارے لیے قابل برداشت بنا دیا تھا ورنہ یا تو ہم پاگل ہو جاتے یا خودکشی کر لیتے۔ تو یہ ایک لکھنے والے کی بصیرت اور متخیلہ کا کمال تھا جس نے آنے والے دور کو اپنی تحریروں میں سمو کر لوگوں کے لیے اس کی اجنبیت ختم کر دی۔ دوسری طرف جارج اورویل نے اپنے ناول 1984ء میں مستقبل کی دنیا کا نقشہ کھینچا اور بتایا کہ آنے والا دور اور اس دور کا انسان کیسا ہوگا اور زیادہ دور کیوں جائیں خود اردو کے مایہ ناز فکشن نگار غلام عباس نے اپنے ناولٹ ''دھنک'' میں اس پاکستان کا نقشہ بیس سال پہلے کھینچا جو لسانی اور فرقہ ورانہ فسادات کے نتیجے میں مٹ جاتا ہے۔ اسی اور نوے کی دہائی نے غلام عباس کی بصیرت اور متخیلہ کی قوت کا اقرار کروایا۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک لکھنے والا مستقبل کا جو نقشہ کھینچے مستقبل ہو بہو ویسا ہی ہو، تفصیلات میں فرق ہو سکتا ہے۔ ہاں اپنے جوہر میں آنے والا کل ادیب و شاعر کے سوچے ہوئے کل سے مختلف نہیں ہوگا۔ یوں جب آپ آنے والے کل کے بارے میں ادب میں پڑھ چکے ہوں گے اور وہ کل کسی دن چپ چاپ آپ کے سامنے آ کھڑا ہوگا تو آپ اس کی شکل دیکھ کر ایک دم چکرا نہیں جائیں گے بلکہ اپنائیت کے ایک احساس کے ساتھ اسے خوش آمدید کہیں گے اور اس جھٹکے سے بچ جائیں گے جسے بعض اوقات فیوچر شاک کا نام دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اگر مستقبل کا انسان آنے والے پاگل پن سے بچنا چاہتا ہے تو مذہب کے بعد ادب اور فنون لطیفہ ہی اس کی آخری پناہ گاہ ہوں گے۔ یاد رہے کہ یہاں مذہب، ادب اور فنون لطیفہ سے مراد آج کل الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پیش کیا جانے والا جعلی تصوف، گھٹیا موسیقی اور پاپ ادب نہیں ہے۔

اصغر عابد

تہذیب فہم و فکر کی جو پہلی باقاعدہ خشت ارسطو نے نصب کی تھی وہ اس وسیع کائنات میں جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی، علمی، تاریخی اور ادبی اعتبار سے تبدیلیوں اور تغیرات کے ساتھ ساتھ اپنے ارتقاء پذیر قیمتی رویوں کے باعث اتنی مضبوط چٹان کی صورت اختیار کر گئی ہے جسے جدید دنیا کے فکری منطقے ایقان کی حد تک تسلیم کرتے ہیں۔ اس نے تزکیۂ نفس کو انسانی بقاء کی پہلی سرشاری قرار دیا۔ اس کا کیتھارسس والا ورق آج جدید سائنسی عہد میں بھی نظریاتی سطح پر اساسی لوح کا درجہ رکھتا ہے۔

افلاطون نے شاعروں کو جھوٹا اور بدکار کہہ کر جس فکری تشدد کی کوشش کی تھی ارسطو اس کا ازالہ آج تک کرتا چلا آ رہا ہے۔ پھر شاعری کی مخالفت کرنے والوں کو ایک زمانے میں ناشکرا بھی کہا گیا تھا۔ ارسطو کی فکری ایکسٹینشن ہو یا لونجائنس ہو یا طربیۂ خداوندی والا دانتے، جرمنی کا گوئٹے ہو، ولیم شیکسپیئر ہو، ورڈزورتھ ہو یا عمرانی و معاشی افکار والا کارل مارکس یا پھر برگساں، یہ اور ایسے اور بہت سارے دوسرے زاویے ہیں جو اپنے اپنے عہد کا کلاسیک ہیں۔

"We know too much and are convinced of too little : our literature is a substitute of religion" تمثیلی شاعری پر ایک مقالے میں ٹی ایس ایلیٹ کا یہ جملہ اس قدر جگہ پر معتبر رکھتا ہے کہ موجودہ عہد میں اس کی اہمیت عمومی سطح پر ہر معاشرے اور خصوصاً تیسری دنیا بشمول پاکستان میں دوچند ہو جاتی ہے۔ آج ہم فرقہ وارانہ سطح پر اور پھر مذہبی حوالے سے جن بلاؤں اور خالی خلاؤں کے خلاف نبرد آزما ہیں ان میں یہ بات انتہائی اہم ہے کہ صرف ادب ہی وسیع تر انسانی یگانگت میں معاون ہو سکتا ہے بشرطیکہ مذہب کی صورت اس طرح نہ بگاڑ دی گئی ہو جیسا کہ آج ہمارے یہاں ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کے نزدیک Intellactual historical community ان افراد پر مشتمل ہے جن کے درمیان زمانی تسلسل کوئی معنی نہیں رکھتا، چاہے ان میں سو برس سے لے کر ہزار برس تک کا وقفہ موجود ہو۔ ایلیٹ کے نقطۂ نظر کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر تقی میر سے لے کر ناصر کاظمی تک دراصل ایک ہی دانشورانہ تاریخی طبقہ ہے، یہ تمام لوگ ایک ہی سلسلۂ خیال کی پرورش کرنے والے ہیں۔

میرے نزدیک آج کے دور میں ادب کے کردار کی اساس یہ ہے کہ ادبی تاریخ کا کلاسیک سے آج کے عہد کے حوالوں کو معتبر و مستند بنایا جا سکتا ہے۔ یونانی فطری روشن خیالی، تہذیبی پختگی اور ذہنی بلوغت کی وجہ سے خود ہی کلاسیک کا درجہ رکھتے تھے۔ اس

مصنف کو کلاسیک کی ذیل میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے جس نے اپنی فکر، مشاہدہ یا ایجاد کے ذریعے ذہن انسانی کو وسعت و عظمت عطا کی، حسن و لطافت کی تہذیب کی ہو اور جو اپنے مخصوص انداز میں سب کے لیے ہو اور سب سے مخاطب ہو۔ جس میں نیا اور پرانا مل کر ایک ہو گئے ہوں۔ کلاسیک کسی ایک قوم کا مصنف ہوتے ہوئے بھی سارے عالم انسانیت کا مصنف ہوتا ہے .... ٹی ایس ایلیٹ نے اپنے شہرۂ آفاق مضمون Traditional and individual talent میں جو کچھ کہا وہ ہمارے مغرب زدہ نقادوں کے لیے تو شاید نیا ہو لیکن میر تقی میر کے طالب علم اس تصور سے بہت پہلے کے آشنا ہیں۔

ہم سے آگے بھی زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ

یعنی ادب میں انفرادی اضافہ کے لیے پیشروؤں کی تردید لازم نہیں بلکہ ماضی سے بصیرتیں اخذ کر کے ادب کا دامن خوشبودار بنایا جا سکتا ہے۔ خود غالب نے اسی سلسلہ خیال کے بارے میں کہا تھا۔

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

یہ سوال کہ دنیا بدلتی رہتی ہے اب زیادہ بحث طلب نہیں رہا۔ اصل مرکز گفتگو یہ پہلو ہے کہ دنیا کیسے بدلتی ہے اور کیوں بدلتی ہے۔ ان سوالوں سے متصل معاملات یہ ہیں کہ آج کے جدید سائنسی ٹیکنالوجی اور بدلتے میڈیا کے دور میں ادب کا کیا کردار رہا ہے۔ میں یہاں ٹی ایس ایلیٹ کے مقالہ "شاعری کا سیاسی منصب" کا حوالہ دونگا۔ وہ کہتا ہے کہ فی الحقیقت ہمارا شعور و ادراک، جیسے جیسے ہمارے گردو پیش کی دنیا بدلتی جارہی ہے، خود بھی بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہتا ہے کہ اب ہمارا شعور و ادراک وہ نہیں جو چینیوں یا ہندوؤں کا تھا بلکہ وہ اب ویسا بھی نہیں جیسا کئی سو سال قبل ہمارے آباؤ اجداد کا تھا۔ یہ ویسا بھی نہیں ہے، جیسا ہمارے اپنے باپ دادا کا تھا بلکہ ہم خود بھی وہ شخص نہیں ہیں جو ایک سال پہلے تھے .... ماضی قریب کی بات کروں تو ہمارے برصغیر میں اگر ادب نے کچھ نہ کچھ کردار ادا بھی کیا تو آج سرد کیوں پڑ رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر کلوز ہوتی دنیا اپنے سب قرابت داروں کے لیے ایک ڈوز بن چکی ہے۔ پھر ایک سوال یہ بھی کہ کیا ادب یا ادیب اپنا کردار نبھارہے ہیں یا کس حد تک نبھارہے ہیں۔ اہم سوال ہے۔ آج سائنس نے آسودگی تو دی مگر لائف کو Complicated بھی بنا دیا ہے۔ آج بدلتی دنیا کے حساب سے ادیب کو ہاتھ باندھ کر بیٹھنا نہیں چاہیے۔ اسے تکیوں پر کڑھنے یا معجزوں کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ آنے والے وقتوں میں معاشرے کو اور انسان کو لیڈ کرنا چاہیے۔ ادب انسانوں کو وہ آسان اور آسودہ راہ دکھائے جہاں زندگی شائستہ بھی رہے اور آہستہ آہستہ اس کے مسائل و وسائل میں توازن بھی لے کر آئے۔ آج کا انسان ہکلایا ہوا ہے، بے سرا دکھائی دینے لگا ہے۔ ایسا معاشی عدم استحکام کے باعث ہے۔ جب روٹی اور روزی ہی چھن گئی ہو تو کہاں کا عشق اور کیسا عشق۔ آج ادب کو اس طرح کی کہانی اور شاعری پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ موجودہ Sources میں ہی زندگی میں آسودگی آجائے۔ ہمارے وطن کے ادیب کو میرے خیال میں آج نیشنلزم کی طرف بھی زیادہ ارتکاز عمل کے ساتھ رجوع کرنا چاہیے۔

یہاں میں یہ بھی عرض کروں گا کہ ادب میں جذبات تو ہونا چاہیں، جذباتیت نہیں۔ آج ہمارا بیشتر ادب خلا میں خیالی محل کا تاثر دے کر سائنسی حقائق کے مقابلے میں پسپائی پر عمل پیرا نظر آتا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ قومی اثاثوں کو بلا جواز نقصان پہنچانا،

پبلک ویلفیئر اور فلاح کے مراکز کو اڑا دینا، کس معاشرتی رویے کا شاخسانہ ہیں۔ آج ادب کو ایسی آلودہ فضا کو بھی شائستگی کی راست راہ پر لانا ہوگا۔ بغیر کچھ کیے قومی وسائل اور اثاثوں کو ذاتی ملکیت بنا لینے کی تمنا غیر معاشرتی باتیں ہیں بلکہ تہذیب سے کٹے ہوئے رویے ہیں۔ مجھے میر تقی میر یاد آتے ہیں ایسے رویوں پر کتنا خوبصورت کہا تھا:

مہمان میر مت ہو خوان فلک پہ ہرگز
خالی ہے مہروماہ کی دونوں رکابیاں ہیں

لیس للانسان الا ماسعی کا فکر انگیز فلسفہ توازن معاشرت کا سنہری منشور ہے۔ آج فرقہ واریت کا جو دھواں نظر آتا ہے، بہت پہلے میر انسان دوستی اور باہمی جرأت اور روشن روی کا تصور دے گئے تھے جس سے اکتساب کیا جانا چاہیے۔ انسان دوستی کا یہی وسیع وژن دراصل ہماری اگلی نسلوں کا سرمایہ ہے آج کے عہد نے فرد کو تنہا رہنے پر مجبور کر دیا ہے، ایسے میں ہماری کلاسیکی شاعری تمام زبانوں کے ادب کے برعکس ہمیں اس تصور سے جوڑتی ہے جس کا اشارا بہت پہلے مرزا غالب نے نظم و نثر دونوں میں کیا تھا کہ دیوالی اور شب برات دونوں ہی میرا تہذیبی ورثہ ہیں۔

زمن حذر نہ کنی گر لباس دیں دارم
نہفتہ کافر و بت در آستیں دارم

اس موقع پر جرمنی کے رومانی ناول نگار و شاعر فریڈرک روکرٹ کا یہ فقرہ دیکھیے کہ شاعری بنی نوع انسان کی مادری زبان ہے۔ یہاں بنی نوع انسان میں تخلیق کار، نقاد اور عام قاری تینوں موجود ہیں ...... اردو کے ادب عالیہ میں ادب کا یہ ہمہ گونہ تصور آج کی بات نہیں ہمارے تخلیق کاروں نے بودلیئر کے ریاکار قاری سے بہت پہلے ہی پڑھنے والے کی اہمیت بتا دی تھی اور اسے اپنا ہمزاد قرار دیا تھا اور حافظ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مصنف خود کلام نہیں کرتا بلکہ اس کی صورت تو ایک طوطی کی طرح ہوتی ہے جو استاد ازل کے کہے ہوئے لفظ دہراتا ہے۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
ہر کہ استاد ازل گفت ، ہمہ می گویم

آج کے جدید عہد کی ریٹ ریس انسان کو ہولناک انت کی جانب دھکیلتی چلی جا رہی ہے۔ ایسے میں ادب ہی وہ پناہ گاہ ہے جہاں کل خیر کا تصور وتبور ہے۔ رزق روٹی ہو یا ٹیکنالوجی میں سبقت لے جانے کا معاملہ، معاشی ریس ہو یا ہوس گیری، اردو ادب نے کسی بھی مسئلہ کو کبھی خارجی معاملہ قرار نہیں دیا۔ آج اس محفل میں ایسے صاحبان سخن و فن موجود ہیں جنہوں نے ایٹم کی ہولناکیوں اور تعلیمی تجاہل پر قابل ذکر تخلیقات پیش کی ہیں۔ ہمارے تخلیق کار نے فلسطین، کشمیر اور بوسینا، عراق اور افغانستان سے لے کر سنکیا نگ بلکہ جنوبی امریکہ کے معاملات و معمولات کو اپنے فن پاروں میں فنی جمالیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نئے علوم نے جو موضوعات و اصطلاحات اور لفظیات متعارف کرائے، آج اردو نظم و نثر کا بلاشبہ تخلیقی حصہ ہیں۔ نئے علوم و ایجادات کی تخلیقی سطح کے سلسلے میں ہماری رہنمائی پھر ٹی ایس ایلیٹ کرتا ہے۔ وہ جو کہتا ہے کہ فن کے جذبات غیر شخصی ہوتے ہیں۔ اس فن کے حوالے کے بغیر جو اسے تخلیق کر رہا ہے اور یہ بات کہ اسے کیا تخلیق کرنا ہے، اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس لمحے میں زندہ نہ ہو جسے حال نہیں بلکہ ماضی کا لمحہ موجود کہہ سکتے ہیں اور جب تک وہ نہ صرف اس کا شعور رکھتا ہو کہ کون کونسی چیزیں

مردہ ہو چکی ہیں بلکہ اس کا شعور بھی رکھتا ہو گیا کیا چیزیں پہلے سے زندہ ہیں۔ ایلیٹ نے یہ بھی کہا کہ جدید دور کی بیماری یہ نہیں ہے
کہ خدا اور انسان کے بارے میں کچھ تصورات سے اس کا ایمان اٹھ گیا ہے جن پر ہمارے آباؤ اجداد ایمان رکھتے تھے بلکہ اصل
بات یہ ہے کہ اس دور نے خدا اور بندہ کے بارے میں محسوس کرنے کی صلاحیت کو گنوا دیا ہے اور یہ صلاحیت ہمارے آباؤ اجداد
میں موجود تھی۔

لفظ جب تہذیبی سطح پر استعمال میں آتا ہے تو اس کے معنیاتی پہلو ایک پوری قوم کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں یوں لفظ
معانیاتی استعمال کے یک رخے پن سے الگ ہو کر جیتے جاگتے مظہر کے طور پر کام کرتا ہے۔ مائیکل ایسٹ لیک کا یہ فقرہ دیکھئے
My words are things before they become words and they become things
again when they do.۔ اشیاء کی سطح سے اٹھ کر ہی لفظ تہذیبی معاملہ میں کردار ادا کر سکتے ہیں جن کی توقع بہت عرصہ
پہلے میر نے بھی کی تھی:

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے
عرصہ محشر ہے عرصہ میرے ہر دیوان کا

مجھے یہاں دانتے یاد آتا ہے ایک مضمون "عام بول چال کی زبان کا ادبی استعمال" اس کا فکری کارنامہ ہے۔ ہمارے ہاں
کی تازہ تازہ علاقائی زبان کی سامنے کی مثالیں یاد آتی ہیں۔

اج آکھاں وارث شاہ نو کیتوں قبراں وچوں بول

یا پیر فرید کا یہ کہنا کافی ہے:

پیلھوں پکیاں نی پکیاں نی ، آچنوں رل یار۔

ہمارے یہاں تاریخی شعور پر زور دینے والے ناقدین اور عصری شعور کی گردان کو گردن کا ہار بناتے چلے جانے والے
صاحبان کی کمی نہیں۔ تاریخی شعور کے بغیر عصری اور عصری شعور کے بغیر تاریخی شعور کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ علم اور علوم میں فکری
تخلیقی سطح کا اعتدال قائم رکھنا ضروری ہے۔ ہمیں اپنی نسل کو اپنے کلاسیکی فنکاروں کے کمالات و سوالات سے آگاہ کرنے
ضرورت بھی ہے جس کا وسیع تناظر میں پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ابھی تو کلاسیکی ادبی ورثہ ہی پوری طرح دیا نہیں، ایسے میں معا
ادب اور اس کے مسائل پر گفتگو کرنا احسن بات سہی محض اتنی کارگزاری اور عمل کو کم از کم تنقیدی دانش کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ابھی
ہم بھنگاروں کے لٹو کا کھیل کھیلنے کو ہی اپنی فکری کامیابیاں سمجھ رہے ہیں۔ ہمارے ادیب اور اہل قلم کو دنیا میں تغیر پذیر ہو
والے عوامل کو تخلیقی کٹھالی میں سے گزارنا اور اسے آفاقی خلا کی جلا میں سنوارنا ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں کلاسیک کی کلاس اٹینڈ کیے بغیر آج کا لفظ اور آج کی تخلیق اپنا وہ کردار کما حقہ ادا نہیں کر سکتی جس کی ہر دو
ہر زمن میں اشد ضرورت رہی ہے اور آج اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔
آج ہمارے ادیب کو اپنی تخلیق سے ثابت کرنا ہوگا کہ فن اور فطرت میں ازلی دوستی ہے۔

پیش نظر کتاب "بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار" کے موضوع پر تقریباً پچاس اہل قلم کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ ساری تحریریں پاکستان کے مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے اہلِ دانش کے افکار و خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ہر شخص کی رائے سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی ایک مجموعے کو حتمی اور قطعی قرار دیا جاسکتا ہے مگر یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس طرح کی کتابیں فکر و خیال کے نئے امکان اور نئے زاویے نمایاں کرتی ہیں اور ہمارے لیے مستقبل کی صورت گری کی منزلوں میں آسانیاں پیدا کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بکھرتی سمٹتی ہوئی زندگی اور ہر آن، ہر لحظہ بدلتے ہوئے وقت کی ترجمانی کرنے والے صاحبانِ نظر کی یہ تحریریں پڑھنے والوں کے لیے توجہ کا سبب بنیں گی۔